تشریحات و تحقیقات

(مضامین اور تبصرے)

ترتیب و تزئین

نجمہ محمود

تشریحات و تحقیقات

(مضامین اور تبصرے)

ترتیب و تزئین

نجمہ محمود

B
براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی

تشریحات وتحقیقات

ترتیب وتزئین

نجمہ محمود

ISBN: 978-93-91601-23-2

ایڈیشن : 2021

قیمت : ₹ 600

تعداد : 200

مطبع : Touchstone، نئی دہلی۔110002

مرتب کا پتہ : ایف 5، عظیم ریزیڈنسی، نیو سرسید نگر، علی گڑھ

فون نمبر انڈیا: 9837214069

فون نمبر دبئی: 00971-506486993

ناشر : براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی۔110025

انتساب

اپنے بڑے بھائی

پروفیسر مقبول حسن خاں

کے

نام

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

(اقبال)

فہرست

مضامین

پانی اور چٹان (افسانوی مجموعہ)
(تبصرے)

سید حامد کہ گم اس میں ہیں آفاق
قارئین کے مکاتیب

سید حامد کہ گم اس میں ہیں آفاق
(تبصرے)

''جنگل کی آواز'' (ادبی تخلیقات کا مجموعہ)

مضامین

''جنگل کی آواز''

تبصرے

''جنگل کی آواز''

مکاتیب

''ریگستان میں جھیل'' (شاعری کا مجموعہ)

مضامین/تبصرے

بے زنجیر جستجو

(تحقیقی، تنقیدی، تخلیقی مضامین اور مقالے)

سیّد حامد: نگارخانۂ رقصاں کی روشنی میں

(تحقیقی وتنقیدی مقالہ)

مکاتیب

شعور کی رو۔ تکنیک یا تصورِ خودی و تصور انسان کامل، ورجینیا وولف، اقبال اور مشرقی صوفیاء کے حوالے سے
(تنقیدی و تحقیقی مقالہ)

مکتوب

حجاب امتیاز علی کے طرز میں طرحی افسانے
گل مہر کے سائے تلے، املتاس کی چھاؤں میں، چنار کے سائے تلے

(تبصرے)

''جنگل کی آواز''
(افسانہ پیکر ناول)

غار (افسانہ)
(تبصرے)

لہر لہر سمندر (افسانہ)

(تبصرے)

خالی جھولی (افسانہ)
(تبصرے)

صنوبر کے سائے تلے

(حجاب امتیاز علی کی طرز میں طرحی ناول)

(تبصرہ)

Saiyid Hamid
"A Living Stream"
Vision, Action, Sporting Spirit

مونوگراف
(تبصرہ)

○

پیش لفظ

○

گہرائیوں کا خوف

بہت آساں نظر آیا
ہمیں اُس روز اپنا پانیوں پر تیرتے رہنا
کسی نے جب کہا گہرائیوں میں ڈوب کر دیکھو
کہ اندر کیا ہے۔
تو ہم ڈر کر سمندر کے کنارے کی طرف لپکے

(مشمولہ ''ریگستان میں جھیل'')

پیش لفظ

تحقیق سمندر کی گہرائیوں میں اتر کر وہ موتی نکالنے کی سعی ہے جن تک ہنوز کسی کی رسائی نہیں ہو سکی تھی۔ پہاڑوں میں بکھرے ہوئے بے کراں حُسن کو خود میں سموئے ہوئے اُن مناظر کو کھوج نکالنے کی جستجو جن پر کسی اور کی نظر نہیں پڑی تھی جنگل میں اُن جڑی بوٹیوں کو ڈھونڈ نکالنے کی دُھن جن کی ماہیت و تاثیر کسی کو معلوم نہ تھی۔ تشریح و تنقید کے پیچھے پوشیدہ وہ جذبہ جس کے تحت عظیم تحقیقات وجود میں آئیں — اور یہی جذبہ عظیم تخلیقات کے پس پشت کارفرما رہا ہے۔ یوں تخلیق و تنقید و تحقیق کا مسلک و منبع ایک ہی ہے — اشیاء کی اصل کی جستجو — تحقیق الہام ہے، ایک لمحۂ انکشاف ہے۔

وقت کے اس لمحہ میں ہم کو تشریحی و انکشافی تحقیق کی اشد ضرورت ہے۔ یہ کریم النفس ہوتی ہے۔ خواہ وہ طویل ہو یا مختصر... کچھ لوگ ایسے ضرور ہوتے ہیں جو اس کا وسیع القلبی و وسیع النظری سے استقبال کرتے ہیں۔ اس مجموعہ میں ہمیں ایسے ادیب ملیں گے جنھوں نے حق کی جستجو کی... تشریح کی راقم سطور کی ادبی تخلیقات کی (جن میں افسانہ، شاعری، ''افسانہ پیکر ناول''، طرحی افسانے، طرحی ناول، تحقیقی و تنقیدی مضامین سب شامل ہیں) میں حیران ہوں اور سرشار بھی — یوں ہی کتابی صورت میں اشاعت عمل میں لائی گئی ان سبھی تبصروں اور مضامین کی جو گاہے گاہے شائع ہوئے۔ میں تہ دل سے ممنون ہوں ان سب کی جنھوں نے میری تحریروں کو قابل اعتنا سمجھا اور مضامین و تبصرے لکھنے کی زحمت اٹھائی۔

راقم الحروف فرسودہ راہوں پر گامزن ہونے سے گریزاں رہی ہے اسی لئے اس کتاب کی ترتیب کار وہ خود ہی ہے۔ ترتیب و تزئین میں مشکلات بہت پیش آئیں — جن ادیبوں کی رائے لینا ضروری سمجھا ان سے گزارش بھی کی۔ چند حضرات کو اپنی تحریروں پر لکھنے سے سختی سے منع بھی کیا

جو اپنی عافیت کے تحت معروضیت کے قائل ہیں اور انصاف کبھی کبھی دیانت دارانہ جانب داری چاہتا ہے اور جو ''جیدناقدین'' تھے اُن سے گزارش کرنے کی اجازت میری عزت نفس نے مجھے دی نہیں کہ زندگی کو ''برتر از اندیشۂ سودوزیاں'' سمجھتی ہوں۔

۱۳سال کی عمر میں لکھی ہوئی کہانی ''میراث'' پر سب سے پہلا مختصر تبصرہ میرے بڑے بھائی پروفیسر مقبول حسن خاں مرحوم کا تھا—

''منہ دیکھے کی نہیں کہہ رہا ہوں یہ بہت اچھی کہانی ہے''۔ بہت خوشی ہوئی یوں کہ وہ تعریف مشکل سے ہی کرتے تھے۔ ایک بات اور یاد آئی۔ اُن دنوں بھائی لکھنؤ یونیورسٹی میں ایم اے انگریزی کے طالب علم تھے۔ اور میں پرائیویٹ طور سے ہائی اسکول کی تیاری کر رہی تھی۔ ایک شام مجھے انگریزی کے رومانی شعرا خصوصاً ورڈز ورتھ کے بارے میں لکچر دے رہے تھے گویا میں ان کی پہلی شاگرد تھی (بعد میں وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے بہترین اساتذہ اور اسکالرز میں شمار کیے گئے) سنتے وقت میں تخیل کے ذریعہ اُن مرغزاروں کی سیر کر رہی تھی جہاں ورڈز ورتھ چہل قدمی کرتا ہوگا پہاڑوں اور وادیوں پر تیرتے بادلوں کی طرح— بھائی میرا انہماک دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اماں سے کہا— ''اماں یہ کچھ کرلے گی''۔

شش وپنج میں رہی کہ کیا کرلوں گی، کیا کرپاؤں گی۔ بھائی کا یہ جملہ میرے لئے سرچشمۂ فیضان ہوا... انگریزی ادب سے گہری وابستگی ہوئی (اردو ادب سے تو پہلے سے ہی تھی) جس سے مجھے اخلاقی اقدار ملیں— فطرت سے والہانہ عشق مجھے ورڈز ورتھ کی شاعری پڑھ کر ہی ہوا، اقبال نے کہا تھا:

''ورڈز ورتھ نے مجھے دہریت سے بچایا''۔

بات ۱۹۶۱ء کی ہے۔ ان دنوں میں کرامت حسین مسلم گرلز کالج، لکھنؤ میں فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی۔ رضیہ سجاد ظہیر تب ڈگری سیکشن میں اردو کی استاذ تھیں میری ان سے ملاقات ہوچکی تھی۔ کچھ عرصہ بعد وہ بہ وجوہ کالج کے ڈگری سیکشن میں کچھ عرصہ کے لئے منتقل ہوگئی تھیں۔ میں اکثر ان کے پاس جاتی تھی۔ ان کو اپنی ۱۳سال کی عمر کی لکھی ہوئی کہانی ''میراث'' بھی سنا چکی تھی وہ کہانی ان کو بہت پسند آئی تھی۔ ایک دن ان سے ملنے گئی۔ دیکھا کوئی صاحب بیٹھے ہیں۔ رضیہ آپا نے کہا—

''نجمہ ظہیر سے ملو''۔ میں سجاد ظہیر صاحب کی شخصیت کے طلسم سے نکل بھی نہیں پائی تھی کہ حکم ملا—

''نجمہ اپنی کہانی ''میراث'' لا کر ظہیر کو سناؤ''۔ سخت شرم محسوس ہوئی یہ میرا کسی ''غیر مرد'' کو کہانی سنانے کا پہلا موقع تھا۔ حکم کی تعمیل ضروری تھی چنانچہ ہاسٹل جا کر کہانی لائی اور سنائی۔ سجاد ظہیر صاحب نے رضیہ آپا سے کہا—

''نجمہ میں بڑا ادیب بننے کے جراثیم ہیں''۔ یہ جملہ حرز جاں ہوا۔ وہ کہانی مجھے واپس نہیں ملی مجھے یاد بھی نہ رہی میں نے واپس بھی نہیں مانگی مجھے قطعاً کوئی احساس نہیں تھا کہ میں رائیٹر ہوں یا ہو سکتی ہوں یوں کہ ہمارے گھر میں لڑکی کے نام کی اشاعت ممنوع تھی سخت پردے کی وجہ سے (میری جائے پیدائش قصبہ ملیح آباد ہے) بہر حال ذرا نہ سوچا کہ کہانی واپس کیوں نہ ملی کچھ دن بعد رضیہ آپا سجاد ظہیر صاحب کی ادارت میں نکلنے والا ہفتہ وار اخبار ''عوامی دور'' اور میری کہانی کا مسودہ مجھے دے کر بولیں ''لو ظہیر نے تمھاری کہانی شائع کر دی ہے۔''

نہ خوشی، نہ حیرت، نہ شکریہ— کہانی کے اوراق اور اخبار لے کر رکھ لئے۔

۱۹۶۳ء میں جب میں بی، اے سال اول کی طالبہ تھی تو رضیہ آپا نے مجھے ''بزم کہکشاں'' کا سکریٹری بنایا۔ دو خصوصی جلسے ''یوم مجاز'' اور ''یوم ٹیگور'' منعقد ہوئے۔ دونوں کے لئے رضیہ آپا کے حکم پر مضامین لکھے— ''مجاز ایک ساز، ایک آہنگ'' اور ''ٹیگور ایک شاعر، ایک مغنی''۔ ساتھ ہی ایک ڈرامہ ''رائی کا پربت'' بھی لکھا جو کالج میں رضیہ آپا کی نگرانی میں اسٹیج پر بھی پیش کیا— جلسہ کو خطاب کرتے وقت انھوں نے کہا:

''نجمہ محمود کی سادگی، خلوص، گھبراہٹ اور معصومیت اس بات کی ضامن ہیں کہ مستقبل میں وہ بڑی ادیب ہوں گی''

مندرجہ بالا ڈرامہ اور مضامین سجاد ظہیر صاحب نے ''حیات'' میں شائع کئے (یہ عوامی دور کا تبدیل شدہ نام تھا)—

سجاد ظہیر صاحب سے رضیہ آپا نے یہ بھی کہا'' پکی انقلابی ہے یہ لڑکی''— 'کنویسنگ' اتنی پُر زور اور مخلص تھی کہ سجاد ظہیر صاحب نے میری آٹو گراف بک پر یہ شعر لکھا—

مت سہل اسے جانو پھرتا ہے فلک برسوں

تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اور یہ جملہ: ''کہیں تم بھی پیاری نجمہ ایسی ہی انسان تو نہیں ہو... کتنی ہمت افزائی اور قدردانی کرتے تھے وہ سچے ترقی پسند۔ایسے پارکھ جنھوں نے ''حسن کا معیار بدلا تھا''——ان سبھی کلمات کو مختصر تحقیقات ہی سمجھتی ہوں—— حق کی جستجو کا حاصل۔سچائی، خلوص اور دیانت داری، انسان دوستی، ادب نوازی——میں سراپا عقیدت ان دونوں عظیم ہستیوں کے لئے!

۱۹۶۵ء میں، جب میں ایم۔اے سال اول (انگریزی) کی طالبہ تھی، کلاس میں اسلوب صاحب ورڈزورتھ پڑھا رہے تھے اسی کے زیر اثر ایک نظم لکھی ''رازِ سربستہ'' جسے ایک مشاعرہ میں پیش کیا تھا۔شعبۂ اردو کے اساتذہ اور شعراسب موجود تھے۔خامشی کی زبان میں نظم کو سراہا گیا۔وہ نظم ۴ سال بعد ماہنامہ ''شاعر'' میں شائع کروائی—— ۱۹۷۳ء میں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے میری دو کہانیاں ''آئینہ کی تصویر'' اور ''بوڑھا برگد'' شب خون میں شائع کیں۔''آئینہ کی تصویر'' پڑھ کر شعبۂ انگریزی کے میرے 'کولیگ' نے میرے بھائی (پروفیسر مقبول حسن خاں) سے کہا——

''اس کہانی کو پڑھ کر مجھے کافکا کی یاد آئی''۔اپنے بارے میں کہے گئے تعریفی جملے یاد کتنا رہ جاتے ہیں! ان افسانوں پر کوئی تبصرہ نہیں آیا نہ ہی اس کی فکر کی۔ہاں طویل نثری نظم ''مدر گاڈیس'' پر بے شک پروفیسر وحید اختر نے مختصر تبصرہ لکھ کر دیا تھا جو اس کتاب میں شامل ہے۔

۱۹۹۴ء میں انگریزی مقالات کا مجموعہ ''From the Circle to the Centre'' شائع ہوا۔میری گذارش پر اس کا تعارف سیّد حامد صاحب نے اور ''حرف اوّل'' پروفیسر آل احمد سرور صاحب نے لکھے۔اور ایک تبصرہ میرے استاد پروفیسر ہریش رائے زادہ صاحب نے کیا۔۱۹۹۸ء میں میری دوسری کتاب ''Virginia Woolf 's Concept of Perfect Man'' (جو میرے پی۔ایچ ڈی کے مقالے پر مبنی تھی) کا حرف اوّل تب کے صدر شعبۂ انگریزی پروفیسر کے۔ایس مشرا نے لکھا (جو میری تھیسس کے ممتحن بھی تھے) میرے تحقیقی مقالے پر دیگر ممتحن حضرات پروفیسر جانکی رام (جے پور یونیورسٹی) اور پروفیسر چودھری (بنارس ہندو یونیورسٹی) نے بھی بہت مثبت رائے دی تھی۔(اس مقالے پر مجھے پی۔ایچ ڈی کی ڈگری ملی اور ۱۹۹۸ء میں اس کی اشاعت کے بعد میں پروفیسر ہوئی—— (یہ تفصیل برسبیل تذکرہ لیکن لازی سمجھی) بہترین انگریزی شاعرہ اور اسکالر

کیتھلین رین کوتب کے صدر شعبۂ اور (میرے محترم استاذ گرامی) پروفیسر اسلوب احمد انصاری
نے مدعو کیا۔ ڈاکٹر کیتھلن رین نے شعبہ کے سمینار میں ولیم بلیک اور ڈبلو بی ییٹس پر لکچرز دیئے
.... میں نے اپنی دونوں کتابیں ان کو پیش کیں، جن پر انھوں نے اپنے مکاتیب کے ذریعہ بہت
مثبت رائے دی — میرے بھائی پروفیسر مقبول حسن خاں مرحوم (جو شعبۂ انگریزی کے بہترین
اساتذہ اور اسکالرز میں شمار کئے جاتے ہیں) نے انگریزی میں میرے بارے میں ایک مضمون لکھ
کر دیا تھا جس میں میرے افسانہ پیکر ناول ''جنگل کی آواز'' اور انکشافی تحقیق ''سید حامد کہ گم اُس
میں ہیں آفاق'' پر بہت اچھی رائے دی تھی۔ میرے ایک 'کولیگ' اور تب کے صدر شعبۂ انگریزی
پروفیسر سیّد وقار حسین نے میری ادبی کاوشوں اور شعبہ میں میری کارکردگی پر اظہارِ خیال کیا۔
(بہ صورتِ سند) میرے شعبۂ انگریزی کے چند کولیگز اور شاگردوں کی آرا — مندرجہ بالا سبھی
تبصرے اور رائیں انگریزی کے سیکشن میں شامل کئے ہیں۔

۲۰۰۱ء تک میری کوئی کتاب بہ زبان اردو شائع نہ ہوسکی تھی — انگریزی ادب کی تدریس،
خانہ داری کی ذمّہ داریاں اور بچوں کی پرورش مانع تھی۔ گوکہ گاہے گاہے منظومات، افسانے،
مضامین، انشائیے، خاکے اور طویل مقالے لکھتی رہی تھی جو شائع بھی ہوئے تھے — میں نے قبل از
وقت رٹائرمنٹ لے لیا تاکہ اردو کے تخلیقی کیریئر سے انصاف کرسکوں — اُسی سال افسانوی
مجموعہ ''پانی اور چٹان شائع کیا (اپنے ہی قائم کردہ وژن پبلی کیشنز کے ذریعہ) اس مجموعہ پر پروفیسر
ثناء اللہ ندوی، حقانی القاسمی، احمد ہمیش اور سلام بن رزاق کے تبصرے شائع ہوئے۔ زیادہ پبلسٹی کر نہ
سکی۔ اس مجموعہ کا طویل پیش لفظ میرے تخلیقی سفر کی روئداد ہے۔ (۱۹۵۶ء سے لے کر ۲۰۰۱ء تک)

۲۰۰۳ء میں طویل تشریحی وانکشافی وتخلیقی تحقیق ''سیّد حامد کہ گم اُس میں ہیں آفاق'' شائع
کی۔ اس کی ترتیب وتزئین بھی میں نے خود ہی کی تھی (مع سرورق کے) جس کو بہت سراہا گیا۔
جمیل الدین عالی مرحوم نے مجھ سے باضابطہ اجازت لے کر اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن کراچی میں
شائع کیا۔ اس کی رسم اجرا بھی کی انھیں یہ کتاب بہت پسند آئی تھی۔ بے شمار تبصرے اور مضامین
شائع ہوئے اور مکاتیب بھی مشاہرین کے میرے نام آئے جو اس کتاب میں موجود ہیں۔ شمس
الرحمٰن فاروقی صاحب نے خیال آرائی کی ''حق ادا کردیا'' نارنگ صاحب نے مجھ سے کہا

"magnum Opus" —!

۲۰۱۱ء میں "جنگل کی آواز" (ادبی تخلیقات کا مجموعہ) کی اشاعت ہوئی جس میں کہانیاں، افسانے، تذکرے، حجاب امتیاز علی کی طرز میں طرحی افسانے، "افسانہ پیکر ناول"، حجاب کی طرز میں طرحی ناول، تبصرے، تنقیدی مضامین، مختصر رائیں شامل تھیں اور شروع میں پیش لفظ — اور یہ سب ادبی تخلیقات ہی ہیں۔ یہ ایک تجربہ تھا۔ اس میں فقط بارہ صفحات پر مشتمل "افسانہ پیکر" ناول "جنگل کی آواز" بھی شامل ہے جو میرے غیر مطبوعہ طویل سوانحی ناول "ساز فطرت کے آہنگ" کا پہلا باب ہے۔ (ایک ہزار صفحات پر مشتمل یہ طویل ناول جلد ہی شائع ہوگا) ادبی تخلیقات کے اس مجموعے کے پیش لفظ میں میں نے اپنی اس مختصر تحقیق کا ذکر کیا ہے۔ جس کے تحت میں نے اسے ناول کہا ہے۔ اس کے بارے میں حقانی القاسمی لکھتے ہیں:

> "تجربہ کرنے والا ہر تخلیقی ذہن قابل احترام ہے تجربہ کی کامیابی یا ناکامی کا تعین وقت کرتا ہے۔ نجمہ محمود نے مختصر ناول اور طرحی افسانے کے خوبصورت تجربے کئے ہیں۔ اس لئے ان کے تخلیقی تجربوں پر داد ضرور ملنا چاہئے"۔ (ماہنامہ "بزم سہارا" میں شائع شدہ "افسانہ پیکر ناول "جنگل کی آواز" پر رائے)

اسی کتاب میں بھی تبصرے اور مضامین روشن تشریحی تحقیقات ہیں مستقبل کے محققین کے کام آئیں گے۔

۲۰۱۲ء میں شاعری کا مجموعہ "ریگستان میں جھیل" شائع کیا۔ جس کا "حرف اول" سیّد حامد صاحب سے ۲۰۰۷ء میں لکھوایا تھا۔ اپنی شاعری کی طرف سے کچھ بے دلی اور بے نیازی کی کیفیت رہی تھی۔ ہمت شکنی ہوئی تھی — ویسے اکثر میری نظمیں شائع ہوتی رہی تھیں — اشاعت سے ابتدا میں قطعاً بے نیاز رہی تھی۔ زمانۂ طالب علمی میں تحریر شدہ اپنی پہلی نظم "راز سربستہ" چالیس سال بعد ماہنامہ "شاعر" میں شائع کروائی! طویل نثری نظم "مدر گاڈ لیس" ماہنامہ "شاعر" میں "نثری نظم اور آزاد غزل نمبر" میں شائع ہوئی۔ اس پر عمدہ تبصرہ پروفیسر وحید اختر (شعبۂ فلسفہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) نے لکھ کر دیا جس کو میں نے "ریگستان میں جھیل" کے فلیپ پر شائع

کیا۔ (وہ خود بہت اچھے شاعر اور نقاد تھے) خلیل الرحمٰن اعظمی کی وفات پر تعزیتی جلسہ میں ایک نظم ''شجر سایہ دار'' سنائی جسے سن کر صدر جلسہ سیّد مظفر حسین برنی (مہمان خصوصی) نے کہا ''علی گڑھ میں تین شاعرات ہیں' 'ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی اور نجمہ محمود''۔ لیکن پھر نہ جانے کیوں میرا نام شعرا کی فہرست سے خارج کر دیا گیا۔ لیکن اس سے مجھے ایک فائدہ ہوا کہ میرے اوپر ''شاعرہ'' کا ٹھپہ لگتے لگتے رہ گیا۔ جس نے میری شخصیت کو شاعری کی تنگنائی سے نکال کر ہمہ جہت بننے میں مدد کی—
''ریگستان میں جھیل'' پر ریاض الرحمٰن خاں شروانی کا تبصرہ ان کے رسالے ''کانفرنس گزٹ'' میں شائع ہوا۔ مہر افروز کا تحقیقی مقالہ — ''نجمہ محمود: بندشوں کی جمالیاتی آزادی'' ماہنامہ ''تریاق'' میں شائع ہوا۔ مذکورہ بالا ''تخلیقی تنوع'' کے سلسلہ میں ابتدا میں ''مضامین'' کے تحت دی گئی تحریریں پڑھنے کی خصوصی گزارش ہے— ''نجمہ محمود کا تخلیقی تنوع''، ''نجمہ محمود کا نشانِ امتیاز''، ''ہم اپنی مشعل احساس لے کے جب نکلے''، ''پروفیسر نجمہ محمود کی فنی جہات'' اور ''نجمہ محمود کا ادبی وجدان''۔

راقم سطور نے بیش تر نثر میں شاعری کی ہے— فکشن میں یہاں تک کہ تنقید میں بھی شاعری کی ہے یوں کہ شاعری وزن، بحر اور قافیہ کی محتاج نہیں— خلیل جبران، بودلیئر، ورجینا وولف، جمیلہ ہاشمی اور قرۃ العین حیدر نے نثر میں شاعری کی— میں نے جب جب راہوں کو تنگ دیکھا راہ بدل دی—

جہاں میں اہل ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

(اقبال)

۲۰۱۶ء میں مضامین، مقالات، خاکوں اور انشائیوں کا مجموعہ ''بے زنجیر جستجو'' شائع کیا۔ یہ سب تشریحی وانکشافی تحقیقات ہیں جن میں بیش تر رسائل اور اخبارات میں شائع ہو چکے تھے ساتھ ہی سمیناروں میں بھی پیش کیے گئے تھے۔ اس کتاب میں شامل چند مضامین اور طویل مقالات کے عنوانات ہیں— ''شعور کی رَو تکنک یا تصور خودی— ورجینا وولف، اقبال اور مشرقی صوفیاء کے حوالے سے'' اصناف سخن کی مستند روایات میں اضافے کے امکانات''، ''اصلاح معاشرہ کی لازمی جہت''، ''تحقیق الہام ایک لمحۂ انکشاف'' وغیرہ—

یہ مجموعہ بہت کم تعداد میں شائع کیا بہ وجوہ۔ اس پر تین عدد تبصرے شائع ہوئے—
ایوب واقف، فیروز دہلوی اور پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی کے۔ اس کتاب میں میں نے
ماہنامہ ''تحریرِنو'' میں شائع شدہ اپنا ایک مکتوب بھی شامل کیا تھا جس پر ریاض الرحمٰن شروانی صاحب
نے ''کانفرنس گزٹ'' میں اپنے تبصرے میں میرے ایک جملے پر بہت معرکتہ الآراء رائے دی تھی۔
وہ جملہ یہ تھا— ''گاندھی جی کا خون بہا جس کو سب نے دیکھا، مولانا ابوالکلام آزاد کا خون
بہا لیکن کسی نے نہیں دیکھا وہ جیتے جی قتل ہوئے''۔
اور وہ رائے یہ تھی— ''یہ جملہ ہیرے موتیوں میں تولنے کے قابل ہے۔ یہ الہامی جملہ ہے''۔
وہ مکتوب میری اس کتاب یعنی ''بے زنجیر جستجو'' میں شامل ہے شاید کبھی پڑھا جائے۔
۲۰۱۴ء میں انگریزی میں سیّد حامد پر ''Muslim Face of India'' کے لئے مدیر کی
درخواست پر ایک مقالہ لکھا تھا بہ عنوان ''Saiyid Hamid: a Living Stream'' جس کے
بارے میں مجھ سے سیّد حامد صاحب نے کہا تھا یہ ''اس Volume کا سب سے اچھا مقالہ ہو
گا''۔ لیکن یہ زیادہ ''فلسفیانہ''، ''صوفیانہ اور ''عالمانہ'' ہونے کی وجہ سے شائع نہیں کیا گیا۔
(میرا علم گویا میرا عیب بن گیا۔) یہ میری ایک تشریحی وانکشافی تحقیق تھی۔ میں نے پھر ایک سطحی سا
مضمون لکھ کر بھیج دیا جسے خوشی خوشی شائع کر دیا گیا۔ اسے بعد میں مونوگراف کی صورت میں شائع
کیا اور پیش لفظ میں ''حالِ دل'' بھی بیان کر دیا۔ وہ پیش لفظ انگریزی کے سیکشن میں شامل ہے اور
اس مونوگراف پر ریاض الرحمٰن خاں شروانی نے اپنے رسالے ''کانفرنس گزٹ'' میں اردو میں تبصرہ
کیا۔ وہ بھی اس کتاب میں موجود ہے۔
میرے افسانہ پیکر ناول ''جنگل کی آواز'' کی صداخوانی کی ریکارڈنگ بیٹے کے اصرار پر اس
کے دوست کے اسٹوڈیو میں ہوئی۔ اس میں جنگل کی فسوں خیز موسیقی سرایت کی گئی (جس کو تخیل کی
مدد سے سن سکنا کچھ مشکل ہوتا) مثلاً طیور کی نغمہ ریزیاں، سمندر کی لہروں کی موسیقی، ہواؤں کے سُر گم،
بارش کی رِم جھم، بادلوں کی گرج، بجلی کی کڑک، جھرنوں اور چشموں کے پانیوں کی موسیقی، دریا کی
لہروں کی سمفنی اور بانسری کی مدھر تانیں۔ 'سی ڈیز' کے ذریعہ یہ پیغام دور دور تک پہنچ گیا۔ امن عالم
کا پیغام۔ اسے یوٹیوب پر بھی پیش کیا گیا۔ 'فیس بک' کے ''عالمی افسانہ فورم'' پر بھی اسے اہتمام سے

پیش کیا گیا۔ سامعین کے معیاری تبصرے شائع ہوئے جن کو نقل کر کے اس کتاب میں شامل کیا۔ تب تک پرنٹ میڈیا میں اس پر فقط حقانی القاسمی اور خان حفیظ کے مختصر تبصرے شائع ہوئے تھے۔

انگریزی کے رومانی شاعر شیلے نے اپنی نظم ''Ode to the Westwind'' میں کہا تھا ''تیز طوفانی مغربی ہوا میرے خیالات کو کائنات میں بکھیر دے۔ میرے الفاظ دور دور پہنچ جائیں''۔ اور یہی میری بھی آرزو ہے۔ یوں کہ ''دنیا شورشوں سے پر ہو چکی ہے'' (جمیلہ ہاشمی) اور ورجینا وولف نے کہا تھا— ''تہذیب کی دیوار منہدم ہو رہی ہے''۔

میرے افسانے ''لہر لہر سمندر''، ''غار'' اور ''خالی جھولی'' بھی وحید قمر نے ''عالمی افسانہ فورم'' پر پوسٹ کیے جن پر گراں قدر تبصرے سامنے آئے۔ پہلی بار ان کو درخورِ اعتنا سمجھا گیا (جب کہ وہ اہم رسائل میں شائع ہو چکے تھے) ہاں افسانہ ''غار'' بے شک ابوظبہی اور لکھنؤ کی ادبی نشستوں میں بہت پسند کیا گیا تھا۔ یہ آل انڈیا ریڈیو پر بھی نشر ہوا تھا اور ابوالکلام قاسمی اور مظہر امام نے مذاکرے میں اس کی بہت تعریف کی تھی— لیکن مبسوط تبصرے کسی افسانے پر شائع نہیں ہوئے تھے— ان سبھی افسانوں اور ''افسانہ پیکر ناول ''جنگل کی آواز'' کے ذریعہ بہترین تشریحی تحقیقین سامنے آئے۔ قارئین سے اِن سبھی کو پڑھنے کی گذارش ہے (فہرست سازی سے گریزاں ہوں)

ایک عمدہ تبصرہ دراصل ایک مختصر تحقیق ہی ہوتا ہے۔ ''تبصرے کی خوبی نہ اس کی لفاظی ہوتی ہے نہ طوالت بلکہ ایمان اور دیانت داری ہوتی ہے۔'' اس کتاب میں سبھی تبصرے دیانت دارانہ ہی ہیں۔

افسانہ پیکر ناول ''جنگل کی آواز'' کے بارے میں سیّد حامد صاحب کا تبصرہ ملاحظہ کیجیے جو کہ اندرونی صفحات میں موجود ہے لیکن ایک خاص مقصد کے تحت یہاں پیش کر رہی ہوں—

''جنگل کی آواز'' میں جز وکل پر حاوی ہے''۔ ناول نگار نے اسے مختصر ترین ناول سے موسوم کیا ہے۔ حالانکہ یہ ایک بڑے ناول کا پہلا باب ہے، اس کا تعارف کرتا ہے، اس کی شیرازہ بندی کرتا ہے— یہ غماز ہے تکوین کائنات کے اس رمز کا کہ قطرہ کو دریا اور ذرّہ کو خورشید سے جدا نہیں کر سکتے۔ یہ ''افسانہ پیکر'' ناول لکھ کر نجمہ صاحبہ نے اپنا نام عالمی ادب سے وابستہ اُن خلاق اور حقیقت رَس مفکرین، مصنفین اور شعرا کی فہرست میں درج کرا دیا ہے جو زندگی کو بے دِلی اور بے حسی سے برتنے کے بجائے اُس کے ظالم فشار کو اپنی نَس نَس میں محسوس کرتے رہے ہیں۔ اور جنھوں نے

اس کے خلاف آواز میں آواز ملا کر احتجاج پر کمر ہمت باندھی ہے۔ راقم سطور کو گذشتہ چند سالوں میں اُن کی نگارشات کو دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ اُن کے مختصر ترین ناول کا مطالعہ کرتے وقت اسے محسوس ہوا کہ اِس اثنا میں زبان و بیان پر قدرت اور فکر کی بالیدگی اور فنّی شعور کے ارتقاء اور عالمی مسائل کے ادراک اور انجذاب میں انھوں نے بہت سی منزلیں طے کر لی ہیں۔'' (۲۰۰۴ء)

راقم سطور ممنون ہے اُن سبھی محترم ہستیوں کی جو ماضی بعید وقریب میں اس دارِ فانی سے کوچ کر چکے ہیں جنھوں نے اس کی نگارشات کے بارے میں تحسین آمیز کلمات ادا کئے اور طویل و مختصر تبصرے کئے (جن کو ہم تشریحات وتحقیقات کہہ سکتے ہیں۔) میں قصداً اُن سب کے نام لینا لازمی سمجھتی ہوں—

سیّد سجاد ظہیر، رضیہ سجاد ظہیر، قاضی عبدالستار، عارف حسین جونپوری، خان جمیل، عرفان صدیقی، پروفیسر وحید اختر، پروفیسر شکیل الرحمٰن، وہاب اشرفی، سیّد مظفر حسین برنی، خلیل الرحمٰن اعظمی، ریاض الرحمٰن خاں شروانی، جگن ناتھ آزاد، مولانا محمد سالم قاسمی، حکیم عبدالحمید، سید محمد، جمیل الدین عالی، احمد ندیم قاسمی، پروفیسر عبدالمغنی، پروفیسر محمد شریف خاں، پروفیسر ہرلیش رائے زادہ، سیّد امین اشرف، پروفیسر سید وقار حسین، پروفیسر مقبول حسن خاں اور سیّد حامد...

ساتھ ہی میں ان تمام معزز ہستیوں کی تہ دل سے ممنون ہوں جو بفضلہٖ حیات ہیں جنھوں نے میری تصانیف اور مختلف النوع تحریروں پر گراں قدر تبصرے کئے جن کو ہم تشریحی تحقیقات کہہ سکتے ہیں اور جو تنقید کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ اللہ اُن سب کا حامی و ناصر ہو اور نفسا نفسی کے اس پُر آشوب دور میں ان کی جان اور عزت و آبرو کی حفاظت کرے۔ آمین۔

ان سبھی محققین کی نذر یہ شعر—

؎ برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

اور—

''راقم الحروف یہ وعدہ کرتی ہے دنیا کے سارے قلم کاروں سے کہ اگر عالمی سطح پر آپ نے ایک مثالی معاشرہ قائم کر دیا تو وہ قلم رکھ دے گی اور فقط

ایک گوشۂ تنہائی میں، ایک چھوٹے سے حجرے میں، جس کے چہار سو، پھول کھلتے ہوں، پہاڑوں کے سلسلے ہوں، جھرنے گیت گاتے ہوں، طیور نغمہ ریزی کرتے ہوں، ہوائیں گنگناتی ہوں، وہ مسرور وشاداں، مطمئن اور پُرسکون ہوگی اور کوئی اُس کا نام بھی نہ جانتا ہوگا کہ وہ گم نام ہی رہنا چاہتی ہے''۔

نجمہ محمود

Mob. 09837214069
00971506486993
Email:najmamahmood5@gmail.com

○

دنیا کی بہترین شاعری کہانیوں کو سموئے ہوئے ہے۔ (شاعری جسے انسان کا بہترین کلام کہا گیا ہے، علم کی روح اور تنفّس کہا گیا ہے) مثال کے طور پر رومی جنھوں نے کہانی اور شاعری کو یکجا کر کے معجزے دکھائے۔ دانتے اور شیکپیئر نے بھی یہی کیا۔ ورجینیا نے ناول میں شاعری کی۔ خلیل جبران کی تحریریں شاعری بھی ہیں اور افسانہ بھی۔ معرفت، تصوف، پیغامبری اور قرآن شریف میں بہترین کہانیاں اور شاعری موجود ہے''۔

(مشمولہ پیش لفظ ''جنگل کی آواز'')

مصنّفہ کی شخصیت اور تحریروں کے
بارے میں قارئین کی رائیں

○

''ہر طرف سیاہ طوفانی لہریں ..... اندھیری رات .....یخ بستہ ہوائیں..... لہروں کا شور..... طوفان بادوباراں..... اور ایک ناؤ جو بہے چلی جاتی تھی..... لہریں جس کے اندر بس آیا ہی چاہتی تھیں''!

(اقتباس از: ناول بہ عنوان ''مانجھی''
مشمولہ ''جنگل کی آواز'' (ادبی تخلیقات کا مجموعہ)

سید سجاد ظہیر

''نجمہ محمود میں بڑا ادیب بننے کے جراثیم ہیں''۔

(۱۹۶۲)

○

رضیہ سجاد ظہیر

''نجمہ محمود کی سادگی، معصومیت، گھبراہٹ اور خلوص اس بات کے ضامن ہیں کہ وہ مستقبل میں بڑی ادیب ہوں''۔

(۱۹۶۲)

○

قاضی عبدالستار

یہ افسانہ ہم کو قرۃ العین حیدر کی یاد دلاتا ہے۔ ان کے افسانوں کا موضوع اکثر یہی رہا کرتا ہے کہ ایک آئنڈیلسٹ لڑکی ایک Uncultured فضا میں سانس لینے پر مجبور ہوتی ہے۔ اس کا Conflict سماج کی قدروں سے ہے جو پرانی قدروں سے وابستہ ہے۔ یہ بہت بڑی تھیم تھی تو اس بات کا امکان تھا کہ وہ قرۃ العین حیدر کی نقالی کرنے لگ جاتیں۔ قرۃ العین کی خامیوں سے بچ کر دو صفحے بھی لکھ لینا بہت بڑی بات ہے۔ اس بات سے امید ہے کہ وہ اچھے افسانے لکھ سکیں گی۔
(افسانہ: ادھورے سپنے''۔ (بعد میں عنوان بدل کر ''پانی اور چٹان'' کیا گیا)

(۱۹۶۵)

○

وحید اختر

نجمہ محمود نے ہر طرح کے افسانے لکھے ہیں۔ بچوں کو سلانے والی خواب آور چڑیا چڑے کی

کہانی کی تکنیک سے علامتی اسلوب تک اور کردار سازی سے بیانیہ انداز تک سب کچھ ان کے افسانوں میں مل جائے گا۔ ان افسانوں میں نیا طرز احساس ہے لیکن رومانیت کی زیریں لہر سے عاری نہیں۔ صحیح رویہ یہ ہوگا کہ ان کو افسانہ سمجھ کر پڑھا جائے۔ افسانے میں افسانویت نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ نجمہ کو ہر انداز میں کہانی کہنے کا فن آتا ہے۔ اس لیے توقع کی جانی چاہیے کہ وہ افسانے سے اپنی انفرادیت منوالیں گی''۔

(۱۹۶۲)

○

احمد ہمیش

نجمہ محمود کا بہ یک وقت خلاق، اہل علم، اہل نقد ونظر اور اہل اسلوب ہونا اپنی جگہ مسلم اور ثابت ہے جب کہ شعر ونثر میں ایسی کتابیں کم ہیں۔ نجمہ محمود کی کہانیوں میں ان کی تخلیقی انا اور فردیت پر نظر کرتے ہیں تو کہانی ''آئینہ کی تصویر'' میں موضوع، بیانیہ اور تکنیک کے اعتبار سے تاثریت کی پینٹنگ سے کام لیا گیا ہے جہاں تک ''بوڑھا برگد''، ''ذکر ایک مشعل بہ کف اور قندیل بہ چشم''، ''دوسری دنیا کا باسی''، ''نرگس کے پھول''، ''قصہ ایک درخت کا'' کہانیوں کا تعلق ہے تو ان میں جاتک کتھاؤں اور صوفیائے کرام کے ملفوظات و حکایات جیسا برتاؤ پایا جاتا ہے۔ تاہم درون موضوع نجمہ محمود نے ''مدر گاڈیس'' کے تصور کو ہی اجاگر کیا ہے۔ جبکہ ''آسماں تیری لحد پر'' کہانی میں ماں کی موت اور اس کی قبر کے بیان میں نجمہ محمود کا تصورِ غم بھی مادرانہ نظام کی یاد دلاتا ہے۔ اور یہ حوالہ ہی نجمہ محمود کی کہانیوں کے تعین قدر کے لئے کافی ہے''۔

(۲۰۰۷ء، مطبوعہ ماہنامہ ''تشکیل''، کراچی)

○

شکیل الرحمٰن

نجمہ محمود کی تحریروں کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک پُر خلوص شخصیت کی تصویر ابھرتی ہے۔ علم دوست ہیں مطالعہ وسیع ہے۔ انگریزی ادب سے گہری دلچسپی کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ انھوں

نے ورجینیا وولف کو اپنے مطالعے کا خاص موضوع بنایا۔ ورجینیا وولف جو جیمس جوائس کے بعد فکشن میں ایک مستقل رجحان بن گئیں جنھوں نے چشمۂ شعور کی تکنیک میں ایک نئی جہت پیدا کی۔

نجمہ محمود نے بہت لکھا ہے۔ افسانے لکھے، خاکے لکھے، تنقیدی مضامین تحریر کیے، نظمیں تخلیق کیں، جو بھی لکھا ادبی اقدار کی اہمیت اور ان کی قدر و قیمت کو سمجھتے ہوئے لکھا۔ نجمہ محمود کے افسانے جہاں معاشرے کے خدوخال ابھارتے ہیں وہاں کرداروں کے عمل اور ردِ عمل سے زندگی کی سچائیوں کو فنکارانہ طور پر اجاگر کرتے رہتے ہیں۔ یہ افسانے زندگی کے نشیب و فراز اور گھر اور معاشرے کی پیچیدگیوں کو موضوع بناتے ہیں تو نجمہ محمود کی بہترین تخلیقی صلاحیتوں کی پہچان ہوتی ہے۔ ان کے بعض افسانے مثلاً ''بوڑھا برگد''، ''غار''، ''خالی جھولی''، ''پانی اور چٹان''، ''زرد پتے'' وغیرہ اس لئے بھی توجہ طلب ہیں کہ ان میں ایک جانب زندگی کی کشمکش، کرداروں کے نفسیاتی تصادم اور واقعات کی عمدہ پیش کش ہے تو دوسری طرف عمدہ فضا نگاری، تصویر کشی اور فطرت اور کردار کی ہم آہنگی کے جمالیاتی نقوش۔

(مطبوعہ ''شاعر'' ۲۰۰۹)

○

پروفیسر ابوسفیان اصلاحی

یہ بات مسلم ہے کہ علی گڑھ کے نسائی ادب میں جن شخصیات نے تفردات کے ڈھیر لگائے ہیں ان میں ایک جلی نام پروفیسر نجمہ محمود کا ہے جنھیں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھنے پر قدرت ہے۔ اپنے اسلوب اور اپنی فکر سے جہان معانی پیدا کیا ہے اور اس جہان معانی کی آرائش میں ایسے کمالات دکھائے ہیں کہ آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔ یہ کرشمہ سازیاں ان کے یہاں صرف اس لیے ہیں کہ انگریزی اور اردو کے علاوہ دیگر زبانوں کے ادبیات کو پڑھنے اور ان کے افکار کو اپنی تحریروں میں سمونے کا انھیں فن آتا ہے خلیل جبران سے نہ صرف انھیں محبت بلکہ عشق ہے۔ آپ کے اندر فکری اضطراب اور ادبی اشتیاق پیدا کرنے میں آپ کے بھائی محترم پروفیسر مقبول حسن خاں کا اساسی رول ہے۔ یقیناً دونوں بہن اور بھائی نے مل کر ادارۂ سرسید کی تزئین میں ایک

قابل قدر باب رقم کیا ہے۔ یہاں ان کی شخصی تفسیر میں جانے کی گنجائش نہیں ورنہ ان پر بہت کچھ لکھا جاسکتا تھا۔افسوس کہ پروفیسر صاحب کے اکتسابات سے بھی یہ مشاہیر علی گڑھ خالی ہے۔

(ماخوذ اداریہ ''تہذیب الاخلاق''، ''مشاہیر علی گڑھ نمبر''، علی گڑھ)

○

وہاب اشرفی

ڈاکٹر نجمہ محمود کے علمی وادبی کارناموں سے اپنی عدم واقفیت مجھے بے حد شرمندہ کر رہی ہے۔ دراصل زیادہ تر وہی لوگ پڑھے جاتے ہیں جو اپنی صلاحیتوں سے زیادہ تعلقات پر بھروسہ کرتے ہیں اور ایسی روش میں نت نئے پہلو پیدا کرتے ہیں ایسے میں بے نیاز ادیب وشاعر جو قابل لحاظ بھی ہیں وہ قعر گمنامی میں گم ہوجاتے ہیں۔ محترمہ نجمہ محمود نے گراں قدر ادبی کام انجام دیے۔ انھوں نے اچھی خاصی تعداد میں افسانے تخلیق کیے جن سے نہ صرف ان کے موضوعات کی خبر ملتی ہے بلکہ انفرادی اسلوب اور فکر کی بھی۔ حجاب امتیاز علی کی روش میں نیا آہنگ کیسے پیدا کیا جاسکتا ہے وہ ان کے بعض افسانوں سے مترشح ہے۔

ورجینیا وولف پر ان کی کتاب اپنے محتویات کے اعتبار سے بے حد منفرد ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ نے محترم سید حامد صاحب کی سوانح عمری قلمبند کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مکالموں اور گفتگو سے جو مواد سامنے آیا ہے وہ خود نوشت کا درجہ رکھتا ہے۔ اس طرح کی کوئی دوسری سوانح میری نظر سے نہیں گذری۔ سید حامد صاحب کی زندگی کے بیش تر پہلو پڑھنے والوں کی نگاہوں کے سامنے ہوتے ہیں۔

نجمہ صاحبہ ایک عرصہ تک علی گڑھ کے شعبۂ انگریزی سے وابستہ رہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ جہاں وہ مشرقی ادبیات سے رشتہ قائم رکھنے پر اصرار کرتی ہیں وہیں مغربی ادب کے نئے اور پرانے تناظر پر بھی، جن کی چھاپ ان کی نگارشات میں نمایاں ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ محترمہ کی تحریروں سے میری شناسائی بہت تاخیر سے ہوئی لیکن میں نے ان سے مسرت اور بصیرت دونوں حاصل کیں۔ مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر نجمہ محمود ادبی طور پر فعال ہونے کی سعی مشکور کریں گی''۔

(مطبوعہ ''بزم سہارا، دہلی'' اگست ۲۰۰۹)

○

مشتاق صدف

پروفیسر نجمہ محمود ایک معتبر اور باکمال افسانہ نگار ہیں لیکن تاسف کی بات یہ ہے کہ ان کے ساتھ ہمارے نقادوں کا رویہ کبھی منصفانہ نہیں رہا۔ ان کا قصور یہ ہوسکتا ہے کہ نہ تو انھوں نے کبھی کسی انجمن کا مرکز نگاہ بننا پسند کیا اور نہ ہی انجمن سازی پر یقین کیا۔ زمانہ سازی کبھی سیکھی نہیں اور نہ ہی ادب کے کاسہ لیسوں کا ہنر اپنایا۔ اگر اعتماد کیا تو صرف اپنی تخلیقات پر۔ ناقدین کے متعصبانہ رویے کی بدولت انھیں وہ مقام نہ مل سکا جس کی وہ مستحق ہیں۔

نجمہ محمود کے افسانوی مجموعہ پانی اور چٹان کی روشنی میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ان کا فن دراصل پانی سے آگ بجھانے کا نہیں بلکہ پانی کے تیز بہاؤ میں دیے جلانے کا ہے، دیے سے چٹان پگھلانے کے عزم کا ہے۔ غار، گل مہر کے سائے تلے، لہر لہر سمندر، بوڑھا برگد، آئینہ کی تصویر، پانی اور چٹان، وجود کے سوتے سے جدا ان کی عمدہ کہانیاں ہیں۔ مختصر یہ کہ کہانی جو طرحدار تھی اسے تہہ دار بنانے والوں میں نجمہ محمود کا نام معاصر خواتین افسانہ نگاروں میں جیلانی بانو کے بعد آتا ہے۔

(مطبوعہ ''شاعر'' فروری ۲۰۰۹)

○

رضوان احمد

خط تصویر، کہانی سب ملے

''آئینہ کی تصویر'' بہت اچھی کہانی ہے علی گڑھ کے موجودہ حالات میں اور بھی معنی خیز ہے۔ نفسیاتی تجزیہ تو آپ نے بہت ہی اچھا کیا ہے''۔

(مکتوب، مورخہ ۲۷ر نومبر ۱۹۷۸ء)

○

ضیاء الرحمٰن انصاری

جنوری کے شمارے ''تہذیب الاخلاق'' میں آپ کا ایک مضمون بعنوان ''تحقیق الہام، ایک لمحۂ انکشاف'' نظر سے گذرا۔ بے حد مسرت ہوئی، زبان وبیان کے اعتبار سے بھی یہ مضمون خاصے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور جو رموز ونکات ''ریسرچ'' کے بارے میں بیان کیے گئے ہیں وہ یقیناً ہماری

معلومات میں اضافہ ہیں کیوں کہ آج کا ریسرچ اسکالر تحقیق شدہ تحقیق کو ایک مخصوص زاویے سے اپنی زبان میں بیان کر دیتا ہے۔ اور وہ صحیح معنوں میں تحقیق نہیں ہے۔ مقالہ نگار مبارک باد کا مستحق ہے۔

(۱۲ر دسمبر ۱۹۸۵ء)

○

خلیل الرحمٰن اعظمی

راز سربستہ خوبصورت نظم ہے۔ آپ کو اصلاح کی ضرورت نہیں۔

(۱۹۶۵ء)

○

سید مظفر حسین برنی

علی گڑھ میں تین شاعرات ہیں: ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی اور نجمہ محمود

(۱۹۸۷ء)

○

سید حامد

نجمہ محمود کی بہت سی نظمیں اس بسیط اور رواں ترنم سے متمول ہیں جسے شاعر قدرت سے اخذ کرتا ہے۔ جو قافیہ اور ردیف کی پابندی قبول نہیں کرتا۔ نظموں کی ہیئت سے قطع نظر وہ ایک منفرد شخصیت ایک متجسس نگاہ، ایک ذکی الحس اور بے تاب دل کی غماز ہیں۔

(۲۰۰۶ء)

○

عبدالمتین (اجمیر)

آپ کا تحقیقی مقالہ ''سید حامد نگار خانۂ رقصاں کی روشنی میں'' پڑھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ آپ کا سلسلہ چشتی صوفیہ سے ہے۔ آپ اجمیر آکر صوفی ازم پر لیکچر دیں۔

(اجمیر-۳-۲۰۰۳ء)

شمس الرحمٰن فاروقی

آپ نے ''سید حامد کہ گم اس میں ہیں آفاق'' لکھ کر حق ادا کر دیا۔

(۲۰۰۳ء)

ریاض الرحمٰن خاں شروانی

''پروفیسر نجمہ محمود کے مضامین اور مراسلات کا مجموعہ ''بے زنجیر جستجو'' پیش نظر ہے۔ اس کتاب کا نام سرسید احمد خاں کی فری انکوائری کا آزاد ترجمہ محسوس ہوتا ہے۔ کتاب کی حیثیت کشکول کی ہے یعنی اس میں مختلف موضوعات پر مضامین اور چند مراسلے شامل ہیں۔''

پروفیسر نجمہ محمود نے اپنے مراسلہ بہ نام ''تحریر نو'' کے آخر میں ایک جملہ لکھا ہے—— وہ ہیرے موتیوں سے تولنے کے قابل ہے۔ اس ساری بحث میں شاید اتنا مبنی برصداقت جملہ کبھی کسی نے نہ لکھا ہوگا۔ اگر لکھنے والے کو الہام ہوتا ہے تو یہ واقعی الہامی جملہ ہے۔ ''گاندھی جی کا خون بہا تو دنیا نے دیکھا، مولانا آزاد کا خون بہا کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ جیتے جی قتل ہو گئے۔''

(کانفرنس گزٹ، علی گڑھ، نومبر ۲۰۱۷ء)

○

گوپی چند نارنگ

آپ کی کتاب ''سید حامد کہ گم اس میں ہیں آفاق'' شاہکار ہے۔ Magnum Opus ہے۔

You are a prolific writer

(۲۰۰۳ء)

○

شہناز کنول غازی

نجمہ محمود کی تحریروں میں گہری مذہبیت اور روحانی وسعت نظر آتی ہے۔ ان کے افسانے، غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں اور کچھ سوال بھی اٹھاتے ہیں۔ جب وہ انسانی فطرت اور معاشرے کی

بے حسی پر بات کرتی ہیں تو دانش وروں کو لمحۂ فکریہ عطا کرتی ہیں ان کے افسانے وجود کے سوتے سے جدا اور ''میراث'' اسی انداز کے افسانے ہیں۔

○

شاہین مفتی

ہندوستانی قلم کاروں میں مجھے قرۃ العین حیدر، نیر مسعود، زبیر رضوی، شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، ستیہ پال آنند، ساجدہ زیدی اور نجمہ محمود نے متاثر کیا۔

(از: فنکار اب بھی مستور ہے، گوشۂ شاہین مفتی شاعر، مارچ ۲۰۰۸ء)

○

نشاط اقبال الدین

نجمہ محمود غیر معمولی شخصیت کی مالک ہیں وہ ایک مستند ادیب ہیں (افسانہ نگار شاعر، نقاد، محقق) وہ آج بھی تخلیقی عمل میں مصروف ہیں۔ ۳۴ سال انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں انگریزی ادب کی تدریس کی۔ نجمہ بہت نیک، منکسر المزاج، مخلص اور شریف خاتون ہیں۔ ان کے بہت سے لوگوں سے مراسم رہے ہیں اور ہیں۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو ان کے احسانات کے تلے دبے ہوئے ہیں لیکن جنھوں نے ان کے ساتھ وفا نہیں کی۔ انھوں نے اپنوں اور بہت سے دوسروں کا بہت خیال کیا۔ اکثر یہ بھی ہوا کہ دوسروں کے گھر کی آگ بجھانے میں اپنے ہاتھ جلا لئے۔

نجمہ ایک بہت مقبول استاد رہی ہیں۔ ملک اور بیرون ملک ان کی شاگردیں اور شاگرد پھیلے ہوئے ہیں جو ان کے معتقد ہیں۔ جو مقام ان کو ملنا چاہئے تھا وہ نہیں ملا (یا ملنے نہیں دیا گیا....) ان کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ نجمہ محمود پر یہ شعر صادق آتا ہے:

خوب ہے منظر گرداب کنارے سے مگر
آؤ گرداب کی نظر سے کنارا دیکھیں

○

عذرا فاروقی

ایک بے حد خوش اخلاق، خوش مزاج، مخلص اور محبتوں سے بھرپور شخصیت کا نام ہے نجمہ محمود۔ میرا ان کا پرانا ساتھ ہے اور میں نے ہر قدم پر ان کو اپنے ساتھ کھڑا پایا۔ جسمانی طور سے دھان پان نظر آنے والی نجمہ دراصل بہت مضبوط، باہمت، بہت باوقار انسان ہیں۔ ایک شعر یاد آ گیا:

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

محبت نجمہ کا مذہب اور سچائی ان کا ایمان ہے۔ وہ ایک Versatile انسان ہیں جن میں بہت سی خوبیاں ایک ساتھ موجود ہیں۔ ان کی ذات سے بہت سے لوگوں نے فائدہ حاصل کیا اور پھر مکمل طور سے ان کو فراموش کر دیا!

انگریزی کی بہت پسندیدہ استاد رہی ہیں۔ اور ملک اور بیرون ملک میں ان کے لاتعداد شاگرد موجود ہیں۔ انگریزی کے ساتھ اردو پر بھی زبردست عبور حاصل ہے۔ میں ان کی خوبیوں کو پوری طرح اُجاگر کرنے سے قاصر ہوں بس یہ کہوں گی کہ ایک اچھی استاد، ایک اچھی ادیبہ سے بڑھ کر وہ ایک بہت اچھی انسان ہیں اور میری بہت پیاری دوست ہیں!

اللہ تعالیٰ ان کو صحت کے ساتھ طویل عمر سے نوازے اور نظر بد سے بچائے۔ آمین!

○

فائزہ عباسی

میرے نزدیک پروفیسر نجمہ محمود کے مقابل بیٹھنا، اُن سے گفتگو ہونا اور ان کے بلند افکار سے روشناس ہونا، ظاہر ہے باعث انبساط تو ہر دفعہ ہوتا ہے ساتھ ہی ساتھ جامعہ کے وسیع کتب خانے یا علمی سرگرمیوں سے فیض یاب ہونے کے عین مترادف ہوتا ہے۔ انگریزی اور اردو میں آٹھ عدد کتابوں کے علاوہ بے شمار مضامین، مقالات، مذاکرات اور مکالمات ترتیب دینے کے بعد ایسا ہی معتبر نام نجمہ صاحبہ نے پیدا کر لیا ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ویمنس کالج میں انگریزی کی پروفیسر شعبۂ انگریزی میں ایم اے کے طلباء کی تدریس اور ریسرچ اسکالرز کی رہنمائی و

رہبری، متعدد ادبی، سماجی وثقافتی مجلسوں کی بانی اور سرکردہ رکن، خاتون خانہ، شفیق ماں اور پھر قلم کار بھی ایسے پائے کی کہ برصغیر میں اپنی مثال آپ ہیں۔

اور تو اور تصنیف وتالیف کا دائرہ ایسا وسیع کہ ورجینیا وولف کی جیسی قد آور انگریزی کی مصنفہ پر مکمل پی ای ڈی تھیسس اور پھر سید حامد مرحوم کی ذات وخدمات پر ضخیم سوانحی کام کیا۔ اس بیچ ''جنگل کی آواز'' میں کیا کیا کچھ — ناچیز کی نظر میں ''تم جو سچ کے امیں''، ''ریگستان میں جھیل''، ''رہائی کی بے سود خواہش''، وغیرہ عمدہ نظمیں ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر کئی نظمیں اپنے منفرد انداز کی وجہ سے ناقابل فراموش رہیں گی۔

نجمہ محمود کی نثری یا منظوم تحریر ہو ایک ہی فلسفہ کی تائید میں رواں ہوتی ہے اور وہ ہے حق پسندی وحق گوئی، علم کے ذخیروں سے لبریز، خیال خیال ایک ابلتی ہوئی جوئے حیات، حرف حرف کھنکھناتی مٹی سا کھرا، مگر کبھی کسی ایوارڈ، انعام واکرام، اعزازات یا سرکاری عہدہ کی متلاشی نہیں۔ کیا خوب کہا ہے شاعر مشرق نے—

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے

دھان پان سے پیکر خاکی میں، جو نجمہ محمود صاحبہ کا ہے اس میں ایسی جاں کا ورثہ معدودے چند ہی کر پاتے ہیں۔ جتنا اور جیسا وہ اب تک لکھ چکی ہیں اور زندگی نے جس اعلیٰ مقام پر انھیں فائز کیا ہے وہ بھی ہر کسی کو حاصل نہیں ہوتا لیکن چشم، لب، دہن، دنداں اور پھر جسم جس میں جاں نجمہ محمود کا ہو تو پھر جنگل کی آواز آتی ہے!

The Woods are lovely dark and deep
But I have miles to go before I sleep

○

عزیزالدین خضری:

ہمارا قصبہ ملیح آباد پٹھانوں کی بستی تھا۔ جاگیردارانہ نظام کی جڑیں گہری تھیں۔ تعلیم کا فقدان تھا۔ لڑکیوں کے لئے تعلیم ممنوع تھی نوابین کی جاگیریں تھیں۔ زمین داری ختم ہوئی۔ ان حالات

میں کچھ بیدار مغز، مخیر حضرات کو نوجوانوں کو تعلیم کی راہ دکھانے کی فکر لاحق ہوئی۔ میرے دوست مقبول حسن خاں اور نجمہ محمود کے والد حاجی محمود حسن خاں بھی ان اصحاب فکر کے ہراول میں تھے جنھوں نے مالی ایثار کر کے ملیح آباد میں ہائی اسکول اور لڑکیوں کے لئے پرائمری اسکول قائم کئے۔ جس کی بدولت آج ملیح آباد میں بیسیوں پی ایچ ڈی، پروفیسر، ڈاکٹر ادیب اور افسران ہیں۔

نجمہ نے ہائی اسکول فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا (پرائیویٹ طالبہ کی حیثیت سے) پھر لکھنؤ کے کرامت حسین مسلم گرلز کالج سے بی اے کیا۔ اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور لکچرر ہوئیں (انگریزی میں) اور پروفیسر کی حیثیت سے رٹائرڈ ہوئیں۔ نجمہ ایک ہونہار طالبہ اور پورے تعلیمی سفر میں ایک ادیبہ کی حیثیت سے تصنیف وتالیف کا کام کرتی رہیں۔

نجمہ کے بھائی مقبول حسن خاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں انگلش ڈپارٹمنٹ میں پروفیسر تھے۔ نجمہ نے ایک ادیبہ کی حیثیت سے انگریزی اور اردو میں افسانے، ناول اور تحقیقی مقالے لکھے۔ ادبی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا شاعری بھی کرتی ہیں کئی کتابیں تصنیف کیں۔ انھوں نے ورجینیا وولف پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا جو شائع ہوا اور اس پر ان کو پروفیسر شپ ملی۔ پی ایچ ڈی کرنے والی اور پروفیسر کے عہدے تک پہنچنے والی ملیح آباد کی وہ پہلی خاتون ہیں۔ اس کا اعزاز بجا طور پر ان کے والد مرحوم حاجی محمود حسن خاں، والدہ رضیہ بیگم اور بھائی مقبول حسن خاں کو جاتا ہے۔

نجمہ محمود نے اپنے والدین اور بھائی اپنے ممتاز خاندان اور وطن عزیز ملیح آباد کا نام روشن کیا۔ ابھی بھی وہ تصنیف وتالیف کے کاموں میں مصروف ہیں۔

○

○

میرے اندر ہوائیں چلتی ہیں

میرے اندر ہوائیں چلتی ہیں
دھیمی دھیمی پھوار گرتی ہے
مجھ میں دریا ہیں موجزن ہر سو،
لہریں اٹھتی ہیں ڈوب جاتی ہیں
میرے اندر ہوائیں چلتی ہیں

مضامین

○

''نگار خانۂ رقصاں'' میں ادب اور تدبر کو یکجا کیا گیا ہے، اس کتاب سے ایک ایسی ٹھوس شخصیت سامنے آتی ہے جو ایک سچے عارف کی پہچان ہے۔

(از: سیّد حامد کہ گُم اُس میں ہیں آفاق)

سید حامد

نجمہ محمود کا نشانِ امتیاز

نجمہ صاحبہ نے ملیح آباد کے ایک ممتاز خاندان میں آنکھیں کھولیں۔ گویا اسی سال جب ''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک نے زور پکڑا اور حکومت برطانیہ کو پہلی بار یہ احساس ہوا کہ ہندوستان پر تصرّف کو طول دینا مصلحت کے خلاف ہوگا۔

نجمہ صاحبہ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم - اے اور ڈاکٹریٹ کی۔ ان کا علاقۂ تخصیص شیکسپیئر، ورجینیا وولف اور رومانی شاعری تھا۔ علی گڑھ میں ۱۹۶۸ء میں وہ انگریزی کے شعبہ میں لکچرر ہوئیں اور ۲۰۰۱ء میں وہیں سے وہ بہ حیثیت پروفیسر سبکدوش ہوئیں۔ یونیورسٹی کی علمی، ادبی اور ثقافتی زندگی میں بھی ان کی بھرپور شمولیت رہی۔

بہ حیثیت اہلِ قلم کے نجمہ محمود صاحبہ نے انگریزی اور اردو میں کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ان کے بایوڈاٹا پر نظر ڈالیں تو تخلیق اور تحقیق شانہ بہ شانہ چلتی ہوئی نظر آتی ہیں، اردو اور انگریزی میں یکساں روانی اور قدرت کے ساتھ۔ تنقید و تخلیق میں انہماک کے باوجود، یا ان کی بنا پر نجمہ محمود نے اپنی تدریسی زندگی کے غیر تدریسی امور میں غیر معمولی دلچسپی لی۔ ان کی پرنسپل اور ان کے شعبہ کے صدران کے اس دوطرفہ امتیاز کے گواہ رہے ہیں۔

جہاں تک اردو زبان اور ادب کا تعلق ہے ان کی تحریر و تقریر دونوں دلکش اور پراثر ہیں۔ نجمہ محمود کے جمالیاتی وجدان کا اعتراف کرنے پر منکرین بھی مجبور ہیں۔ نجمہ محمود کو قدرت نے ذکی الحس بنایا ہے۔ فطرت کا حسن ان کے لیے کشش رکھتا ہے۔ زبان کی لطافتیں ان کے دامن دل کو اپنی طرف کھینچتی ہیں وہ لطافتیں جنھوں نے ان کی تحریر کو روانی اور صوتی حسن سے مالا مال کر دیا ہے۔ راقم سطور کی گذارش پر فارسی غزل اور اردو قصیدہ کی طرف مائل ہوئی ہیں۔ وہ امید کرتا ہے کہ یہ مطالعہ ان کے اسلوب پر اثر انداز ہوگا اور اس کی معنویت اور بلاغت میں، جو یوں بھی اپنے وجود کا احساس دلاتی ہے، اضافہ کرے گا۔

نجمہ صاحبہ کا تذکرہ انگریزی اور اُردو ادب کے مطالعہ اور تخلیق وتنقید تک محدود نہیں۔ انہوں نے معاشرے کی اصلاح کی طرف بھی دھیان دیا اور انتہائی مؤثر انداز سے 'مشترک خاندان کیا منتشر ہوا' تہذیب کی دیوار منہدم ہونے لگی۔ ''خاندان تہذیب کی پہلی اکائی ہے۔ خاندان کا تصور اس طرح ختم ہوا... نوجوانوں کی بیرونی ممالک ہجرت سے اکہری فیملی کا چلن عام ہوا۔ شوہر باہر تو بیوی یہاں، بیوی باہر تو شوہر یہاں بچے ہاسٹلوں میں یا تنہا ماؤں کی سرپرستی میں۔'' فاضل مصنفہ نے مشترکہ خاندان کے بکھرنے کی روداد لکھنے کے بعد دکھتی رگ پر انگلی رکھی۔ ''عموماً تنہا خواتین (زیادہ عمر کی غیر شادی شدہ خواتین، بیوائیں، مطلقہ یا خلع یافتہ خواتین مشترکہ خاندان میں کھپ جایا کرتی تھیں (عزتِ نفس کو مجروح کر کے) اور اسی میں مرکھپ جایا کرتی تھیں۔''

''ہمارا سماج''، دہلی کی ۱۸ر جولائی ۲۰۰۸ءکی اشاعت میں نجمہ محمود صاحبہ نے ان عورتوں کا دردناک نقشہ کھینچا ہے جو تنہا رہ گئی ہیں۔ اور جنہیں ظالم اور بے درد سماج ذلیل اور خوار کرتے نہیں تھکتا۔ اور ایسا بھی نہیں کہ بدنصیب عورتوں کے خلاف تذلیل وتحقیر، ظلم وناانصافی کا یہ برتاؤ مذہب کے سائے میں ہورہا ہو۔ فاضل مضمون نگار نے ''بہشتی زیور'' سے یہ اقتباس نقل کیا ہے:

''ان ہی بیہودہ رسموں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بیوہ کے نکاح کو برا اور عار سمجھتے ہیں خاص کر شریف لوگ اس میں زیادہ مبتلا ہیں۔ شرعاً اور عقلاً جیسا پہلا نکاح ویسا ہی دوسرا۔ دونوں میں فرق سمجھنا بے وقوفی ہے۔ صرف ہندؤں سے میل جول اور کچھ جائداد کی محبت میں یہ خیال جم گیا ہے۔ ایمان اور عقل کی بات یہ ہے جس طرح پہلا نکاح بے روک ٹوک کر دیتے ہیں اسی طرح دوسرا نکاح بھی کر دیا کریں... یاد رکھو جب تک پہلے اور دوسرے نکاح کو یکساں نہیں سمجھوگی، تمہارا ایمان درست نہیں ہوگا۔''

عورتوں کے خلاف بعض رسمیں ہم نے اہل وطن سے سیکھ لیں۔ ان پر طلاق کے بے جا استعمال کا اور اضافہ کر دیا ہماری عورتیں کھلی ہوا میں سانس نہیں لے پاتیں اور ظالم سماج اس حیثیت سے انھیں محروم کر دیتا ہے جو اسلام نے انھیں دی ہے۔ ہمارے اکابرین نے سو سال سے زیادہ ہوئے اس حقیقت کا احساس اور اظہار کیا تھا کہ مسلمان اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتے جب تک کہ وہ عورتوں کی حالت اور حیثیت میں بہتری لانے پر رضامند نہیں ہوتے۔ ان کی حالت پر یہ

احساس ابھی بھی عاید ہوتا ہے اس پر مستزاد حال میں ہوئی دو تبدیلیاں ہیں: کئی ریاستوں میں اہل وطن کی ریس کرتے ہوئے مسلمانوں میں لڑکے والوں نے غیرت کو بالائے طاق رکھ کر لڑکی والوں پر مطالبات کا بوجھ ڈالنا شروع کر دیا ہے۔ یہ صریحاً ظلم ہے، یہ اس سے بھی بڑی کور باطنی اور کوتاہ اندیشی ہے۔ دوسرا جہالت کا عمل یہ ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم اور نشو ونما پر لڑکوں کے مقابلے میں، کم خرچ کیا جارہا ہے۔ سوء تقلید کا سلسلہ یہاں ختم نہیں ہوتا بچیوں کو پیدا ہونے سے روک دینے کا گناہ اب ہمارے یہاں بھی سرزد ہونے لگا ہے۔ بہر کیف اگر قوم کو فروغ اور ترقی دینا ہے تو عورتوں کی تعلیم، صحت اور نشو ونما کو اس کا ذریعہ بنایا جائے۔

ایسا لگتا ہے کہ نجمہ محمود صاحبہ نے عورتوں کے حقوق پر چند مضامین لکھ کر ہاتھ روک لیا۔ یہ سوچ کر کہ ان کا خاطر خواہ اثر نہیں ہورہا ہے ہتھیار ڈال دیئے۔ حالانکہ ملک کی عام فضا اور ملک کا سوادِ اعظم عورتوں کی حمایت میں ہے۔ خیالات میں بڑا اثر ہوتا ہے۔ اور انصاف کے لیے جو آواز اٹھائی جاتی ہے وہ رایگاں کبھی نہیں جاتی۔ یاد کیجئے کہ بنگال میں برہموسماج کی تحریک عورتوں کے ساتھ ناانصافی کے خلاف احتجاج کے بہ طور شروع ہوئی تھی۔ ہمارے ناروا، رسم ورواج نے عورتوں کی محرومی کا جس طرح سرو سامان کیا ہے اس کے خلاف احتجاج کی لے کو تیز کر دینا ہی ایک صالح معاشرے کی تشکیل کی طرف ایک ضروری قدم ہوگا۔

نجمہ محمود کی نگارشات میں ان کے مطالعہ کی وسعت کے ثبوت ملتے ہیں۔ انگریزی ادب کی وہ منتہی ہیں اور اس زبان وادب کو یونیورسٹی ٹیچر کی حیثیت سے پڑھانے میں انھوں نے عمر عزیز صرف کی ہے۔ انگریزی ادب پر عبور سے عام ذوق ادب پر نکھار آ گیا ہے۔ لیکن نجمہ محمود کے اکتسابات کو صرف ان کے مطالعہ پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ ان کو قدرت کی طرف سے ادب کا ذوق ودیعت ہوا ہے۔ زبان وبیان کے لطائف ونکات ان کی رگ جاں میں پیوست ہیں، حسن وجمال کی جو کشش وہ محسوس کرتی ہیں وہ ان کے اسلوب کی رعنائی کے ساتھ ان کی فکر کی زیبائی سے آشکار ہے۔ نثر کی روانی بتاتی ہے کہ ان کے یہاں آورد کا گذر نہیں، وہ سراسر آمد ہے۔

نجمہ محمود کا تعلق ملیح آباد کے ایک ممتاز، صاحبِ علم پٹھان خاندان سے ہے۔ خود دھان پان ہیں، لیکن جسّی نزاکت اور پیرایۂ بیان کی لطافت کے ساتھ ساتھ وہ ایک آہنی عزم رکھتی ہیں ان کے

بچے بفضلہ برسرروزگار ہیں۔ ان کا بڑا بیٹا دبئی میں مقیم ہے، بیٹی بھی دبئی میں ہے۔ چھوٹا بیٹا ممبئی میں فروکش ہے۔ خود نجمہ صاحبہ علی گڑھ میں مقیم ہیں لیکن اپنی عزتِ نفس، خودمختاری اور اپنی روش سے کسی مفاہمت کی قایل نہیں۔

فی الوقت نجمہ صاحبہ خودنوشت لکھ رہی ہیں۔ سرسری انداز سے ان کی طبیعت نفور ہے۔ وہ موضوع میں ڈوب کر، محو ہو کر لکھتی ہیں۔ اس خودنوشت میں کچھ ایسے مقام آنے والے ہیں جہاں قلم رک جاتا ہے، روانی بھول جاتا ہے، لکنت کرنے لگتا ہے۔ دیکھنا ہے کہ ایسے مقامات سے کیسے گذریں گی، ان مراحل کو کیسے سر کریں گی۔

یوپی رابطہ کمیٹی نے جو تعلیمی کاروانوں کے لیے معروف ہے انھیں شرکت کی دعوت دی وہ اکثر افتتاحیہ واختتامیہ جلسوں میں (جو علی گڑھ اور دہلی میں منعقد ہوئے) شریک بھی ہوئیں لیکن قلم سے قدم کی طرف جانے اور طویل مسافرت میں انھیں ہچکچاہٹ محسوس ہوئی اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ وہ قلم کی دھنی ہیں۔ بادیہ پیمائی ان کے لیے بہرحال موزوں نہیں ہے۔ ہاں کارِ خیر کے طور پر انھوں نے ایک ایسا طریق اختیار کیا ہے جسے ہم خرما وہم ثواب کو منسوب کرسکتے ہیں۔ وہ محلّہ کی غریب لڑکیوں کو گھر کی دیکھ بھال میں مدد کے لیے منتخب کرلیتی ہیں، انھیں پڑھاتی ہیں، تربیت دیتی ہیں۔

نجمہ محمود کی تخلیقات کا قاری ان کے پیرایۂ بیان سے متاثر تو بہر حال ہوگا۔ اسے ان کی خوداعتمادی اور عزم بالجزم کا قایل اور ستائش گر بھی ہونا پڑے گا۔ جیسا کہ پہلے آچکا ہے ہمارے معاشرہ میں عورت کی حیثیت اور مرتبہ کو بہتر بنانے کے لیے اور ان عورتوں کو جو حوادث کا شکار ہو کر تنہا رہ گئی ہیں۔ بے دردنگاہوں، بے مہریوں، تغافل اور نکتہ چینیوں سے بچانے کے لیے جو آواز انھوں نے اٹھائی ہے اس کی تائید سب صاحبانِ شعور پر واجب ہے لیکن بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ ان کی آواز پر صدائے برنخاست۔ معاشرہ اگر رحم دل اور دردمند ہو تو ان عورتوں کو جو حوادث کی ستائی ہوئی ہیں زبوں حال اور خوار نہ ہونے دے۔ لیکن ہمارا سماج بے رحم ہے وہ اسلام کی تعلیمات سے آنکھیں موند لیتا ہے۔ اور رسوم اور ظواہر کے حصار سے باہر نہیں نکلتا۔ غافل اس سے کہ اس کی بے حسی نے کتنی ہی زندگیوں کو اندوہناک بنادیا ہے۔ آفاتِ ارضی وسماوی سے تو عام طور پر مفر نہیں ہوتا۔ ان

کی ذمہ داری بھی ہم پر نہیں آتی۔ لیکن وہ مصیبتیں جو خود انسان دوسروں پر لاتے ہیں اور وہ اذیتیں اور آزار اور عقوبتیں اور تکلیفیں جو وہ انھیں پہونچاتے ہیں ان کا تو کوئی جواز ہو ہی نہیں سکتا۔ کوشش کیوں نہ کی جائے کہ ہم اپنے کو زیادہ انسان دوست اور رحمدل بنائیں۔ غموں اور تکلیفوں میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں اور پریشانیوں اور فکروں کے بوجھ کو ہلکا کریں نجمہ صاحبہ نے مصیبت زدہ اور مردم گزیدہ عورتوں کی تکلیفوں کو کم کرنے کے لیے آواز اٹھائی ہے۔ ان تکلیفوں کا لوگوں کو عام طور پر احساس بھی نہیں ہوتا کہ اس کے لیے وہ تخیل درکار ہے جو انسان کو اپنے کو دوسرے کی جگہ رکھنے کے آداب سکھاتا ہے۔

لیکن نجمہ محمود کا نشان امتیاز اس قدر خدمت خلق نہیں جس قدر ادب کی تخلیق اور قدر شناسی جس کے لیے قدرت نے انھیں چنا ہے۔ حس کی نازکی، جمال کا ادراک اور تخیل کی پرواز جسے ودیعت ہوئی ہو اسے اور کیا چاہئے۔

نجمہ محمود کو انگریزی اور اردو دونوں پر قدرت حاصل ہے۔ ان کے افسانے وتذکرے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ تخلیق کار کے پاس ذوق بھی ہے، فن بھی اور زبان بھی۔ نجمہ محمود نے حجاب امتیاز علی کی طرز میں ''طرحی'' افسانے لکھے ہیں اور ان کی کامیاب پیروی کی ہے۔ یہ افسانے دلچسپ بھی ہیں اور معنی خیز بھی۔ نجمہ صاحبہ نے از راہ تلطف راقم سطور پر ایک مہتمم بالشان کتاب ''کہ گم اس میں آفاق'' کے عنوان سے قلمبند کی۔ اس کتاب میں غلو کا سکہ چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے (ان کے خیال میں وہ غلو نہیں بلکہ حق گوئی ہے)۔ بہر حال وہ اپنی رائے کی مختار ہیں اور اس میں کوئی ترمیم وتخفیف انھیں ہرگز گوارا نہیں۔ درمیانی راستہ کی پابندی ہم اہل تخلیق پر عاید نہیں کر سکتے اور نجمہ صاحبہ پر تو بالکل بھی نہیں۔ نجمہ صاحبہ کا شعری مجموعہ ''ریگستان میں جھیل'' زیر طباعت ہے۔ یہ نظمیں ایک بے چین روح کی غماز ہیں ان میں مظاہر فطرت کا مشاہدہ اور دروں بینی دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں اس مجموعہ کو پڑھتے ہوئے ہم فکر، احساس اور جذبہ کے کبھی نہ ختم ہونے والے سفر میں شاعر کے رفیقِ راہ بن جاتے ہیں۔

فاضل مصنفہ کی نگارشات کی فہرس بنانے سے حذر بہتر۔ انگریزی میں ان کے تنقیدی مقالات کا مجموعہ ''دائرے سے مرکز تک'' ۱۹۹۴ء میں منظر عام پر آیا جو کہ ان کے حساس ذہن،

تنقیدی بصیرت اور شاعرانہ تخیل کا مظہر ہے۔ ان کی دوسری انگریزی تصنیف ''ورجینیا وولف کی تحریروں میں انسان کامل کا تصور-ایک تقابلی مطالعہ'' ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے پر مبنی ہے۔ یہ ایک انکشافی تحقیق ہے اہم ہندوستانی اور برطانوی ناقدین کے ذریعہ استناد حاصل اسے ہو چکا ہے۔ یہ تصانیف اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کی تحریر اور گفتگو میں جن اہل قلم کا ذکر اکثر آتا ہے وہ ورجینیا وولف، اقبال، خلیل جبران، رومی، قرۃ العین طاہرہ، ورڈزورتھ، کیٹس اور اروندو گھوش وغیرہ ہیں۔

بہ یک وقت تخلیق (شاعری، افسانہ، انشائیہ خاکہ نگاری)، تحقیق وتنقید (اور ساتھ ہی تخلیقی تدریس) ان کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اردو اور انگریزی میں یکساں قدرت اور روانی کے ساتھ۔ غیر تدریسی امور میں بھی انھوں نے غیر معمولی دلچسپی لی۔ ان کی تحریر وتقریر دونوں مؤثر اور دلکش ہیں۔ ان کے جمالیاتی وجدان کا اعتراف کیا جا چکا ہے۔ قدرت نے انھیں ذکی الحس بنایا ہے۔ فطرت کے حسن کی وہ دلدادہ ہیں۔ زبان کی لطافتوں اور باریکیوں نے ان کی تحریر کو شعریت، روانی اور صوتی حسن سے مالا مال کر دیا ہے فارسی غزل اور اردو قصیدہ کی طرف ان کا التفات ان کی حالیہ تحریروں سے مترشح ہے۔

انگریزی اور اردو ادب کے مطالعے اور تنقید کے ماسوا انہوں نے انتہائی مؤثر انداز سے اصلاح معاشرہ کی طرف بھی توجہ کی ہے۔ ''قومی آواز'' اور ''ہمارا سماج'' میں شائع شدہ ان کے مضامین ''اصلاح معاشرہ کی ایک لازمی جہت'' اور ''تہذیب کی دیوار منہدم'' اہمیت کے حامل ہیں انسانی ہمدردی اور دردمندی سے لبریز۔ انھوں نے معاشرے کی دُکھتی رگ پر انگلی رکھی ہے۔ آفت رسیدہ ومردم گزیدہ عورتوں کے درد کا مداوا کرنے کے لیے صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ ان کی آواز کی تائید سب صاحبان شعور پر واجب ہے۔

نجمہ محمود کے نگارشات سے ان کے وسیع مطالعہ کے ثبوت ملتے ہیں۔ انگریزی ادب پر عبور سے عام ذوق ادب پر نکھار آ گیا ہے۔ ان کے اکتسابات فقط ان کے مطالعہ پر محمول نہیں۔ انھیں قدرت کی طرف سے ادب کا ذوق ودیعت ہوا ہے۔ زبان وبیان کے لطائف ونکات ان کی رگ جاں میں پیوست ہیں۔ حسن وجمال کی جو کشش وہ محسوس کرتی ہیں وہ ان کے اسلوب کی رعنائی اور

فکر کی زیبائی سے آشکار ہے۔ ان کی تحریروں میں سراسر آمد ہے۔ حسی نزاکت اور اسلوب کی لطافت کے ساتھ وہ ایک آہنی عزم رکھتی ہیں انھوں نے اپنی ذات کی حفاظت کی ہے، عزت نفس کی حفاظت کی ہے...... وہ موضوع میں ڈوب کر لکھتی ہیں آجکل وہ اپنی خودنوشت کے مشکل مراحل کو سرکرنے میں منہمک ہیں ...... نجمہ محمود کا نشان امتیاز ادب کی تخلیق اور قدرشناسی ہے جس کے لیے قدرت نے ان کا انتخاب کیا ہے۔

وہ خدمتِ خلق کو ادیب کا فرض گردانتی ہیں اور عملی طور سے اس میں عموماً مصروف رہتی ہیں (غیر محسوس طریقہ سے)۔ حس کی نزاکت، جمال کا ادراک اور تخیل کی پرواز جسے ودیعت ہوئی ہو اسے اور کیا درکار ہوگا۔

۲۹؍اکتوبر ۲۰۰۸ء

○

عارف حسین جونپوری

نجمہ محمود کا تخلیقی تنوع

عظیم شاعر اور مفکر علامہ اقبال نے کہا تھا۔

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں

اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہا۔

مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلہ سے ٹوٹا شرار افلاطوں

اقبال تاریخ انسانی کے بتدریج ارتقاء کے ساتھ ہی انسانی نفسیات کے رمز شناس بھی تھے۔ وہ عورت اور مرد کی باہمی یگانگت سے مزین اس رنگا رنگ دنیا پر بھرپور اور گہری نظر رکھتے تھے۔ اقبال کے عہد میں عورت ''مکالمات فلاطوں'' کے مماثل اپنے افکار تازہ کی نمود کر چکی تھی۔ اس کی ایک روشن مثال ورجینیا وولف کی ہے۔ جس کے افکار اقبال کے عہد میں شہرت پا چکے تھے اور جس کی تحریریں ادب اور سماج میں ایک اعتبار حاصل کر چکی تھیں۔ اس کے علاوہ اگر ہندوستان پر نظر ڈالیں تو میرا بائی، زیب النساء، جہاں آرا، نور جہاں جیسی عورتوں نے اپنی فہم و فراست اور علم و فضل کے جوہر دکھائے تھے۔ بیگم حضرت محل اور رانی لکشمی بائی نے جرأت و ہمت اور شجاعت کے جوہر دکھادئے تھے۔ پھر بھی علامہ اقبال کے درج بالا اشعار سے عورت کی کسمپری کی حالت کی عکاسی ہوتی ہے۔ ایسا نہیں کہ اقبال صنف نسواں کی ان شخصیتوں کی فتوحات سے ناواقف تھے مگر وہ ہندوستانی تہذیب کے پروردہ تھے جہاں عورت کا عمومی دائرۂ کار گھر کی چہار دیواری تھا اور اسے مکمل طور پر سوچنے سمجھنے اور لائحۂ عمل طے کرنے کی آزادی نصیب نہیں تھی۔

اس صنف لطیف کو نفسیاتی طور پر اتنا کمزور کردیا گیا کہ انگریزی میں Femine (کمزور) سے Feminine، ہندی میں 'ابلا' اور اردو میں صنف نازک سے تعبیر کیا گیا، یہی نہیں ''نصف بہتر''، 'ارد ھانگنی' اور 'Better half' جیسے لفظوں سے اس کے وجود کے مکمل ہونے سے ایک طرح سے انکار کیا گیا۔

بہر کیف اقبال اسے تصویر کائنات میں رنگ آمیزی کے لیے ضروری سمجھتے رہے۔ یہ رنگ ایک زمانہ تک جامد رہا مگر جب جب مواقع ملے تو یہ متحرک بھی ہوا۔

ہندوستان میں 1857ء کا انقلاب بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ اسی دور میں انگریزی حکومت کی جڑیں مستحکم ہوئیں اور انگریزی کی تعلیم عام ہوئی۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد پڑی اور ایک بہت بڑا تعلیمی اُفق روشن ہوا۔ عام گھرانوں کی نہ سہی مگر مقتدر گھرانے اپنی لڑکیوں کو بھی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کے عازم ہوئے۔

پروفیسر نجمہ محمود (وطن ملیح آباد، لکھنؤ) اپنے والدین جناب محمود حسن خاں اور رضیہ بیگم اور بڑے بھائی پروفیسر مقبول حسن خاں کی روشن خیالی اور علم دوستی کے باعث کرامت حسین مسلم گرلز کالج میں داخل ہوگئیں اور اس طرح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے، پی ایچ ڈی (انگریزی) کی اسناد حاصل کرکے وہیں 34 سال تک شعبۂ انگریزی میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے کر ریڈر، پروفیسر کے مقامات کی مہم سر کرکے ریٹائر ہوگئیں۔

نجمہ نے اپنی اس پوری زندگی، جو گھر کی چہار دیواری سے کرامت حسین کالج اور مسلم یونیورسٹی کے سفر پر مشتمل ہے، صرف 'صبح کو جوں توں شام کیا' کی طرح نہیں گذاری بلکہ انھوں نے عام انسانی زندگی کے مسائل، صنف نسواں کے مسائل، اردو، انگریزی، فارسی، عربی، کے بہترین ادیبوں اور شاعروں کی نگارشات کے ساتھ ہی ہندی شعرا اور فلسفیوں کے افکار و رموز پر غور و فکر کرنے میں گزاری۔ انھوں نے خانگی زندگی میں بھی اپنی فہم و فراست کے جوہر دکھائے اور تین بچوں کو پال پوس کر اعلیٰ تعلیم یافتہ بنا کر اچھے مقامات پر پہنچا دیا اور اب پھر تنہا ہو کر ادبی، علمی کاموں میں مصروف ہوگئیں کیونکہ تنہائی سوچنے اور فکر کرنے کا بہترین وقفہ ہوتا ہے۔

پروفیسر نجمہ محمود ایک دانشور، افسانہ نگار، شاعر، محقق، ناقد کی حیثیت سے دنیائے ادب میں

اہم حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ انگریزی ادب کی استاد رہی ہیں اس لیے انگریزی میں ان کی دو کتابیں معرض وجود میں آئیں۔

Virginia Woolf's Concept of اور "From the Circle to the Centre" "Perfect man - An exploration in Comparative Literature" انگریزی میں آخرالذکر کتاب اردو دنیا کے لیے اس لیے بھی اہم ہے کہ اس میں مولانا روم سے لے کر اقبال تک کے انسان کامل اور خودی کے تصور کو ورجینیا وولف میں تلاش کیا گیا ہے۔ اس سے مصنفہ کی اردو ادب کے ساتھ ہی فارسی ادب اور صوفی ازم پر گہری نظر اور واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ دور حاضر کی مشہور ادیبہ قرۃ العین حیدر کے یہاں ''شعور کی رو'' کی ٹیکنیک کا استعمال ہوا ہے۔ اس ترکیب پر مرحومہ کے انتقال کے بعد بہت چرچا ہوا۔ نجمہ محمود کی کتاب سے "Stream of Consiousness" کا صحیح مفہوم واضح ہو جاتا ہے کیونکہ یہی صفت ورجینیا وولف کے یہاں بھی پائی جاتی ہے۔ بہرحال یہ مسئلہ ایک الگ مضمون کا متقاضی ہے۔

نجمہ محمود بحیثیت شاعرہ: نجمہ محمود کی مقفّٰی شاعری کا سرمایہ بہت کم ہے۔ انہوں نے آزاد نظم اور نثری نظم کو زیادہ اہمیت دی تا کہ ان کے افکار کی ترسیل میں کوئی قید اور بندش نہ ہو۔ انہوں نے پہلا شعر ۱۰ سال کی عمر میں کہا۔

چاند کے گرد حسین ہالہ ہے اور ستارے بھی ہیں کتنے روشن چند متفرق اشعار دیکھئے:

منظر بہت عجیب تھا ہم کھو کے رہ گئے　　دوری پہ آبشار تھا ہم رو کے رہ گئے

یاد اب کچھ بھی نہیں ہے میرے ہمدم مرے دوست
من و تو ایک ہوئے معجزہ ایسا دیکھا

اب اس مختصر غزل کی منظر نگاری ملاحظہ فرمائیں:

وجود کے درخت کی گھنیری پتیوں کے درمیاں ہوا بھی
فضاؤں کی عمیق وسعتوں کو چیرتی ہوئی صدا بھی
سطح پر پانیوں کی دور تک نفوس تیرتے رہے
لہر لہر مہین ٹہنیوں کی پیچاں الجھنوں کی التجا بھی
خموشیوں کی گونج ہر چہار سمت یوں بکھر گئی
کہ ہر طرف کسی کے نام کی حسین وشیریں اک ندا بھی

ذیل کے اشعار میں جذبات کی بے بسی بھی ہے اور ہنگامہ خیزی بھی۔

روبرو تھے وہ ہمارے لیکن ان سے اک بات نہ ہونے پائی
دل میں طوفان تھا تلاطم تھا پھر بھی برسات نہ ہونے پائی
یہ ہماری گھٹن معاذ اللہ شرح حالات نہ ہونے پائی
اندر آتش فشاں نہاں تھا مگر سوگئے رات نہ ہونے پائی
اندروں میں تھا سمایا کوئی پر ملاقات نہ ہونے پائی

ان کی غزلوں کے اشعار سے ایک بات تو ظاہر ہے کہ انہیں قدرت کے مظاہر سے عشق ہے اور اس میں عشق کی وہ زیریں لہر بھی موجود ہے جس سے زندگی اپنے معراج پر پہنچتی ہے نیز شعرو ادب کے بند دریچے شاعر پر وا ہوتے ہیں۔ نجمہ نے پابند شاعری سے زیادہ آزاد نظمیں لکھی ہیں۔

ان کی ان نظموں میں ''مدرگا ڈیس''، ''شجر سایہ دار''، ''ریگستان میں جھیل''، گہرائیوں کا خوف''، ایک قصہ کہنہ کی تجدید'' اہم ہیں۔ ان کے یہاں ایک تجسس اور بے قراری ہے فطرت کے رازہائے سربستہ کو منکشف کرنے کے لیے۔

کروں معلوم آخر بادلوں میں شورشیں کیوں ہیں
کہ یہ کالی گھٹائیں یوں برستی جھومتی کیوں ہیں
فضا میں کون آخر جل ترنگ آکر بجاتا ہے
کہ گاتی جھومتی ہیں ساری شاخیں کیوں درختوں کی
ہوائیں گنگنا کر کیوں مجھے مسحور کرتی ہیں

وہی استفہامیہ فکر جو غالب کے یہاں موجود ہے ''ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟'' جس کی بدولت غالب کو آج تک ملک ادب میں انفرادیت حاصل ہے۔ نجمہ کے اندروں میں کہیں سے یہ آواز آتی ہے۔

دل کے اندر یہ رازداری سے
کوئی چپکے سے مجھ سے کہتا ہے
جنم دو اک نئی کہانی کو
شعر کہہ ڈالو کوئی نظم لکھو

اور اس طرح ان کا قلم رواں ہو جاتا ہے کہانی لکھنے کے لیے، شعر کہنے کے لیے، یہ اندرون کی آواز شعری اظہاریہ کے لیے بہت اہم ہوتی ہے......

میرے اندر ہوائیں چلتی ہیں
دھیمی دھیمی پھوار گرتی ہے
مجھ میں دریا ہیں موجزن ہر سو
لہریں اٹھتی ہیں ڈوب جاتی ہے
میرے اندر ہوائیں چلتی ہیں

''مدر گاڈیس'' ان کی مشہور نظم ہے جو ماہنامہ ''شاعر'' اور ماہنامہ ''بزم سہارا'' میں شائع ہو چکی ہے۔ ہم اس کے اقتباسات نہ دے کر اس پر پروفیسر وحید اختر کی رائے پیش کر رہے ہیں:

> ''مدر گاڈیس'' جو ان کی سب سے اچھی اور بھرپور نظم ہے اور موضوع کے لحاظ سے اردو کے ادبی سرمائے میں بالکل نئی اور منفرد ہے۔ بھی مذاہب کا خدا جنس سے بالاتر ہے لیکن اس کے اوصاف جلال و جمال کو جس طرح مذہبی اصطلاحات میں بیان کیا جاتا ہے اس کی بنا پر وہ صنف قوی کے اپنے تصور کا اظلال (Projection) نظر آتا ہے۔ نجمہ کی رومانیت انہیں اس دور اولیں میں لے جاتی ہے جب عالم میں صرف ایک مذہب تھا اور اس کی ایک ہی دیوی تھی (دیوی ماں)۔ جو محبت و تخلیق، جلال و جمال کا مظہر تھی۔ نجمہ اس دیوی کو پھر وہ جگہ دلانا چاہتی ہے جو مرد خداؤں نے اس سے چھین لی ہے۔ یہ کسی مذہبی عقیدے کا اظہار یا انکار نہیں شاعرہ کے وجودی تجربے کا اظہار ہے۔ یہ اظہار معتبر ہے اس لیے اچھا اور سچا ہے''۔

شاعری کے متعلق نجمہ کی رائے ہے کہ شاعری نثر میں بھی ہو سکتی ہے۔ خلیل جبران ان کا آئیڈیل ہے۔ ان کی تحریروں کو وہ شاعری کی مثل مانتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ''جبران کی نثر شاعری ہے۔ انسان کی کامل ترین

گفتگو۔ شاعری کے لیے وزن، بحر، قافیہ لازمی نہیں، تخیل اور خونِ جگر کی فراوانی کافی ہے۔ بودلیر، خلیل جبران اور ورجینیا وولف نے نثر میں شاعری کی۔ حجاب امتیاز علی، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر اور جمیلہ ہاشمی نے نثر میں شاعری کی۔"

اس بارے میں راقم الحروف کی یہ رائے ہے کہ نجمہ نے جو نام گنائے ہیں ان میں ابوالکلام آزاد اور مہدی افادی چھوٹ گئے ہیں۔ ان دونوں حضرات نے ایسی نثر لکھی ہے جو بقول حسرت موہانی:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظمِ حسرت میں کچھ مزہ نہ رہا

پروفیسر نجمہ محمود کا ایک اہم کارنامہ "سید حامد - کہ گم اس میں ہیں آفاق" ہے۔ یہ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور جامعہ ہمدرد کے موجودہ چانسلر، علی گڑھ کے دوسرے سرسید اور معروف ادیب، ناقد اور شاعر اور حکومتِ ہند کے ممتاز عہدوں پر فائز رہنے والے معتبر شخص کی سوانح ہے۔ اس میں نجمہ محمود نے سید حامد کی سوانح کے وہ باب بھی وا کر دیے ہیں جو اب تک کم سننے اور دیکھنے میں آئے ہیں جیسے سید حامد بحیثیت شاعر، بحیثیت ناقد۔ سید حامد کی یہ تحریریں انہیں صفِ شعرا اور صفِ ناقدین میں ایک معتبر حیثیت عطا کرتی ہیں۔ ہر باب کا عنوان اقبال کے ایک مصرعہ سے شروع ہوتا ہے۔ نثر کی دلکشی روح کی تازگی کا باعث ہوتی ہے۔ اس کتاب کی پذیرائی معتبر اور مخلص علمی اور ادبی حلقوں میں بہت ہوئی ہے۔ اس کی اشاعت پاکستان میں بھی ہوئی۔ بقول جمیل الدین عالی (جنھوں نے کتاب وہاں دوبارہ شائع کی)

"بھئی میں آپ کی کتاب پر کیا کہوں (لکھنے کا تو اہل نہیں) آپ کے بہت ہی خوبصورت تجزیے، فقرے، پوری انشاء آفاق کی وسعتوں کو شرما رہے ہیں۔ میں نے آپ کی دوسری کتابوں کے تذکرے سنے۔ تاثر بہت ہی بارعب اور موثر ہے۔"

نجمہ محمود کے متعلق مشاہیر اردو کی گرانقدر آرا بہت ہیں، جنھیں طوالت کے خوف سے یہاں

پیش نہیں کیا جارہا ہے۔ ایک تاریخی بات یہ ہے کہ وہ رضیہ سجاد ظہیر کی شاگردرہ چکی ہیں۔ سجاد ظہیر نے ان کی اوائل عمر کی کہانی سن کر ان کے ایک بڑا ادیب بننے کی بشارت دے دی تھی، جو سچ ہو کر رہی۔ آج نجمہ محمود نہ صرف ایک منفرد افسانہ نگار ہیں بلکہ ایک شاعر، ناقد اور محقق کی حیثیت سے اردو ادب میں اپنا ایک الگ مقام بنا چکی ہیں۔ انہوں نے ناول نگاری کی دنیا کو ''جنگل کی آواز'' جیسا مختصر ترین ناول دیا جو ایک انوکھا تجربہ ہے (لفظ ''ناول'' کے لغوی معنی کے عین مطابق) اس کے علاوہ انہوں نے افسانہ کے میدان میں بھی تجربہ کیا ہے حجاب امتیاز علی کی طرز میں لکھے گئے طرحی افسانے اپنی مثال آپ ہیں۔

نجمہ محمود نے بہت زیادہ لکھا ہے مگر شائع کم کروایا۔ بہت بہت دنوں بعد کوئی تخلیق منظر عام پر آئی اس لیے اکثر یہ دھوکا ہوتا ہے کہ وہ کم نویس ہیں، جلد ہی تین جلدوں پر مشتمل ان کی کلیات منظر عام پر آنے والی ہے جو ادبی حلقوں میں ان کو عام طور پر مقبول بنائے گی (خواص میں تو وہ مقبول ہیں ہی)

ممتاز ناقد وہاب اشرفی کا خیال ہے:

> ''ڈاکٹر نجمہ محمود کے علمی و ادبی کارناموں سے میری عدم واقفیت مجھے بے حد شرمندہ کررہی ہے۔ دراصل زیادہ تر وہی لوگ پڑھے جاتے ہیں جو اپنی صلاحیتوں سے زیادہ تعلقات پر بھروسہ کرتے ہیں اور ایسی روش میں نت نئے پہلو پیدا کرتے ہیں۔ ایسے میں بے نیاز ادیب و شاعر جو قابل لحاظ بھی ہیں وہ قعر گمنامی میں گم ہو جاتے ہیں۔ محترمہ نجمہ محمود نے گراں قدر ادبی کام انجام دیے۔ انھوں نے اچھی خاصی تعداد میں افسانے تخلیق کیے جن سے نہ صرف ان کے موضوعات کی خبر ملتی ہے بلکہ انفرادی اسلوب اور فکر کی بھی۔ حجاب امتیاز علی کی روش میں نیا آہنگ کیسے پیدا کیا جاسکتا ہے وہ ان کے بعض افسانوں سے مترشح ہے''۔

آخر میں بقول شکیل الرحمٰن ''نجمہ محمود کی تحریروں کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک پرخلوص شخصیت کی تصویر ابھرتی ہے، علم دوست ہیں، مطالعہ وسیع ہے، انگریزی ادب سے گہری دلچسپی کا اندازہ اس

بات سے ہوتا ہے کہ انھوں نے ورجینیا وولف کو اپنے مطالعے کا خاص موضوع بنایا۔ نجمہ محمود نے بہت لکھا ہے کہ افسانے لکھے، خاکے لکھے، تنقیدی مضامین تحریر کیے، نظمیں تخلیق کیں، جو بھی لکھا ادبی اقدار کی اہمیت اور ان کی قدر و قیمت کو سمجھتے ہوئے لکھا۔"

اس طرح متعدد آرا شامل مضمون کی جا سکتی ہیں، لیکن وہی طوالت کا خوف۔ اب جبکہ ان کی تخلیقات عنقریب شائع ہونے ہی والی ہیں ان کے کارناموں اور ان کے ادبی رویوں کے متعلق بھر پور بات چیت ہوگی۔ موجودہ ادبی اُفق پر ان کا وجود "شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی" کے مثل روشن ہے۔

(مطبوعہ بزم سہارا اگست ۲۰۰۹)

○

پروفیسر صغریٰ مہدی

نجمہ محمود: خواتین کے حقوق کی علمبردار

نجمہ محمود سے میری واقفیت محترمہ امت الرحمٰن محسنی اور اپنی بہن سیدہ فرحت کے توسط سے ہوئی تھی۔ ویسے ان کے مضامین، شاعری اور افسانے پڑھتی رہتی تھی۔ میری دوست عفت محسنی بھی ان کی کولیگ تھیں وہ بھی اکثر ذکر کرتی رہتی تھیں۔

سیدہ فرحت بہت اچھی شاعرہ تھیں انھیں نے نجمہ محمود کے تعاون سے خواتین کی ایک ادبی انجمن بہ نام ''بزم ادب'' قائم کی تھی۔ میں کبھی ان سے ملنے جاتی تو ان جلسوں میں بھی شرکت کرتی۔ اس میں خواتین اپنی تخلیقات پیش کرتیں۔ نجمہ محمود، امت الرحمٰن محسنی، لیلیٰ امام، مہ لقا اعظمی وغیرہ ابتدا میں اس کی سرگرم ممبران تھیں۔ سماجی، ادبی اور کبھی کبھی مذہبی مسائل پر گفتگو ہوتی۔

نجمہ ویمنس کالج اور شعبۂ انگریزی میں درس و تدریس کرتی تھیں۔ انگریزی کے علاوہ ان کو اردو ادب پر بھی عبور حاصل ہے۔ ان کا تعلق پڑھے لکھے خاندان سے ہے لڑکپن سے ہی سماج میں عورت کی کمتر حیثیت اور اس کے ساتھ روا زیادتیاں ان کو مضطرب کر دیتی تھیں۔ ہوش سنبھالا تو انھوں نے اپنی تحریر و تقریر میں اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ ہمارے سماج میں عورتیں اپنی موجودہ حالت پر قانع ہیں...... کچھ مردوں کی برابری کرکے، ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے پر خوش ہیں انھیں دوسری عورتوں سے کیا مطلب۔

نجمہ نے علی گڑھ کے ایک شاعر سے شادی کی (جب وہ زیادہ مشہور بھی نہیں تھے)۔ ان کا نام ان سے وابستہ رہا۔ نجمہ شادی کی گاڑی گھسیٹتی رہیں۔ بہت جانفشانی سے بچوں کو پالا۔ پیروں پر کھڑا کیا اور پھر موصوف سے خلع لے لیا۔ گو کہ اسلام نے خلع کا حق عورتوں کو دے کر ان کے لیے آسانی پیدا کی ہے کہ وہ مرد سے اپنا پیچھا چھڑا لے بجائے اپنی زندگی ضیق میں کرنے کے۔ ہمارے ملک میں خلع لینا کس قدر جوکھوں کا کام ہے مگر دلیر نجمہ نے یہ کر دکھایا۔ اس سے عورتوں کو بہت حوصلہ ملا۔

نجمہ اب یونیورسٹی سے سبکدوش ہوگئی ہیں اور تصنیف و تالیف میں مصروف ہیں۔گا ہے گا ہے بچوں کے پاس بھی ہو آتی ہیں۔ورنہ اکیلے ہی عورت کے آزاد وجود کو ثابت کرنے کے لیے زندگی گذار رہی ہیں۔بہت مطمئن اور خوش ہیں۔

نجمہ جن حالات سے گذری ہیں اور جو خلش ان کے دل میں ہے اس نے انہیں مضطرب کیا ہے اس اضطراب کا عکس چہرے اور گفتار کے اسلوب میں جھلکنا عین فطری ہے۔.....اپنی عزت نفس، اپنی ذات کو انہوں نے شکست و ریخت سے بچایا ہے۔اس عمل میں وہ لہولہان بھی ہوئی ہیں۔

نجمہ اردو اور انگریزی کی کئی کتابوں کی مصنفہ ہیں۔انگریزی میں ان کی تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''دائرے سے مرکز تک'' اور ایک تحقیق پر مبنی کتاب بہ عنوان ''ورجینا وولف کی تحریروں میں انسان کامل کا تصور'' شائع ہوئی ہیں۔اردو میں افسانوں کا مجموعہ ''پانی اور چٹان'' کچھ عرصہ پہلے شائع ہوا۔سیدھی سادی دل میں اتر جانے والی کہانیاں جن کا موضوع انسانی نفسیات اور سماج میں عورت کا کمتر درجہ ہے،جن میں قابل ذکر ہیں ''آئینہ کی تصویر''،''لہر لہر سمندر''،''غار'' اور وجود کے سوتے سے جدا''.....حال ہی میں ان کی کتاب ''سید حامد کہ گم اُس میں ہیں آفاق'' منظر عام پر آئی ہے جو عصر حاضر کے دانشور اور ماہر تعلیمات سید حامد کی سوانح ہے۔ہر باب کا عنوان اقبال کا کوئی مصرعہ ہے۔یہ کتاب بہت محنت سے لکھی گئی ہے۔مصنف کو جب اپنے موضوع سے گہری دلچسپی ہو تو وہ جی جان سے اس پر کام کرتا ہے۔اردو حلقوں میں لوگوں نے اسے بہت پسند کیا ہے۔

میرا خیال تھا کہ نجمہ کسی عورت پر کام کرتیں مگر انھوں نے سید حامد پر کام کیا اس کی کوئی وجہ رہی ہوگی لگتا ہے انھوں نے سید حامد کی شخصیت اور رویّوں میں خواتین کے لیے ہمدردی پائی ہوگی اور ان میں 'میل شاونزم' نہیں ہوگا جب ہی تو انھوں نے سید حامد کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

ہندوستان میں خواتین کے حقوق کی بازیابی کی جدوجہد کی جب تاریخ لکھی جائے گی تو اس میں نجمہ محمود کا نام ضرور ہوگا۔

(مطبوعہ ''شاعر'' ۲۰۰۹ء)

○

شہناز کنول غازی

وہ اپنی مشعلِ احساس لے کے جب نکلے

(چینی فلسفی کنفیوشس نے کہا ہے ''جو چیز بیدار ہے وہ امن وسکون بخشتی ہے۔ وہ زندگی کے حقائق کو جانتی ہے۔ فرض اور حق کے فلسفے سے آگاہی ہوتی ہے'' اسے کسوٹی اصول مان لیں تو پروفیسر نجمہ محمود کی تحریریں بیداری کا پیغام دیتی ہیں۔ فکر کی گہرائی اور تخیل کی برتری ان کی تحریروں کا مزاج بناتے ہیں۔ انسانی احساسات وجذبات کی باریکیاں اور خیال کی نیرنگیاں پستی سے بلندی کی طرف پرواز کا حکم دیتی لگتی ہیں۔ فطرت سے انہیں غیر معمولی لگاؤ ہے اور اسلام دین فطرت ہے یعنی انسان کا خالق کائنات پر مکمل اعتماد اور یقین کے ساتھ کائنات کی ہر چیز پر غور کرنا، اس سے محبت کرنا، روحانی ربط کے ساتھ انسانی جذبوں کو سمجھنا اور اس طرح مقصد زندگی کو جاننا۔ کیا یہ سارے مناظر، یہ سمندر، یہ دریا، چاند، ستارے، بادل بجلی، زمین، مٹی، ریت، ببول، نیم، برگد، گل مہر، صنوبر، ہوائیں اور خوشبو بے معنی ہیں؟ دراصل ان چیزوں پر غور کرنا انسان کو عقلی معراج عطا کرتا ہے۔ ان کے ذریعہ انسان خود اپنے آپ کو سمجھتا ہے۔ ان عناصر اربعہ پر غور وفکر کی تلقین قرآن کریم میں بار بار ہے نجمہ اس تلقین کے ذریعہ انسانی مزاج کی نباض بن کر کہانیاں کہتی ہیں۔ نجمہ اپنی تحریروں میں واضح طور پر انسان کو فطرت کے قریب لانا چاہتی ہیں۔

خالق کائنات نے یہاں کی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کو ایسا مکمل اور حسین بنایا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے اور عملی انسان کا ذہن تدبر کرنے پر مائل ہوجاتا ہے۔ اور عورت تو اللہ تعالیٰ کی بہترین تخلیق ہے۔ نجمہ کی تحریروں میں اسی تدبر اور ذہن رسا کی رونق آتی ہے۔ وہ ایسے خواب بنتی ہیں جہاں خیر خواہی اور بے غرضی عام ہو) وہ اپنی کہانیوں کے مجموعے 'پانی اور چٹان' کے ''تعارف'' میں لکھتی ہیں۔

''اب میں ماحول کو بدلنے کے لیے، زندگی کو بہتر بنانے کے لیے کہانیاں لکھوں گی، زندگی کو جینے کے قابل بناؤں گی انقلاب لاؤں گی، بے حد ولولہ، عزم وحوصلہ تھا۔ اُدھر زوال پذیر معاشرہ،

قصبہ کا ماحول ، جہالت، تنگ نظری غرور ،ظلم، عیش وعشرت اور کھنڈرات اور ادھر لاوے۔ اندھیرے جب تک دور نہ ہوں گے کہانیاں لکھتی رہوں گی زندگی کو اوپر اٹھانے کی میری کوشش جاری رہے گی...... یہی ہے میری کہانیوں کا بنیادی محرک۔ یہ سچ کی علمبردار ہیں میری کہانیوں میں ''رومانیت کی زیریں لہریں'' ہیں۔ یہ آفاقی عشق سے لبریز ہیں۔ ''لہر لہر سمندر'' ،''آئینہ کی تصویر''،''غار''،''خالی جھولی''،''بوڑھا برگد''،''وجود کے سوتے سے جدا'' میں انسان کی فطرت سے،خدا سے گہری محبت پنہاں ہے۔'' (تعارف'' ''پانی اور چٹان'')

''اردو ناول کی تاریخ اور تنقید'' میں علی عباس حسینی لکھتے ہیں۔ ''عہد حاضر میں تنقیدی نقطۂ نگاہ کے لحاظ سے دو اسکول ہو گئے ہیں۔ ایک کا نظریہ یہ ہے کہ فن برائے فن دوسرے کا کہنا ہے فن برائے حیات۔ اول الذکر کا مقولہ یہ ہے کہ ضروری نہیں کہ ہر چیز میں کوئی افادی پہلو بھی ہو دوسرے اسکول کا خیال ہے کہ زندگی میں انسانی عمل کا کوئی مقصد ہوتا ہے''۔ ایک طرف حوادث زمانہ سے فرار تھا دوسری طرف زندگی کی حقیقتوں کو ساری بدصورتیوں کے ساتھ اجاگر کرنا گویا فرض منصبی قرار پایا۔ دونوں طرف انتہا پسندی تھی۔ لیکن ایک نئی جہت کی طرف ان قلم کاروں نے قدم بڑھائے جو درمیانی راہ کو پسند کرتے تھے۔ یعنی فطرت انسانی کے عین مطابق۔ نجمہ محمود کا تعلق اسی نئی جہت کے قلم کاروں سے ہے اسی لیے وہ کہتی ہیں۔

> ''اپنی ان ناچیز تخلیقات کے سلسلہ میں یہ وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ ان کے پیچھے فقط خلوص ہے یہ حق کی تلاش ہیں، خود اپنی تلاش ہیں۔ یہ سچی ہیں۔ صحیح معنوں میں ترقی پسند اور جدید ہیں کیوں کہ ان کا رشتہ قدیم سے بہت گہرا ہے ان میں اساطیر بھی ہیں، مذہب بھی ، اخلاق بھی تصوف بھی، فلسفہ بھی اور ماقبل تاریخ بھی۔ جب دلوں میں کشادگی پیدا ہوگی، ایمان جاگے گا تو میری روح کی آواز ان تک ضرور پہونچے گی''۔

نجمہ محمود کی تحریروں میں گہری مذہبیت اور روحانی وسعت نظر آتی ہے ان کے افسانے غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں اور کچھ سوال بھی اٹھاتے ہیں۔ جب وہ انسانی فطرت او معاشرے کی بے حسی پر بات کرتی ہیں تو دانش وروں کو لمحہ فکر یہ عطا کرتی ہیں ان کا افسانہ وجود کے سوتے سے جدا'' اور میراث اسی انداز کے افسانے ہیں۔

نجمہ کی کہانیوں میں ان کا پیغام محبت بین السطور نظر آتا ہے، ان کے درد مند دل کا عکس جھلکتا ہے، اور وہ اپنے فن میں ڈوب کر یا جا سراغ زندگی کو بڑی جانفشانی سے قاری کے دل و دماغ میں جاری وساری کرتی ہیں۔ انسانی آرزوؤں کو ہمکنا سکھاتی ہیں۔) کہانی ''غار'' میں وہ لکھتی ہیں۔

> ''سب خوش رہیں، سب صحت مند رہیں۔ ہر شخص یہ محسوس کرے کہ اچھائی کیا ہے کوئی دکھی نہ رہے۔ وجود مطلق، ایک تجلی، اک نور، اسے ورڈز ورتھ کی ایک نظم یاد آئی جس میں ایک غار کا ذکر ہے جس میں سے ایک چشمہ پھوٹ رہا ہے۔ شعور کا چشمہ، شخصیت کا چشمہ، ہم آہنگ شخصیت اسی لمحہ اسے غارِ حرا کی یاد آئی اور گوئٹے کی حضورؐ پر لکھی ہوئی ایک نظم بھی یاد آئی۔
> آسمانی صحائف یہی کہتے ہیں کہ خود کو پہچان کر اپنے آپ سے اوپر اٹھو۔
> سارے مظاہر سے ہمارا رشتہ ہے۔ وہ نشانیاں کہاں گئیں جن کا ذکر آسمانی صحائف میں ہوا ہے...... ہر طرف ریزہ ریزہ انسان......
> آہنی گیٹ کے پاس کھڑے گل چینی کے درخت پر ایک مینا آن بیٹھی۔
> صبح کے اجالے پھیل رہے تھے''۔

دراصل تحریر میں اس کے خالق کی شخصیت اور آفاقیت کا ادراک نہ ملے تو وہ کسی اندھیرے کمرے میں جھانکنے جیسا ہے۔ حقیقت آشنا، فطرت سے قریب روحیں بلند پرواز ہوتی ہیں، درد آشنا ہوتی ہیں، خیر خواہ، وسیع القلب اور مرہم ساز بھی اور فنکار اس دنیا میں اسی لیے بھیجے جاتے ہیں۔

ورجینیا وولف نجمہ محمود کی پسندیدہ قلمکار ہیں۔ ان کے سلسلہ میں نجمہ کا رویہ مادرانہ ہے یعنی وہ ان کی تحریروں میں درد محبت کی لہریں دیکھتی ہیں۔ نجمہ جس سے بھی محبت کرتی ہیں مادرانہ شفقتیں زبرزبر نظر آتی ہیں جو ہر ماں اپنے بچے کے ذہن، روح اور دل میں پہنچاتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ''آج کا انسان اپنی ربوبیت کھو بیٹھا ہے مادیت کے زیر اثر اپنی ذات کے وجدانی پہلو سے صرف نظر کر لیا ہے'') اپنی کہانی ''چنار کے سائے تلے'' میں وہ لکھتی ہیں۔

> ''چشم بینا کو وا رکھنا چاہیے'' ورجینیا وولف نے کہا تھا میں ایک دائرہ ہوں دائرہ ثابت وسالم ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا ''تہذیب کی دیوار منہدم

ہورہی ہے''۔ کیا یہ ہماری، معاشرے کی بے حسی اور سفا کی نہیں؟ ہم صرف اپنے بارے میں سوچتے ہیں دوسرے کے اندروں میں اترنا ہم نے سیکھا ہی نہیں''۔

نجمہ محبتوں کی قدرداں ہیں وہ ایسے ہر لمحہ کو گرفت میں لے لیتی ہیں جیسے وہ لمحہ جب ان کی استاذ رضیہ سجاد ظہیر نے کہا ''نجمہ کی سادگی، معصومیت گھبراہٹ اور خلوص اس بات کے ضامن ہیں کہ وہ مستقبل میں بڑی ادیب ہوں گی) یا وہ لمحہ جب کرامت کالج میں ان کی پرنسپل...... نے عصمت چغتائی سے ان کا تعارف کراتے وقت کہا ''نجمہ سے ملو یہ ہمارے کالج کی (CREATIVE WRITER) ہیں''۔ نجمہ لکھتی ہیں ''میں اپنی اس عزت افزائی پر خوشی سے سرشار'' ویمنس کالج علی گڑھ کی پرنسپل ممتاز جہاں حیدر نے کسی سے کہا ''نجمہ میں (METTLE) ہے'' ان تحسین آمیز کلمات سے نجمہ کو روحانی خوشی ملتی ہے مگر تکبر کا شائبہ نہیں وہ، برگ ثمردار کی طرح ہیں۔ ''تعارف'' میں وہ لکھتی ہیں:

''اس مجموعہ کے ذریعہ اردو ادب کے سمندر میں اترنے کا کوئی ارادہ راقم الحروف کا نہیں ہے۔ اس کی تو بس یہی خواہش ہے کہ آپ اس کا مافی الضمیر سمجھیں، اس کے اندرونی محسوسات پر یقین کریں......اور موجودہ زوال پذیر معاشرے کو بدل ڈالیں''۔

انسان کا ہر عمل نفسیاتی، عمرانی، سماجی، شعوری ولاشعوری اصولوں کے تحت ہی ہوتا ہے۔ وہ احسن تقویم ہے اس لیے اس میں روحانی تدبر ضروری ہے ورنہ وہ فطرت سے کٹ جائے گا۔ دین فطرت قدم قدم پر اس کی روحانی اور وجدانی تربیت کرتا ہے کبھی شخصیات کی مثال سے کبھی مقام کے ذکر سے، کبھی واقعات کو پیش منظر بنا کر وہ کائنات کے سربستہ رازوں میں انسانی عروج کا نسخہ تلاش کرنے کی ہدایت کرتا ہے اسی لیے قرآن حکیم میں کہا گیا ہے ''اللہ تعالیٰ نے جس شخص کو، علم اور دانائی عطا کی گویا اسے بہت بڑی نعمت بخشی''۔ یہ اس روحانی اور وجدانی دانائی کی طرف اشارہ ہے، جو معلومات کو علم بناتی ہے، جستجو کو منزل کا اشارہ دیتی ہے اور وجدان کو عقل کا رہنما بنا کر کائنات میں جاری وساری کر دیتی ہے کوئی بھی فنکار اپنی تخلیق کو وجدان کے بغیر موثر نہیں بنا سکتا ہے دراصل

نیکی کی تعریف یہ ہے کہ اس سے معاشرے کو، انسان کو اقدار کو فائدہ پہنچے۔

نجمہ اپنی کہانیوں میں پرت در پرت داخلی کیفیات کو کھولتی ہیں۔ اور خارجی عوامل کے ذریعہ محسوسات کو جذبات سے جوڑتی چلی جاتی ہیں یعنی موضوع کہتا ہے کہ آگے کیا ہوگا اور مواد و اسلوب بتاتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا اور کیا ہونا چاہیے۔ نجمہ کا فن، ان کی تحریریں، مثبت عملی رجحان کا گہرا اثر لیے ہوئے ہیں اور یہی چیز متاثر کرتی ہے کہ زندگی کو فطرت کے مشاہدوں سے ایسی وابستگی ہے جو جینا سکھاتی ہے۔ مصنفہ کا فطرت سے ایسا ہی رابطہ ہے ان کی کہانی ''لہر لہر سمندر'' کی یہ سطور۔

''کھڑکی سے باہر گھاس کا ہرا سمندر موجزن تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ اس سمندر کی ایک لہر ہو اسے سکون کا احساس ہوا۔ فطرت دوست ہے ساتھی ہے، زخموں پر مرہم رکھتی ہے...... آسمان کی صاف شفاف نیلگوں وسعتوں میں اس کا پورا وجود کھو گیا۔ جو حُسن کے متلاشی ہیں وہ ان نشانیوں کی طرف کیوں نہیں دیکھتے، اس ارض وسما پر نظر کیوں نہیں کرتے؟...... اُن سب کے پس پردہ جو برتر شعور ہے اس کی جستجو کیوں نہیں کرتے فطرت حسین ہے اور انسان اس کا ایک جزو''

عنبر بہرائچی نے ''دوب'' میں لکھا ہے ''حقیقی دنیا میں تخلیقی فنکار فطرت کے حُسن میں کھو کر سکون کے نئے زاویے تلاش کرتا ہے ایسی حالت میں وہ فطرت کو اپنی ہی شخصیت کی علامت سمجھ کر اس کی اہمیت کا تعین کرتا ہے''۔

نجمہ محمود کی اکثر کہانیاں اس کی بہترین مثال ہیں خاص طور پر گُل مہر کے سائے تلے'' اور ''غار''۔

وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں انگریزی کی پروفیسر تھیں ان کا فنکار حجاب میں تھا۔ پھر انہوں نے اپنے اندر کے فن کار سے مفاہمت کی، دوستی کی اور فنکار اپنی جیت پر مسکرایا۔

......زبان عربی میں لفظ ''صبر'' محض برداشت کر لینے اور سہنے کے لیے نہیں ہے بلکہ 'صبر' کا مطلب ہے ثابت قدمی، استقامت، استقلال کے ساتھ مقصد کے لیے سرگرم رہنا۔ نجمہ کا اندر کا قلم کار اسی صبر کے ذریعہ منظر عام پر آیا۔ برنارڈ شا کا قول ہے ''جہاں خواہش قلبی اور فرض منصبی کی حدیں مل جائیں اسے خوش بختی کہتے ہیں'' اس لحاظ سے نجمہ خوش بخت ہیں۔ ان کا دردمند دل ہر اس مقام پر ٹھٹھک جاتا ہے جہاں وہ فطرت کو مجروح دیکھتی ہیں اور پھر ان کا درد یوں ظاہر ہوتا ہے۔

''اس کے چہرے پر اندرون میں اُمڈتے طوفان کا عکس تھا جس کو خاتون خانہ شدت سے

محسوس کر رہی تھیں...... ساکت، خاموش...... وہ جو اس لمحہ میں سوچ رہی تھی کہ آدم کی تنہائیوں کو دور کرنے کے لیے حوا کی پیدائش خود آدم کے وجود سے ہوئی تھی وہ آدم کے وجود ہی کا حصہ تھیں۔ وہ وجود جس میں 'نور محمدی' رکھا گیا تھا جس کا منبع وجود مطلق کی ذات تھی یہ سماج اس وجود کو اپنی اصل سے، اپنے سوتے سے جدا کیوں رہنے دیتا ہے۔ کیوں رفاقت حاصل نہیں ہونے دیتا''؟۔

(کہانی ''وجود کے سوتے سے جدا'' موضوع: عورت کی تنہائی، اس کے مسائل) اس کہانی کا موضوع بڑا سلگتا ہوا، جذباتی اور محسوسات کے اعتبار سے بڑا نازک ہے اس کہانی میں عورتوں کے سلسلے میں معاشرے کی بے حسی، بے خبری کا ماتم ہے تنہا عورت کی زندگی اس کی ذات کا ماتم بنی رہتی ہے نجمہ اس رویہ پر رنجیدہ ہیں۔ افسردہ ہیں)

نجمہ کی کہانی ''غار'' اسی خواہش، اسی معرفت، اسی مقصدیت، نیکی اور فرائض وحقوق کی بازیافت کا فارمولا پیش کرتی ہے۔ ''وجود کے سوتے سے جدا'' میں وہ جس المیہ پر افسردہ ہیں'' غار'' میں وہ اسی رویے کی اصلاح کا احساس دیتی ہیں۔ یہ کہانی قوت متخیلہ کی عمیق معنویت لیے ہوئے ہے جہاں وہ کہتی ہیں۔

> ''یہ جگہیں فقط خیالی نہیں حقیقت ہیں کتنی شاندار ہمالیہ کی برفیلی چوٹیاں علمی تحقیق کے لیے...... اس نے سوچا ان مقدس استھانوں سے ہمارا رشتہ ٹوٹ چکا...... انسان اپنی روح کی تلاش میں ہے جسے وہ کھو چکا ہے اپنی سالمیت کی تلاش میں ہے جو ریزہ ریزہ ہو چکی...... اسے محسوس ہوا کہ وہ معاشرے کی کمزور ترین ہستی ہے اس لیے کہ وہ حساس ہے کہ وہ خلوص کا دامن چھوڑنے کو تیار نہیں اب گھر گھر ولادت نبوی کی محفلیں ہوں گی سڑکوں پر عید میلاد النبی کے جلوس نکلیں گے یا سید الابرار، نسل انسان اپنے وجود کے مشکل ترین دور میں ہے جس زندگی کی اسے تلاش ہے وہ زندگی، اسے نہیں ملتی آسمانی صحائف یہی کہتے ہیں کہ خود کو پہچان کر اپنے آپ سے اوپر اٹھو''

نجمہ قانون قدرت کے تحت تدبر کرتی ہیں اور محسوس کرتی ہیں کہ ایک کائنات باہر ہے اور ایک کائنات انسان کے اندر بھی ہے باہری کائنات کا حسن ہی اس کے اندر کی کائنات کو خوبصورتی دیتا

ہے۔ کیوں کہ سارے جانداروں میں وہ شعور ذات رکھتا ہے۔ نجمہ کی ایک کہانی ''ذکر ایک مشعل بہ کف اور قندیل بہ چشم کا'' اسی شعور ذات کی کہانی ہے۔ جب انسان اپنے ماحول سے بے خبر ہو جاتا ہے تو اس کا دل سو جاتا ہے۔ ایسے میں دنیا میں نیک عمل پاک باطن انسان یعنی پیغامبر آتے ہیں، راہنما آتے ہیں اور اس نور، کی ترویج کرتے ہیں جو تمام کثافتوں کو دور کر دیتا ہے) یہ سطور ''ذکر ایک مشعل بہ کف......'' سے ''ہر طرف اندھیاروں کا سمندر تھا نہ کہیں زمین کا پتہ تھا نہ آسمان کا۔ طویل و عریض میدان کی سخت محسوس کی جانے والی شے یعنی زمین پر انسانی نفوس کا ہجوم تھا۔ ہر انسان اوروں کی تو بات ہی کیا خود کو بھی پہچاننے سے قاصر تھا۔ ہوا تیزی سے فضاؤں میں بہہ رہی تھی اس میں بادسموم کی تپش سموئی ہوئی تھی اندھیرے کی وجہ سے ان تاریک انسانوں کا دم گھٹا جاتا تھا...... عین اسی وقت زمین پر ایک پُر اسرار روشنی ہویدا ہوئی جس نے ان تاریک انسانوں کو چونکا دیا اندھیروں کے عادی تھے روشنی سے متحیر ہوئے۔ گھبرائے وہ روشنی انہیں پسند نہیں آئی......اس مشعل بہ کف نے نرمی سے کہا تم راستہ بھول گئے ہو میں تمہیں راستہ دکھاؤں گا''۔

نجمہ تاریخ عالم سے واقف ہیں، انسانی جبلت سے واقف ہیں جب جب دور جہل آتا ہے انسان کور چشم ہو جاتا ہے ہر دور کے پیغمبر نے اسی کور چشمی کا علاج کیا۔ اور روشنی سے روشناس کیا۔ نجمہ کو محسن انسانیت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے پناہ محبت وعقیدت ہے۔ عقیدت کا مطلب ہے انسان کا وہ پاکیزہ، ارفع واعلیٰ، منور اور کمالی جذبہ جس میں ڈوب کر صدیق اکبر محمد رسول اللہ کو اپنے کاندھوں پر لے کر عظمت کا پہاڑ بے تکان چڑھ جاتے تھے۔ دراصل عقیدت ایک توانائی ہے جو زندگی کی لہر بن کر سارے جذبوں کو ایک نکتہ پر مرتکز کر دیتی ہے۔ حضورؐ نے عورت کی ذات کو جو انفرادیت اور اعتبار دیا نجمہ اس کا کھل کر اعتراف کرتی ہیں، ان کے پیغام کو عام کرنا چاہتی ہیں۔ یہ کہانی علامتی طور سے یہی اعتراف ہے۔

نجمہ اپنی کہانیوں اور دیگر تحریروں کے ذریعہ ایک ایسا جھروکہ مہیا کرتی ہیں جس میں سے ہر منظر حسین نظر آتا ہے، جہاں بہترین مرغزار ہیں جہاں صنف نازک زندگی کے حسن کو اپنے اندر جذب کر رہی ہے جہاں وہ بہاروں کی نقیب ہے جہاں وہ نورانی مخلوق آدم وحوا کو خوش وخرم دیکھ رہی ہے ایک ارضی جنت جہاں حیات خوش نما نغمہ سرا ہے اور فضاؤں میں اس کا اثر دور، دور تک ہے۔

نجمہ کے اخلاص پر اس لئے یقین کرنے کو دل چاہتا ہے کہ اپنی کتاب ''پانی اور چٹان'' کے ''تعارف'' کا اختتام وہ ان جملوں پر کرتی ہیں۔

''راقم الحروف یہ وعدہ کرتی ہے کہ ایک مثالی معاشرہ اگر آپ نے قائم کر دیا تو وہ قلم رکھ دے گی اور فقط ایک گوشۂ تنہائی میں، ایک چھوٹے سے حجرے میں، جس کے چہار سو پھول کھلے ہوں، پہاڑیاں ہوں، جھرنے بہتے ہوں، طیور چہچہاتے ہوں، ہوائیں گاتی ہوں وہ انتہائی مسرور شاداں، مطمئن اور پر سکون ہوگی اور کوئی اس کا نام بھی نہ جانتا ہوگا یوں کہ وہ گمنام ہی رہنا چاہتی ہے......!''

اپنے آپ کو اس مقام پر لانے کے لیے بڑی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے سرسید نے کہا تھا'' تم میں سے بہت سی رابعہ بصری ہیں'') وہ مقام کہ جہاں دعائیں مقبول ہیں۔ خدا کرے معاشرہ ویسا بن جائے جیسا نجمہ چاہتی ہیں جیسا ہر حساس انسان چاہتا ہے۔

تو بہ آہ صبح، گاہی دل غنچہ را کشودی

(مطبوعہ ''شاعر'' فروری ۲۰۰۹ء)

○

عظیم اختر

پروفیسر (ڈاکٹر) نجمہ محمود

''ادب کے شوکیس میں سجنے کے لیے تخلیق کاروں کا ان صاحبان فکر ونظر کی ذہنی اطاعت قبول کرنا ایک المیے سے کم نہیں لیکن تابع قلمکاروں کے ہجوم میں ایسے قلمکاروں کے چہرے بھی نظر آجاتے ہیں جنھوں نے قلم کا پاس رکھتے ہوئے کسی صاحبِ فکر ونظر کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کیا۔ اس خودداری نے اگرچہ انہیں بڑی حد تک گوشہ گمنامی میں پہنچا دیا ہے اور وہ دیدہ ودانستہ مسلسل نظر انداز کیے جارہے ہیں لیکن صلہ وستائش سے بے نیاز ان کا ادبی سفر اسی اخلاص کے ساتھ جاری ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر نجمہ محمود ہمارے دور کی ایک ایسی جینوئن افسانہ نگار ہیں جنھوں نے تیرہ سال کی عمر میں ''میراث'' کے عنوان سے ایک افسانہ لکھ کر اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ سجاد ظہیر مرحوم جو ہر شناس انسان تھے انہوں نے نجمہ محمود کی تخلیقی صلاحیتوں کو پہچانا اور تیرہ سال کی عمر میں لکھے ہوئے نجمہ محمود کے اس افسانے کو نئی دہلی سے شائع ہونے والے ہفت روزہ ''عوامی دور'' میں اہتمام سے چھاپا۔ سجاد ظہیر مرحوم کی زیر نگرانی شائع ہونے والا، عوامی دور، اس زمانے کے ترقی پسند ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں میں کافی مقبول تھا اور اس جریدے میں چھپنے والے قلمکاروں کو عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ نجمہ محمود نے ''میراث'' کی اشاعت کے بعد پلٹ کر نہیں دیکھا۔ ادبی سفر کی ابتداء میں کامیابی حاصل کرنے والے تخلیق کار عام طور پر سرپٹ دوڑنے لگتے ہیں لیکن نجمہ محمود نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بے لگام گھوڑے کی طرح سرپٹ دوڑنے نہیں دیا۔ اس لیے آہستہ گامی سے اپنا ادبی سفر جاری رکھا جو آج بھی جاری ہے، لیکن نجمہ محمود کے اس ادبی سفر کو دیدہ ودانستہ نظر انداز کیا جارہا ہے جو ادبی بددیانتی کی ایک بدترین مثال ہے۔

''پانی اور چٹان'' نجمہ محمود کا پہلا افسانوی مجموعہ تھا، جس کی اہل نظر نے نہ صرف پذیرائی کی

بلکہ ادبی حلقوں میں بہت دنوں تک اس کی بازگشت بھی سنائی دیتی رہی اور پھر معدوم ہوگئی۔ نجمہ محمود کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں پر بھرپور اعتماد ہے، اس اعتماد نے ان کے مزاج میں قلندری اور بے نیازی پیدا کردی ہے اس لیے وہ کاتا اور لے دوڑے کی قائل نہیں ہیں۔ ''جنگل کی آواز'' ''صنوبر کے سائے تلے'' اور ''گل مہر کے سائے تلے'' ان کی وہ تازہ تخلیقات ہیں جو گزشتہ چند سالوں میں سامنے آئی ہیں اور اپنے ادبی معیار کی وجہ سے ارباب نقد ونظر کو مسلسل دعوت تنقید دے رہی ہیں، جن کو اوسط درجے کے تخلیق کاروں کو پروموٹ (Promote) کرنے اور ادب کے شوکیس میں سجانے سے فرصت نہیں، لیکن ہمیں یقین ہے کہ نجمہ محمود کی جاندار تخلیقات سے زیادہ عرصہ تک صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ عینی آپا کے انتقال کے بعد اردو دنیا میں جو خلاء پیدا ہوا ہے اسے ایک ذہین اور باصلاحیت خاتون فکشن رائٹر کے طور پر نجمہ محمود ہی پُر کریں گی، بشرطیکہ ہمارے ارباب نقد ونظر نے ان کے ساتھ بے اعتنائی اور بے توجہی کا عمل جاری نہیں رکھا۔

(مطبوعہ روزنامہ ہندوستان ایکسپریس، ۲۲؍مئی ۲۰۱۱ء)

○

شیخ محمد صادق

نجمہ محمود عالمی سطح کی ادیبہ

محترمہ پروفیسر نجمہ محمود صاحبہ اردو زبان وادب کی ایک ایسی شمع ہیں جنہوں نے اپنی تخلیقات سے ادب کو روشن ومنور کیا۔ان کے تخلیقی تجربوں نے اردو ادب کو جدیدیت کی روح سے روشناس کرایا۔محترمہ بہ یک وقت ایک افسانہ نگار، ناول نگار، مضمون نگار، ناقد، شاعر اور محققہ ہیں۔۲۰۰۱ء میں نجمہ صاحبہ کا افسانوی مجموعہ ''پانی اور چٹان'' شائع ہوا۔ان کے افسانوں میں نسائی جذبات و احساسات پائے جاتے ہیں۔وہ خود معلّمہ ہیں اسی لیے تدریسی خدمات انجام دینے والی خواتین کے مسائل سے واقف ہیں اس لیے بڑی صداقت اور خلوص کے ساتھ منفرد افسانوں میں انہوں نے اپنی زندگی اور ذات سے قارئین کو روشناس کرایا ہے اس مجموعہ کے بیشتر افسانوں کے موضوعات نئے، اچھوتے اور موثر ہیں مثال کے طور ''آئینہ کی تصویر' بوڑھا برگد'، لہر لہر سمندر'، ''غار'' اور ''وجود کے سوتے سے جدا'' وغیرہ۔ان کے افسانوں میں قدرتی مناظر کی حسین عکاسی ملتی ہے۔خصوصاً ''لہر لہر سمندر'' اور ''غار'' میں۔انہوں نے پلاٹ پر خصوصی توجہ دی ہے جو مضبوط اور منظم ہیں۔ان کے افسانے دلکش اور دلچسپ ہیں، اکثر ان کا انداز بیانیہ ہو جاتا ہے۔

حجاب امتیاز علی کی طرز میں لکھے ہوئے طرحی افسانے ''گل مہر کے سائے تلے'' املتاس کی چھاؤں میں'' اور ''چنار کے سائے تلے'' ماہنامہ ''شاعر'' میں شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں اردو میں یہ ایک انوکھا تجربہ ہے (یہ افسانے ان کے مجموعے میں شامل نہیں ہیں) ان میں قدرتی مناظر کی حسین عکاسی ہے اور ان کی جمالیت پسند فطرت کا اظہار بھی۔موصوفہ کی بیشتر تحریروں میں ان کی جمالیاتی کیفیت کا اثر غالب آیا ہے۔ان کی زبان پُرکشش ہے اور انداز تحریر انتشار سے بالکل پاک وصاف ہے۔ان کی زبان میں سوز وگداز ہے۔ان کے افسانے فنی نزاکتوں کو پورا کرتے ہیں۔

محترمہ نجمہ محمود نے ''بزم سہارا'' کا مارچ ۲۰۰۹ء کا شمارہ پڑھا جس کے ''گوشۂ ادبیات'' میں ''کیا اردو میں بڑے ناول کے امکانات ختم ہو گئے ہیں''؟ کے عنوان سے ایک مباحثہ شائع ہوا تھا۔ اس بحث سے متاثر ہو کر انہوں نے ناول کے میدان میں اپنے جوہر دکھائے۔ اسی ماہنامے کے اگلے شمارے (اپریل مئی ۲۰۰۹ء میں ان کا مختصر ناول (رسالے کے ۶ صفحات پر مشتمل) ''جنگل کی آواز'' شائع ہوا۔ جو اردو ادب میں بالکل نیا اور انوکھا تجربہ ہے اس کو پڑھ کر اردو قارئین بے حد متاثر ہوئے نجمہ صاحبہ نے ایک ہی ناول میں اپنا لوہا منوالیا۔ معتبر ناقدین نے ان کے فن کی قدردانی کی، ان کے ہنر کا اعتراف کیا۔ اس سے اگلے شمارے میں عارف حسین جونپوری نے مضمون بہ عنوان ''نجمہ محمود کا تخلیقی تنوع'' لکھا جس میں ممتاز ناقدین سجاد ظہیر، شکیل الرحمٰن اور وہاب اشرفی کی رائیں درج ہیں۔

سید حامد صاحب نے انہیں عالمی سطح کی مصنف تسلیم کیا۔

میرے پاس نجمہ محمود صاحبہ کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ واقعی ان کی شخصیت لاثانی ہے۔ جب سے ان کی تحریریں پڑھی ہیں سب سے زیادہ معتبر اور اعلیٰ ادیبہ ان کو تسلیم کرتا ہوں کیونکہ ان کے ایک عظیم قول ''ادب اور انسانیت کی خدمت اپنے آپ میں سب سے بڑا انعام ہے'' نے مجھے بے حد متاثر کیا ان کا یہ عظیم قول رات دن شاعری کرنے والے شعراء حضرات وخواتین اور ہزاروں کتابیں لکھنے والے نثر نگاروں پر حاوی ہے۔ ان کے اس قول میں ایک تلخ حقیقت ہے...... وہ ایک ایسی ادیبہ ہیں جن کے قول وفعل میں تضاد نہیں۔

آج بھی ہو جو براہیم سا ایماں پیدا
آگ کرسکتی ہے انداز گلستاں پیدا

نجمہ محمود صاحبہ کی تحریروں میں سچی دینی فکر سرایت ہے۔ وہ خواتین کے حقوق کی علمبردار ہیں۔ ان کی تحریروں میں تصنع اور بناوٹی پن نہیں ہے نہ الجھاؤ۔ ان میں وہ جادو ہے کہ شروع سے آخر تک قاری اس جادو کے زیر اثر رہتا ہے۔ نجمہ صاحبہ اپنی منفرد پہچان بنانے میں کامیاب ہوئیں اس بات کو مخلص ناقدین اور قارئین نے تسلیم کیا۔

ان کی فنی پختگی کو دیکھ کر یہ ماننا پڑے گا کہ جو بات نجمہ محمود صاحبہ میں ہے وہ کسی چوٹی کی ادیبہ میں بھی نہیں۔ موصوفہ کی تحریروں کو سمجھنے کے لیے خلوص، سنجیدگی اور غور وفکر کی ضرورت ہے نہ کی حسد، جلن اور جذبۂ رقابت کی۔

(اقتباسات از ''پروفیسر ڈاکٹر نجمہ محمود عالمی سطح کی چوٹی کی ادیبہ''
مطبوعہ ''اردو ٹائمز، ممبئی ۲ر جنوری ۲۰۱۱)

○

ڈاکٹر شمع افروز زیدی، نئی دہلی

پروفیسر نجمہ محمود کی فنّی جہات

ایم اے سال اول کے دوران آل انڈیا ریڈیو (دہلی) کی جانب سے جدید کہانی کے سلسلے میں اظہار خیال کے لیے مجھے مدعو کیا گیا تو نئی کہانی کاروں کا ذکر کرتے ہوئے نجمہ محمود کی بعض کہانیاں بھی زیر بحث آئیں۔ اس وقت تک میں نے ان کی زیادہ کہانیاں نہیں پڑھی تھیں، لیکن ''میراث''، ''اپنا پرایا'' اور ''خالی جھولی'' میری نظر سے گزر چکی تھیں۔ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ نجمہ محمود کو بات کہنے کا سلیقہ قدرت کی جانب سے ودیعت ہے۔ ان کے ان افسانوں میں اظہارِ حقیقت اور انسانی کرب واضح طور پر محسوس ہوتا ہے۔ کہانیاں پڑھ کر نہ جانے کیوں ان سے ملنے کے لیے ذہن و دل بے چین ہو اُٹھا۔ پھر یوں ہوا کہ کئی برس بعد غالباً ۹۰-۱۹۸۹ء میں حسنِ اتفاق عبداللہ گرلس کالج (علی گڑھ) میں جب میرا جزوقتی تقرر ہوا اور میں نے پہلی بار انھیں ٹیچرز کامن روم میں دیکھا تو ذہن میں بسی نجمہ محمود کی شبیہ مجسم ہو اٹھی یوں تصور کی آنکھ سے میں نے انھیں پہچان لیا، دل سرشاری کی کیفیت سے دوچار ہوا، نزدیک جا کر سلام کے بعد اپنا تعارف کرایا (جو اس وقت کوئی خاص نہ تھا) انھیں تو شاید یہ ملاقات یاد بھی نہ ہو، لیکن مجھے ان سے مل کر گفتگو کے دوران پھر بطور معلم ان کے تعلیمی نظریات سے آگہی ہوئی۔ کئی بار انھیں ساجدہ زیدی اور زاہدہ زیدی سے بحث کرتے ہوئے میں نے جانا کہ نجمہ محمود کی تربیت اسلامی خطوط پر ہوئی ہے۔ وہ روایت پسند اور اقدار کی نہ صرف حامل بلکہ حالات کا تجزیہ کرنے کی عمدہ صلاحیت بھی رکھتی ہیں۔ ان کے ذہن میں نت نئے سوالات ابھرتے ہیں،۔ مقابل کو اپنی گفتگو سے قائل کرنے کی صلاحیت ان کے اندر بدرجہ اتم موجود ہے۔ عام انسانی زندگی سے نئے پہلو تلاش کرنا، بات سے بات پیدا کر کے معمولی بات کو غیر معمولی بنا کر پیش کرنا ان کی ایسی خوبی ہے جس نے ان کی

تحریروں کو حسن اور وقار بخشتا ہے۔ نجمہ محمود بے حد حساس اور دور حاضر کے مسائل سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کی یہ خوبی میں نے ''سید حامد کہ گم اس میں ہیں آفاق'' میں سید حامد سے مکالمہ (انٹرویو) میں شدت سے محسوس کی۔ دراصل ان کے تخلیقی رویے کی نمایاں خصوصیت ان کا طرز احساس اور تخلیقی تنہائی کی وہ ساعتیں ہیں جو خود آ گہی کے نئے در وا کرنے کے لیے بیحد ضروری ہوتی ہیں۔

پھر یوں ہوا کہ آہستہ آہستہ وقت گزرنے کے ساتھ نزدیکیاں بڑھیں، وہ ایک بار میرے غریب خانے پر تشریف لائیں، میری شدید خواہش پر پورا ایک دن اور ایک رات میرا ان کا ساتھ رہا۔ فطرتاً منکسر المزاج، سلیم الطبع، لباس، اٹھنا بیٹھنا، سنہری فریم کے چشمے کے عقب سے جھانکتی ذہین آنکھیں، چہرے کے نقوش بولتے ہوئے، گفتگو میں توازن (وہ بولا کریں اور ہم سنا کریں والی کیفیت) مزاج میں سادگی لیکن ادب کی سطح پر ایسا پختہ تجربہ، غیر معمولی مشاہدہ اور تیز نگاہی، صحرا کی سی وسعت اور سمندر کی سی گہرائی، فکر کے نئے در وا کرتا اور لفظ و معنی کے دریچے و زاویے کھولتا ہوا ذہن یہ سب میں نے ان کے ساتھ چند دن علی گڑھ میں رہ کے جانا۔

سادگی اور انکساری کا پیکر نجمہ محمود کا ادبی ذوق بلند اور نکھرا ہوا ہے۔ انگریزی ادب میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کر کے شعبۂ انگریزی میں استاد کے فرائض انجام دیے پھر پروفیسر کے عہدے سے سبکدوش ہوئیں۔ لیکن ان کا تخلیقی سفر جاری رہا۔ اردو ادب پڑھنے اور لکھنے کو وہ عبادت کا درجہ دیتی ہیں۔ اردو کی ایسی شیدائی کہ دیکھتے ہی دیکھتے کئی کتابیں منظر عام پر آ کر ان کی شہرت کا سبب بن گئیں۔

میں نے نجمہ محمود کو عام محفلوں اور سیمیناروں میں کم کم ہی دیکھا۔ وہ بہت زیادہ معروف نہ سہی لیکن کئی معروف ادیبوں کے مقابلے زیادہ تخلیقی ادیبہ اور زیادہ حقیقت نگار ہیں۔ اگرچہ ان کا حلقۂ احباب زیادہ وسیع نہیں لیکن نمایاں خوبی، معاصرانہ رقابتوں اور چشمکوں سے دور خاموشی سے اپنے ادبی کاموں میں مصروف رہتی ہیں، جس کی تفصیل انگریزی اور اردو میں یوں ہے:

1. Virginia Woolf's Concept of Perfect Man. An Exploration in Comparative Litarature

2. From the Circle to the Center A Critical Miscellany.

''جنگل کی آواز'' (ادبی تخلیقات کا مجموعہ)، ''سید حامد کہ گم اس میں ہیں آفاق''، ''ریگستان میں جھیل'' (شاعری)، ''بے زنجیر جستجو'' (نگارشات)، یہ کتابیں انھوں نے کسی جاہ وحشمت یا نام و نمود کے لیے نہیں لکھیں بلکہ ان سے انھیں علم و ادب کے شوق فراواں کی سیرابی مقصود تھی۔ انھوں نے ان میں زندگی سے کشید کیے ہوئے شعور کی سطح پر حاصل کردہ تجربات کو سمو دیا ہے جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ ان کے فن پر پوری طرح نظر ڈالنے کی توفیق کسی ناقد کو نہیں ہوئی۔ (دو ایک کو چھوڑ کر) لیکن نجمہ محمود تمام باتوں سے پرے مصروفِ عمل ہیں۔

''جنگل کی آواز'' کی کہانیاں اور سید حامد کے تعلق سے کتابیں پڑھ کر ان کی وسعتِ نگاہ، مطالعہ، عرق ریزی، ادبی دیانت داری اور ہنر مندی کا احساس فزوں تر ہو جاتا ہے۔ اس کتاب میں نجمہ محمود نے حامد صاحب کا ذکر نہایت عقیدت، ممنونیت، سعادت مندی اور محبت سے اس طرح کیا ہے کہ ان کی شخصیت کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا۔ اس میں انھوں نے جدید تکنیک سے لیس ایک مووی کیمرے کی مانند تمام جزئیات کو سمیٹ لیا ہے۔ لفظوں کا استعمال جملوں کی ساخت، مرکزی وژن کا یہ طریقہ ان کا اپنا ہے اور ان کے اسلوب کا ایسا حصہ جو واضح طور پر ان کی پہچان کراتا ہے۔ نجمہ محمود اپنے کارناموں کے سبب ادب کے جس مقام پر ہیں یہ کسی ادبی گروپ سے وابستگی کا ثمر نہیں بلکہ ان کی تحریروں کی انفرادیت اور ذاتی صلاحیتوں کا کمال ہے۔

''بے زنجیر جستجو'' میں شامل مضامین پڑھ کر ان کی خوبصورت نثر قاری کو اسیر کر لیتی ہے۔ بی اے کے دوران ''مجاز ایک ساز ایک آہنگ'' مضمون ان کی صلاحیتوں کا بیّن ثبوت اور نثری صنف پر (پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آنے کے مصداق) ان کی بے پناہ دسترس کا حامل ہے۔ اس کتاب کے کم و بیش تمام مضامین بلاشبہ اس بات کے ضامن ہیں کہ ادیب کی حیثیت سے نجمہ محمود محکم رویہ و نظریہ رکھتی ہیں۔ ساتھ ہی اس بات کو استحکام بخشتی ہے کہ ان کے بطون میں ایک ایسا نقاد پوشیدہ ہے جو اپنے موضوع کو محبت سے دیکھتا ہے۔ دراصل نجمہ محمود کے تخلیقی رویے کی نمایاں خصوصیت ان کا طرزِ احساس ہے۔ وہ اشیا اور ان سے وابستہ حقائق کو ایک حساس آنکھ سے دیکھتی ہیں، پھر اس احساس کی شدت کو برقرار رکھتے ہوئے اس کا اظہار کرتی ہیں جس کے سبب قاری ادب کے تئیں ان کی سچی لگن کا خود بخود معترف ہو جاتا ہے۔ فکری اعتبار سے ان کا اسلوب منفرد، مطالعہ وسیع، نظریہ تفتیشی، انداز ایسا

محققانہ اور تخلیقی کہ ادب کا سنجیدہ قاری بھی ایک نشاط انگیز کیفیت سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

نجمہ محمود ایسی مفکر اور دانشور ہیں جو صلے وستائش اور انعام واکرام کی پرواہ کیے بغیر خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہتی ہیں اور جب بھی کوئی نئی کتاب لے کر آتی ہیں تو اہلِ خرد کو سمندِ حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔ ڈاکٹر محمد ثناء اللہ ندوی ان کے افسانے ''غار'' پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''پروفیسر نجمہ محمود ایک حساس اور تخلیقی سرچشمہ سے معمور دانشور ہیں۔ ان کی دانشوری جب تخلیقی آہنگ میں اپنے آپ کو ڈھالتی ہے تو الفاظ اور جملوں کے سانچے میں انفس وآفاق کی آگہی ڈھل جاتی ہے۔ یہ آگہی زمان، مکان، زبان اور مذہب کی حد بندیوں سے دور ایک خالص انسانی اور صوتی یا غنوصی وسیع المشربی کی ترجمان بن جاتی ہے۔''

(جنگل کی آواز، صفحہ ۱۲۱)

پروفیسر نجمہ محمود کے فن پر جناب قریشی منظور (بھکر، پاکستان) کی رائے بھی ملاحظہ کیجیے:

> ''انگریزی ادب ہو یا اردو ادب دونوں زبانوں میں کمال رکھتی ہیں۔ مشرق و مغرب کے دونوں افق ان کی فکر خیز قلمرو میں شامل ہیں۔ جذبات واحساسات کا اظہار نثر میں ہو یا وجدان والہام کا نزول آزاد نظم میں، زوال پذیر تہذیب کے دکھ ہوں یا فیمنزم کی حشر خیز تحاریک، پروفیسر نجمہ محمود کے ہاتھ تلوار سے خالی ہیں۔ پیڈسٹل پر ایستادہ پروفیسر صاحبہ انصاف پسند ایسا مجسمہ ہیں جن کی آنکھوں پر علم کا نگہبان رومال اور ہاتھ میں محبت کی کتاب ہے۔ ان کے ذاتی دکھ اور نا آسودہ پریشان لمحے آگہی کے اس نورانی سیلاب میں بہت دور کہیں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے قونیہ سے بوقت رخصت مولانا روم نے اپنا ہاتھ نجمہ محمود کے سر پر رکھ کر یہ مشہور جملہ کہا ہوگا: ''نیکی اور بدی کے تصورات سے ماورا ایک میدان ہے، میں تمھیں وہاں ملوں گا۔''

(جولائی ۲۰۲۰ء کے خط سے اخذ)

میں سمجھتی ہوں کہ نجمہ محمود نے اپنی راہیں خود دریافت کیں ان کے اظہار کا وصف ایسا پُرکشش ہے کہ مخالف قاری کو بھی اسیر کر کے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ وہ ہر بات نئی امیج کی صورت میں اس طرح پیش کرتی ہیں جس سے ان کی تحریروں اور افسانوں میں زبان وبیان کی تازگی اور شگفتگی کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ ان کے پاس الفاظ کا ایسا جوار بھاٹا ہے جو امڈا چلا آتا ہے۔ دراصل انھوں نے اپنے افسانوں اور کہانیوں کا مواد کتابوں اور سنی سنائی باتوں سے حاصل نہیں کیا بلکہ اپنی سوچ، نجی زندگی اور ماحول سے اخذ کیا ہے۔ جو کچھ دل پر گزرتا ہے، ذہن پر اثر انداز ہوتا ہے، اس کا اظہار وہ خلوص اور پوری ایمانداری سے کر دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ان کے دل میں کسی سے نظریاتی بغاوت کرنے کی خواہش جنم لیتی ہے تو وہ بھی نہیں چھپاتیں۔ اپنے افسانوں کا روایتی آغاز نقطۂ عروج اور اختتام پر ان کی خاص نظر رہتی ہے۔ کہیں کہیں ان کے یہاں تجریدی انداز بھی ابھرتا ہے۔ علامتیں تازہ اور ترسیلی، اسلوب پختہ و پر اعتماد اور گہرائی کا حامل، اختلاف کے تحت استعاروں کا استعمال متوازن اور مؤثر ایسا جس سے گہری معنویت اور تفکر پیدا ہو جاتا ہے۔ انھوں نے زندگی کے متنوع موضوعات کو افسانے کی جدید تکنیک میں ایسی مہارت سے پیش کیا ہے جس سے کہیں کہیں خود کلامی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ نجمہ محمود نے اپنی کتاب ''جنگل کی آواز'' میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ حجاب امتیاز علی سے متاثر ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا اعتراف ملاحظہ کیجیے:

> ''کم عمری سے ہی حجاب سے متاثر رہی تھی، عجیب پُر اسرار، ماورائی، طلسماتی و رومانی...... ماحول تخلیق کرتی ہیں اپنے افسانوں اور ناولوں میں۔ میں نے ۱۹۹۸ء میں ان کو دوبارہ پڑھا جنھیں پڑھ کر ایک خوابناک ماحول میں پہنچ جاتی، تفکرات سے نجات مل جاتی...... ان کی تحریروں میں دینی فکر، مذہبیت، زندگی سے، انسانیت سے شدید محبت، فطرت سے، خالق کائنات سے عشق، گہرا سماجی شعور، دردمندی، ساتھ ہی حسن مزاح۔ ایک آفاقی پیغام نظر آیا، امن عالم کا پیغام، پسندیدگی اتنی بڑھی کہ خیال آیا ان کی طرز پر طرحی افسانہ لکھوں (کیوں کہ نقالی میری روش نہیں۔''

(پیش لفظ جنگل کی آواز، صفحہ ۱۳۔۱۴)

میرا خیال ہے کہ یہ ان کی حجاب سے محبت، الفت اور عقیدت ہو سکتی ہے، لیکن ان کا انداز سراسر ان کا اپنا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم انھیں حجاب کے اسلوب سے مماثل کہہ سکتے ہیں۔ دراصل نجمہ محمود کے افسانے ان کے باطن میں پہنچنے والی کیفیت کا اظہاریہ ہیں۔ ان کی نفسیات میں مختلف ایسی لہریں ہیں جنھیں انھوں نے عالم گیر سطح پر محسوس کر کے تحریروں میں آشکارا کیا ہے۔ نجمہ محمود محض ایک افسانہ نگار یا نقاد ہی نہیں بلکہ اپنی ذات کے بین السطور وہ عالمی سطح پر رونما ہونے والے حادثات و واقعات کو افسانے کا روپ عطا کر دیتی ہیں۔ ان کے بطون میں کوئی واقعہ سر ابھارتا ہے، ہلچل پیدا کرتا ہے، چاہے وہ اقوام متحدہ کے مسائل ہوں یا ایران و عراق اور چین کے یا آسام و برما کے یا عام آدمی کے وہ انھیں افسانے کا جامہ عطا کر کے زندہ و جاوید کر دیتی ہیں۔

''پانی اور چٹان''، ''لہر لہر سمندر''، ''غار''، ''گل مہر کے سائے تلے''، ''املتاس کی چھاؤں میں'' اور ''چنار کے سائے تلے'' ان کے بہترین افسانوں میں شمار کیے جانے کے لائق ہیں۔ انھوں نے ان انتہائی خوب صورت افسانوں میں اپنی شخصیت اور وجود کو پوری طرح ضم کر دیا ہے اور زبان و بیان کے وہ جوہر دکھائے ہیں کہ قاری الفاظ کے حسن میں کھو کر خود اپنا وجود فراموش کر دیتا ہے۔ حجاب کے طرز پر تینوں طرحی افسانوں گل مہر کے سائے تلے، املتاس کی چھاؤں میں اور چنار کے سائے تلے میں جو بات میں نے واضح طور پر محسوس کی کہ چچا ادراک، پُرنور اور نوری ایسے کردار ہیں جو قاری کے دل کی گہرائیوں میں اتر کر عجیب سی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں اور یہ کردار تینوں افسانوں میں بار ہا نظر آتے ہیں۔ دیکھیے مندرجہ ذیل اقتباس:

> ''میں اعصابی بے چینی محسوس کرنے لگی چنانچہ میں نے یوڈی کلون سونگھا چند لمحے بعد چچا ادراک نمودار ہوئے، میں نے اٹھ کر ان کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے کہا ''نوری بیٹا! فطرت کے قرب سے تمھاری صحت پر اچھا اثر پڑ رہا ہے۔ اب طبیعت کیسی ہے؟''
>
> ''بہتر ہے، لیکن میرے محترم دنیا کی موجودہ صورتِ حال صحت پر مسلسل اثر انداز ہوتی رہتی ہے، ہر جگہ غارت گری ہے، ظالم اور مجرم دندناتے پھر

رہے ہیں۔ دین کا جنازہ اٹھ گیا، شعر وادب راندۂ درگاہ ہوئے، ایسے ماحول میں حساس لوگ مالیخولیا کا شکار کیوں نہ ہوں گے۔ انسانوں کی اکثریت احساس سے تہی مایہ ہو چکی ہے۔ ذہنی توازن کھو چکے ہیں، بے حس لوگ...... دراصل بچا ادراک! میں غمِ دوراں میں شدت سے مبتلا ہوں...... بتائیے فقط درختوں کے سائے میں افسانے لکھنے سے کیا ہوگا۔ ہم کیوں اتنے بے بس ہیں۔''

(املتاس کی چھاؤں میں، صفحہ ۱۵۶)

''قرآن کہتا ہے'' کہانیاں کہتے رہو تاکہ لوگ کچھ تو سوچ بچار کریں'' افسانے لکھ کر ہم دینی فریضہ پورا کر رہے ہیں۔ یقیناً...... پُر نور طمانیت سے مسکرائی۔ اختلاف برائے اختلاف اس کی فطرت نہیں۔ دینی فکر سے مزین...... معاً میں انتہائی پُر امید ہوگئی، پُر نور افسانے لکھ کر ہم انقلاب لائیں گے۔ زندگی کو، دنیا کو جینے کے قابل بنائیں گے۔ دنیا جس کی فضائیں بارود کی بو سے مسموم ہوگئیں، جس کے سمندروں کا شفاف نیلگوں پانی گدلا ہوگیا، جس کا آسمان لہو برسا رہا ہے، جس کی فضائیں معصوموں کی چیخوں سے پُر شور ہیں......''

(املتاس کی چھاؤں تلے، صفحہ ۱۵۹)

''میں، یعنی نوری نے نور سے کہا'' یاد ہیں تمھیں وہ نت نئے پروگرام...... کبھی پائیں باغ میں چہل قدمی، کبھی سائیکل سواری، کبھی ڈرائیونگ...... سب سے بڑھ کر ہوائی جہاز کی وہ اڑانیں...... ایک ساتھ سفر کے کتنے منصوبے ہم بناتے۔ کبھی مصر تو کبھی اسپین، کبھی آلپس تو کبھی ہمالیہ کے کوہستانی سلسلے...... ہم نے سرسبز لان پر ایستادہ خاموش، باوقار اشوک کے درختوں پر نظر ڈالی...... ان ہوشربا درختوں پر ریشمی پیازی نازک

کونپلیں پھوٹ رہی تھیں جب کہ سامنے کیاری میں گلاب اور ہالی ہاکس
کھل رہے تھے۔ گل مہر کے آتشیں پھول زمین پر بکھرے ہوئے پڑے
تھے۔ وہ ایک گرم ایشیائی شام تھی، آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ یاد ہے اس
گل مہر کے سائے تلے بیٹھ کر ہم نے کتنی ہی کہانیاں تخلیق کی تھیں۔ ایک
دن ہم لکھ رہے تھے چچا اور اک آ گئے، ہم نے ان سے فلسفہ اور تصوف پر
بے شمار سوالات کیے تھے۔ کتنی خوش دلی سے وہ جواب دے رہے تھے۔
اسی وقت اچانک گھنے سیاہ بادل گھر آئے۔ یہ ایشیائی بادل بڑے زور سے
برستے ہیں......''

(گل مہر کے سائے تلے، صفحہ ۱۴۵)

مندرجہ بالا اقتباس میں واضح طور پر حجاب امتیاز علی کے'' پائلٹ'' بننے کے ساتھ مختلف ملکوں کی جانب پروازوں کا واضح ذکر بھی ہے۔ ان افسانوں میں زبان کی چاشنی بھی ہے اور معلومات کا خزانہ بھی۔ ساتھ ہی مصنفہ نے قارئین کی دلچسپی کا بھی خیال رکھا ہے۔

مثالیں بہت دی جا سکتی ہیں، طوالت مانع ہے، مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ نجمہ محمود افسانوں کی بُنت کرتے ہوئے بیک وقت کئی حواسوں سے کام لیتی ہیں اور اس کی مثالیں ان کے افسانوں میں جا بجا ملتی ہیں۔ مندرجہ بالا سطور میں انھوں نے باصرہ، شامہ، سامعہ اور ذائقہ تمام حواسوں سے کام لیا ہے۔ بلاشبہ یہ ہر عہد میں زندہ رہنے والی کہانی ہے اور موجودہ حالات کی عکاس بھی۔ انھوں نے کہیں کہیں افسانے کے روایتی سانچے اور انداز سے بھی بغاوت کی ہے، لیکن جہاں جہاں بھی وہ روایت کو ساتھ لے کر چلی ہیں تاثر میں شدت پیدا ہو گئی ہے۔ اس افسانے کی بُنت میں مصنفہ نے جاں فشانی سے کام لیتے ہوئے ان تمام واقعات کو مربوط کر دیا ہے جو اس نے دیکھے محسوس کیے یا اس کے مشاہدے میں آئے۔ دراصل ذاتی تجربے اور شمولیت کے بغیر کسی بھی کہانی یا افسانے میں ابدیت اور زندگی کی لہر نہیں دوڑ سکتی۔ نجمہ محمود کے افسانے براہِ راست مشاہدے، تجربات اور مطالعے کی غمازی کرتے ہیں۔ وہ محض کسی حسین منظر یا چہرے کو دیکھ کر افسانہ یا شعری پیکر نہیں

تراشتیں بلکہ وہ ان تمام احساسات، کیفیات اور خیالات کو ابھارنے کی کوشش کرتی ہیں۔ جو واقعات انھوں نے وقتاً فوقتاً دیکھے یا جن تجربات اور کیفیات سے وہ گزر چکی ہیں۔ نجمہ محمود فقروں کی ساخت پر خصوصی توجہ دیتی ہیں۔ مثلاً آنکھ شعور کی علامت ہے، شگفتہ پھولوں کا پس منظر گہری معنویت کا اشاریہ ہے، اس سے مصنفہ کا نفسیاتی تعلق محسوس ہوتا ہے۔ نجمہ محمود نے کتاب کے پیش لفظ میں بے تکلفی سے جو باتیں کی ہیں انھیں پڑھ کر قاری پر بہت کچھ منکشف ہو جاتا ہے۔ بس دیکھنے والی آنکھ اور محسوس کرنے والا ذہن چاہیے۔ مصنفہ کی کہانیوں کا اسلوب بے حد پختہ اور گہرائی کا حامل ہے۔ علامت اور استعاروں کا استعمال ایسا متوازن اور مؤثر جس کے سبب گہری معنویت اور تفکر پیدا ہو گیا ہے۔ یوں لگتا ہے ان کے پاس ماضی کی حسین یادوں کا کبھی نہ ختم ہونے والا ایسا خزینہ ہے جس کے تہذیبی اور سماجی پس منظر سے وہ اپنے قاری کو بھی روشناس کراتی ہیں۔

وہ کافی عرصے سے دبئی میں رہ رہی ہیں، وطن کی یاد ستاتی ہے تو علی گڑھ کا رُخ کر کے اپنے جذبوں کو تسکین پہنچاتی ہیں۔ دبئی میں انھیں ایک جانب فطرت کا برہنہ صحرائی پیکر اور دوسری جانب فطرت کا ملبوس پیکر، ریت کا سمندر، ان کی دھوپ اور تپش دعوتِ نظارہ دیتی ہے تو رات میں ستاروں کا سمندر، فطرت کے اس حسین نظارے میں چاند، سورج، سمندر اور ہوا کے ایسے خدوخال جن کی خصوصیات جداجدا ہیں اور یہ تمام کُل کی صورت ان کی شاعری میں ابھر کر آ گئی ہیں۔ اصطلاحاً نجمہ محمود نثری نظمیں کہتی ہیں یعنی ایسی نظمیں جو آہنگ کے بحر و وزن سے وابستہ اور رسمی تصور سے آزاد ہیں۔ نثری نظم میں آہنگ کی قابلِ قبول سطح پیش کرنا انتہائی دشوار ہوتا ہے لیکن نجمہ محمود کے خلاق ذہن نے یہ کر دکھایا ہے۔ ستاروں بھری تنہارات میں ان پر جو کیفیت گزرتی ہے۔ چاندراتوں میں ان کے زخم مزید ابھر آتے ہیں۔ گاہے گاہے ان پر حسرت و یاس کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اگلے ہی پل اندر سے صدا ابھرتی ہے اور یہ صدا ''نئے انسان کا جنم'' اور ''روح کی روشنی سے فضائیں معمور'' نظموں میں محسوس کی جاسکتی ہے:

روح کی روشنی سے فضائیں معمور

روح کی روشنی سے فضائیں معمور

آواز کی گونج
موسیقی کا جادو، سحر طرازیاں
جنگلوں میں، کوہساروں میں
وادیوں میں، فضاؤں میں
آوازیں سرایت، تحلیل......
ایک انوکھی آواز
جس نے بے تیل کے دیے جلائے
آواز جس نے پھول کھلائے
مینہ برسایا
ایک قوت، ایک اندرونی لو
آتشِ گیتی گداز
شعور کی چنگاری......
روح کی روشنی سے فضائیں معمور
موسیقی کی فسوں خیزیاں (صفحہ ۳۷)

شاعرہ کے یہاں درد کی لہر قنوطیت پر ہی ختم نہیں ہوتی انسان کو حوصلہ بھی بخشتی ہے۔
ملاحظہ کیجیے ''نئے انسان کا جنم'':

نئے انسان کا جنم

سمندر سے ذرا کچھ دور، خشکی پر
کوئی بت آج پھر ٹوٹا
کسی کی روح کی چیخیں سنائی دے رہی ہیں
کوئی چپکے سے جیسے کہہ رہا ہو

کہ اس بُت کو

اسی اونچے، بہت اونچے سے منبر پر بٹھا آؤ

مگر سب بے سبب ہے

کہ بت کے ٹوٹنے سے

اک نیا انسان اس دنیا میں آیا ہے

مناؤ جشن اس انساں کے اس دنیا میں آنے کا

دعا مانگو کہ وہ خود سے بہت اوپر

بہت اوپر کو اٹھ جائے

کہ وہ خود نا خدا بن جائے

اپنی بھٹکی کشتی کا...... (صفحہ ۸۳)

''مدر گوڈیس'' ان کی ایسی توانا، طویل اور معرکے کی نظم ہے کہ اس کا ذکر کیے بغیر نجمہ محمود کی شاعری ادھوری محسوس ہوتی ہے۔ اس نظم پر ممتاز ناقد اور مفکر پروفیسر وحید اختر کی رائے پر اکتفا کرتی ہوں جو سند کا درجہ رکھتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

> ''مدر گوڈیس'' ان کی سب سے اچھی اور بھرپور نظم ہے۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے اردو کے ادبی سرمائے میں بالکل نئی اور منفرد ہے۔ سامی مذاہب کا خدا جنس سے بالاتر ہے، لیکن اس کے اوصاف، جلال و جمال کو جس طرح مذہبی اصطلاحات میں بیان کیا جاتا ہے اس کی بنا پر وہ صنف قوی کے اپنے تصور کا اظلال (Projection) نظر آتا ہے۔ نجمہ کی رومانیت انھیں اس دور اولین میں لے جاتی ہے جب عالم میں صرف ایک مذہب تھا اور اس کی ایک ہی دیوی تھی (دیوی ماں) جو محبت وتخلیق، جلال و جمال کا مظہر تھی۔ نجمہ اس دیوی کو پھر وہ جگہ دلانا چاہتی ہیں جو مرد خداؤں نے اس

سے چھین لی ہے۔ یہ کسی مذہبی عقیدے کا اقرار یا انکار نہیں، شاعرہ کے
وجودی تجربے کا اظہار ہے، یہ اظہار معتبر ہے اس لیے اچھا اور سچا ہے۔''

(ریگستان میں جھیل، فلیپ نمبر۱)

نجمہ محمود کی زندگی حادثات اور ناخوشگوار حالات سے دوچار رہی۔ ردِ عمل کے طور پر کبھی تلخ، کبھی شیریں اور کبھی معنی خیز مسکراہٹ اور کبھی احتجاج کی صورت ان کی شاعری میں نظر آتی ہے اور یہ احتجاج ان کے اندرون کا لگتا ہے مگر اس احتجاج کی خوبی ہے کہ اس میں شدت کے بجائے تلخ غنائیت اور نسائیت بھی ہے۔ ساتھ ہی ان کی شاعری میں یادوں کی ایسی پھوار اور خوشبو موجود ہے جس نے اس کے اندر کے موسم میں کئی موسموں کو پیدا کر دیا ہے۔ ان کی شاعری میں بھولی بسری یادیں، جذبات کے مدوجزر پر بادبانی کشتیوں کی طرح تیرنے لگتی ہیں۔ ایسی باہمت وخوش مزاج، سخن فہم فنکارہ، شاعرہ اور ادیبہ کی عظمت کسی دور میں بھی کم نہیں ہوگی۔ اللہ کرے وہ اپنا ادبی سفر یوں ہی جاری رکھیں اور تازہ بہ تازہ، نو بہ نو مضامین، کہانیاں اور شعری پیکر ہمیں عطا کرتی رہیں، آمین!

○

پانی اور چٹان (افسانوی مجموعہ)

(تبصرے)

○

"نمستے میرے بھائی..... اس کا دل بے نام سی مسرت سے لبریز تھا ..... فطرت میں کتنے اسرار پوشیدہ ہیں..... کیسی گہرائیاں ہیں پانی کی لہروں کے نیچے، زمین پر بسنے والے انسانوں میں جن کے مختلف رنگ وروپ ہیں۔ لہریں ابھرتی ہیں ڈوبتی ہیں اور سمندر کا حصہ بن جاتی ہیں انسان جنم لیتے ہیں مرتے ہیں لیکن زندگی چلتی رہتی ہے..... رواں رہتی ہے آج اسے فطرت کے مکمل حُسن کا ادراک ہوا تھا"۔

(اقتباس از افسانہ "لہر لہر سمندر")

حقانی القاسمی

پانی اور چٹان: ایک مطالعہ

نجمہ محمود کے افسانوں کی قرآت میں جو تاثر ذہن میں ابھرا ہے وہ یوں — یہ افسانے میر، غالب، اقبال، ٹیگور، خلیل جبران، شیکسپیئر اور رومی کی ذہنی وفکری بازیافت ہیں اور یہ افسانے ایسے ہیں کہ 'گم اس میں ہیں آفاق'۔ یہ افسانے حکایات لقمان، منطق الطیر اور طوطی نامہ کے سلسلہ کی توسیع ہیں جن کے مقاصد اصلاحی تھے۔ پروفیسر نجمہ محمود انتہائی پڑھی لکھی خاتون ہیں۔ انگریزی ادب انکا خاص میدان ہے مگر مشرقی ادب پر بھی ان کی نظر کچھ کم گہری نہیں۔ ''پانی اور چٹان'' کے تعارف کے چھیالیس صفحات وہ شعلے ہیں جو آخری افسانے تک بھڑکتے رہتے ہیں ان کو پڑھ کر میں نے سوچا کہ صندل پر زہر اثر نہیں کرتا، دریا پانی نہیں پیتا، آلوچہ اور جھاڑی ایک ساتھ نہیں رہ سکتے اور یہ بھی خیال آیا کہ نقاد تو بانجھ عورت کی طرح ہوتا ہے وہ کیا جانے کہ دردزہ کیا ہوتا ہے۔ نجمہ محمود کی کہانیاں آنکھوں سے اپنا رشتہ قائم کر کے لوح دل پر نقش ہوجاتی ہیں۔ میں ان کے افسانوں میں وجودیت کے عناصر تلاش تو کر سکتا ہوں لیکن سارتر وغیرہ میری فہم سے بالاتر ہیں۔ ان میں میں نے صرف عبودیت تلاش کی ہے۔ وہ عبودیت جو افسانے کو تخیل کی معراج اور فن کو سدرۃ المنتہیٰ عطا کرتی ہے۔ یہ افسانے دراصل مجمع البحار ہیں کئی عظیم دریاؤں کا سنگم۔ ان میں مذہب، نفسیات، فلسفہ اور تصوف کا زبردست منتھن ہے۔ یہ افسانے زندگی کے مختلف مظاہر کی تفسیر وتعبیر ہیں ''پانی اور چٹان'' کے بیشتر افسانے بہ قول مصنفہ تشکیل معاشرہ اور اصلاح معاشرہ کے لئے لکھے گئے ہیں ان کے افسانوں کا امتیاز یہ ہے ان میں اس قدر فطرت ہے اور اس سے اتنی وابستگی ہے کہ ان افسانوں پر ورڈز ورتھ کی شاعری کا گمان ہوتا ہے۔ فطرت کی طرف مراجعت اور ذہنی وفکری اعتکاف کا منظر ان کے کئی افسانوں میں نمایاں ہے مثلاً — لہر لہر سمندر سے یہ سطور —

''فطرت میں کتنے اسرار پوشیدہ ہیں۔کیسی گہرائیاں ہیں پانی کی لہروں کے نیچے، زمین پر بسنے والے انسانوں میں جن کے مختلف رنگ وروپ ہیں۔لہریں ابھرتی ہیں ڈوبتی ہیں اور ...... لیکن زندگی رواں دواں رہتی ہے۔اس کے سامنے تھیں دریا کی لہریں سامنے رنگ بدلتا آسمان، زمین پر سبزے کا جادو اور تصور میں ایک انسان کا پیکر اور کانوں میں گونجتے ہوئے یہ الفاظ بس اتنا ہی کافی ہے بہن جی ..... بس بس اتنا ہی کافی اور کھڑکی کے اس پار کھجور کے درختوں کا بکھرتے پانیوں پہ پڑتا ہوا عکس جادو جگا رہا تھا۔اُسے محسوس ہوا جیسے وہ ایک لہر ہے اور سمندری کائنات کا ایک حصہ ''لہر سمندر ...... ''پانی اور چٹان'' ان کی فطرت سے گہری وابستگی اور ذہنی وفکری شناخت کا اشاریہ ہے۔یہ سطور دیکھئے۔

''اس نے بیلے کی بے خود کردینے والی مہک کو خود میں اتارا گلاب کے پھول کی نرمی کو محسوس کیا ایک لطیف مسکراہٹ اس کے لبوں پر آئی اور پورا وجود ایک عارفانہ جذبہ سے سرشار ہوگیا ...... دور مشرق میں سورج کی پہلی کرن نمودار ہورہی تھی، کاش میں ساری عمر تنہا رہ سکتی ...... وہ تنہا ہی رہے گی اس نے فیصلہ کیا — اشوک کے باوقار درختو گواہ رہنا..... ''

فطرت کے علاوہ ذات کے گمشدہ حصّوں کی دریافت اور اپنی جڑوں کی بازیافت کا عمل بھی ان افسانوں میں نمایاں ہے۔انھوں نے زوال پذیر انسانی معاشرے کی کہانی اور اخلاقی انحطاط کا فسانہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ نجمہ محمود کو مرد معاشرے کی جڑوں میں کثافت نظر آئی ہے اور بعض کہانیوں میں اسی کثافت کے خلاف وہ آمادۂ جنگ ہیں اور طہارت کی بازیافت کرنا چاہتی ہیں جو طہارت حضرت رابعہ بصری کو میسّر تھی۔

> ''تجرد کی زندگی تو سب سے اچھی کہی گئی ہے لیکن شاہینہ بیگم تم رابعہ بصری نہیں ہو انتہائی معمولی متنفس ہو..... لیکن سرسید نے تو کہا تھا کہ تم میں ہزاروں رابعہ بصری موجود ہیں۔لیکن شادی کے بغیر کیا یہ دنیا والے زندہ رہنے دیں گے..... المیہ یہ ہے کہ شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد وہ کمسن لڑکی اتفاق سے بیوہ ہوگئی تو پھر اس کی دوسری شادی کے سلسلہ میں کوئی فکرمند نہیں ہوتا۔کسی کو اس کی تنہائی کا خیال نہیں آتا''۔

Inner Space سے جنم لیتے ان افسانوں میں دکھ بھی ہیں درد بھی اور تنہائی کا گہرا احساس بھی ان میں نجمہ محمود کے تخلیقی جنون کا شعلہ بھڑک رہا ہے۔ یہ ان کی داخلی خارجی زندگی اور فکری تموجات کا ایک منظر نامہ بھی ترتیب دیتی ہیں۔ سجاد ظہیر اور وحید اختر نے نجمہ محمود کے بارے میں جو بشارت دی تھی وہ بشارت ''پانی اور چٹان'' کے ذریعہ سچ ثابت ہو رہی ہے۔ نجمہ محمود کی تخلیقی مسافرت کی یہ داستان بڑی طویل ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں کو آفاقی عشق کے افسانے کہا ہے۔ سچ مچ ان میں آفاقیت بھی ہے، عشق بھی اور اس سے جڑے ہوئے سارے درد و آلام بھی۔ میں نے اس دشتِ عجیب اور صحرائے غریب میں بہت کم سیاحت کی اس میں جو کہانیاں محفوظ تھیں وہ اب ''پانی اور چٹان'' کے ذریعہ قاری تک پہونچیں گی۔ اور قاری کو ان میں باغ سراپا بہار بھی نظر آئے گا اور آتش صحرا بھی...... پام، بیلے، بوگن ویلیا کی خوشبو ان کی بوجھل فضا کو خوشگوار بنا دیتی ہے اور یہی ایک فنکار کا تخلیقی معجزہ ہے کہ اپنے دھڑکتے، سلگتے، مہکتے لفظوں سے ایک ایسی فضا کی تشکیل کرے جس فضا میں بہت سارے رنگ ہوں۔

نوٹ: تبصرہ کی صورت ''استعارہ'' میں شائع ہوا۔ دسمبر ۲۰۰۲ء میں مشمولہ ''طواف دشت جنوں'' اور ''استعارہ'' نئی دہلی

○

پروفیسر محمد ثناء اللہ ندوی

پانی اور چٹان: ایک جائزہ

''پانی اور چٹان'' پروفیسر نجمہ محمود کے رشحات قلم کی دین ہے اس مجموعہ کی تخلیق کار کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ دانش گاہِ علی گڑھ میں انگریزی کی معروف استاذ اور کئی کتابوں کی مصنف پروفیسر نجمہ محمود کے حساس ذہن اور عمیق مشاہدے کا سنگم اگر ایک طرف فکر رسا کے قابل قدر نمونے ہمیں عطا کرتا ہے تو دوسری طرف مظاہر حیات اور نیرنگیٔ کائنات پر ان کی غنوصی گرفت جب اپنے آپ کو الفاظ کے پیکر میں ڈھالتی ہے تو کسی حلاج یا سرمد کی روح شاید افسانۂ کہن کو تازہ کرنے کے لئے بے چین ہو جاتی ہے۔ نجمہ محمود کسی کہانی یا افسانے کو جنم دینے کے لئے اپنے ذہن اور قلم کو مجبور نہیں کرتیں بلکہ انکا ذہن اور قلم تخلیق کے آبدار گوہر منصۂ شہود پر لاتے ہیں یہاں آورد کو باریابی کی اجازت نہیں ہوتی۔ یوں بھی آورد کی کوئی کہانی یا فن پارہ کسی عظمت کا آئینہ دار نہیں ہوتا۔ کسی تخلیق میں آمد یا آورد کا فرق کرنا بھی ذوق، فکر، تجزیہ اور انبساط کی اساس کا طالب ہوتا ہے۔ جو آج کے ادبی مافیا میں شاید ہی موجود ہو۔ نجمہ محمود اس طرح کے کسی ادبی انڈر ورلڈ سے دور کا واسطہ نہیں رکھتیں۔

مجموعہ کی پہلی کہانی ''آئینہ کی تصویر'' کو پڑھتے وقت فریز کافکا کا ہیولیٰ ہمارے روبرو ہوتا ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات نے گنگا جمنی تہذیب کی سرزمین ہندوستان کو ہی نہیں بلکہ اس ملک کے نونہالوں، پرندوں اور چرندوں کو بھی بے گناہ لالہ زار کر دیا ہے۔ یہ خون اب ایک آسیب بن گیا ہے۔ جو اس وقت بھی نظر آتا ہے، جب ہم آئینہ میں اپنی صورت دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ آسیب کوئی اور نہیں بلکہ ہم خود ہیں۔

دوسری کہانی ''غار'' ہے جو وجود کے باطنی تجربہ پر مبنی ہے۔ وجود کا مراقبہ ایک صاحب نظر کو آفاقیت کی ان اتھاہ گہرائیوں کی سیر کراتا ہے جہاں حقیقت کی تجلی سے دیدۂ و دل شاد ہوتے ہیں۔ اس وجودی مراقبہ میں ملکوت و جبروت آپ کی مدد کرتے ہیں یہاں خضر راہ آپ کا باطنی ذوق، جستجوئے حق اور

قلندرانہ سرمستی ہوتی ہے یہ سفر لازماں کے ایک لمحہ میں کسی رومی یا عطار، کسی دانتے یا ابن عربی سے ملے ہوتا ہے جو تھوڑی دیر کے لئے خرد کو قلابہ میں باندھ کر قلندرانہ جست سے قدس کے چھجے کو چھو لیتے ہیں۔

ایک ماہر فنکار کا حساس ذہن رازحیات کی سربستگی سے اس طرح پردے اٹھاتا ہے کہ تخلیق کا گمان گذرتا ہے۔ ایسی ہی تخلیق ہمیں جمالیاتی حظ فراہم کرتی ہے۔ اس جمالیاتی حظ کو ارسطو نے کتھارسس، کہا تھا۔ ایک فنکار جب اپنے گردوپیش کے مناظر کی ترنگوں کو اپنے وجود کے نہاں خانوں میں محسوس کرتا ہے تو اس کا تخلیقی ذہن ان ترنگوں کی تفہیم انفس کے علاوہ آفاق اور تاریخ کے حوالے سے کرتا ہے۔ اس تفہیم کو اگر زبان کے قالب میں ڈھال دیا جائے تو جادوئی رنگوں میں تاریخی اور انسانی آہنگ ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتا ہے جس سے باذوق قاری محظوظ ہی نہیں مستفید بھی ہوتا ہے۔

پروفیسر نجمہ محمود ایک حساس اور تخلیقی سرچشمہ سے معمور دانش ور ہیں ان کی دانش وری جب تخلیقی آہنگ میں اپنے آپ کو ڈھالتی ہے تو الفاظ اور جملوں کے سانچے میں انفس و آفاق کی آگہی ڈھل جاتی ہے یہ آگہی زمان، مکان، زبان اور مذہب کی حد بندیوں سے دور ایک خالص انسانی اور صوفیانہ یا غنوصی وسیع المشربی کی ترجمان ہے۔ جو حقیقت کو مختلف ناموں سے یاد کرتی ہے جیسے ایزیس (ISIS) اور ہرنیہ گربھ، اور 'لوغوس (LOGOS)' کرشنا یا تاریخ اسلام اور تصوف کے حوالے سے نور محمدی تک پروفیسر نجمہ محمود توحید ابراہیمی کے، نور محمدی کے الٰہیاتی اور دینیاتی تفاعلات سے بہ خوبی واقف ہیں جن کو تاریخ کے نادان ہاتھوں نے مختلف اقانیم میں انتہائی بھونڈے انداز سے بانٹ دیا تھا۔ اسی لئے 'نور محمدی' کی کرنوں کا رقص بے خودی ہر ذرّہ، ہر سبزہ اور ہر 'غار' میں نظر آتا ہے اس طرح ''غار'' ایک فکر انگیز چیز بن جاتی ہے۔ افسانہ نگار نے شب و روز کی زمینی سچائیوں کو بطور خاص ہندوستان کے فرقہ وارانہ سیاسی پس منظر کے حوالے سے اس طرح اجاگر کیا ہے کہ ایک حساس ذہن زخمی تو ضرور ہو جاتا ہے مگر افسانہ نگار کا حال بقول خلیل جبران اس عظیم انسان کی طرح ہے جس کے دو دل ہوتے ہیں ایک سے لہو ٹپکتا ہے دوسرا صبر کرتا ہے۔''

پروفیسر نجمہ محمود نے ہندوستان کے پس منظر میں الفاظ کا ایسا رمزیاتی استعمال کیا ہے کہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ گنگا، جمنا، سرسوتی، جیسی قدرتی ندیوں کے ساتھ میرٹھ، ملیانہ، بھاگلپور، بمبئی اور گجرات جیسی کشت و خون کی ندیوں کو تمثیلی جگہ دینا ان کی ہی فنکاری کا حصہ ہے۔

''لہر لہر سمندر'' اس انسانی جوہر کی ایک جھلک ہے جو آج کی شہری زندگی سے رخصت ہوتی

جارہی ہے مگر جو دیہات اور گاؤں میں بہتر شکل میں موجود ہے۔ ''پانی اور چٹان'' شادی اور طلاق جیسے مذہبی اور ذاتی معاملوں سے متعلق ہے۔ ''خالی جھولی''، ''بوڑھا برگد''، ''نرگس کے پھول''، ''میراث''، ''آسماں تیری لحد پر''، ''چیخ کی گونج''، ''مٹی کا مادھو''۔ ''زرد پتے''، ''اپنا پرایا'' اور ''وجود'' کے سوتے سے جدا'' اس مجموعہ کی دوسری کہانیاں ہیں جو اپنی بنت، کردار نگاری اور اثر انگیزی میں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔

•

''پانی اور چٹان'' میں کچھ تذکرے بھی شامل ہیں۔ ''ذکر ایک مشعل بہ کف اور قندیل بہ چشم کا''، ''قصہ ایک درخت کا''، ''دوسری دنیا کا باسی''، ''نشانات نور'' اور ''مشک کی خوشبو'' جن میں شیخ سعدی شیرازی کے گلستاں کی بہار اور خوشبو ہمارے ذوقِ جمال کی تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ پروفیسر نجمہ محمود نے اس مجموعہ میں ادب رفیع تخلیق کرنے کی کوشش کی ہے۔ ادب اور زندگی کے تئیں خلوص، قدرت بیان، ادبی حلقوں کو جس کی پذیرائی کرنی چاہیے۔

پروفیسر نجمہ محمود ایک مستند نام اور ایک مستند آواز ہیں جو اردو کی دانش وری اور تخلیق میں اپنی خاص پہنچان رکھتی ہے۔ یہ پہچان خود ان کی ذات کی دین ہے۔ ان کو کسی نے 'لانچ' نہیں کیا۔ زندگی اور زندگی کے لمحوں پر ان کی غنوصی گرفت کو جب الفاظ کا پیکر مل جاتا ہے تو خوبصورت شاعری، پختہ تخلیق کاری اور عارفانہ مصوری کے قابل قدر نمونے ہماری فکری اور جمالیاتی 'کتھارسس' کے لئے جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ''پانی اور چٹان'' میں وہ اپنی شخصیت کی اسی پہچان کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کی ہر تخلیق کا سرچشمہ خلوص ہے اس خلوص سے تخلیق صحیح معنیٰ میں زندگی کی ترجمان بنتی ہے جس میں ''سیاست'' کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ اس کتاب کا ''تعارف'' ہی مصنف کے نظریۂ زندگی سے بہ حسن وخوبی متعارف کرادیتا ہے۔ پروفیسر نجمہ محمود کوئی سعدی، عطار، رومی، شیکسپیئر، دانتے، معری، خلیل جبران، یا ٹیگور نہیں اور نہ ہی ان کی نقل پر آمادہ ہاں زندگی اور فن کے تئیں ان کے رویئے اور پیغام کے وسیع ہالے میں اپنے لئے ایک نشست چاہتی ہیں میں نہیں سمجھتا کہ اس گلاب روحانی (دانتے کا استعارہ) میں نشست سے مصنفہ کو باز رکھا جاسکتا ہے۔

(مطبوعہ 'کتاب نما' دسمبر ۲۰۰۲ء
مشمولہ 'جنگل کی آواز')

○

سلام بن رزاق

پانی اور چٹان پر ایک نظر

نجمہ محمود اردو افسانہ نیز اردو شاعری کا ایک معروف نام ہے۔''پانی اور چٹان'' ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے جس میں ان کے پانچ تذکرے اور چودہ افسانے شامل ہیں۔''تعارف'' کے زیر عنوان ایک مقدمہ جس میں مصنفہ نے اپنی تحریر کے میلانات اور محرکات پر روشنی ڈالی ہے۔ مجموعہ کا ٹائٹل افسانہ''پانی اور چٹان'' میں ایک لڑکی شاہینہ کے جذبات واحساسات کی عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے...... ''خالی جھولی میں ایک ماں کی ممتا کا دردمندانہ اظہار ہے۔موجودہ معاشرے میں والدین اور نئی نسل میں جو تفاوت ہے یا ملازمت پیشہ والدین اور بچوں کے درمیان کا رشتہ کیسا میکانکی ہوگیا ہے، اس مسئلہ پر یہ افسانہ گہرا طنز ہے۔ ملازمت پیشہ خواتین کے بچوں کی نفسیات پر ''بوڑھا برگد'' بھی ایک عمدہ کہانی ہے۔''آئینہ کی تصویر'' ایک رمزیہ کہانی ہے۔''پانی اور چٹان'' کے افسانوں میں کسی مخصوص اسلوب کی پیروی نہیں کی گئی ہے۔ ہر افسانے کا ٹریٹ منٹ موضوع کے لحاظ سے جداگانہ ہے۔ اگر''غار'' میں انسان کے باطنی سفر کی روداد کو رمزیہ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے تو ''اپنا پرایا'' میں براہ راست بیانیہ کا سہارا لیا گیا ہے۔''آسمان تیری لحد پر'' میں تجریدیت کا رنگ غالب ہے۔ میرے نزدیک ''لہر لہر سمندر'' اس مجموعہ کی سب سے عمدہ کہانی ہے۔ بعض اوقات خون، مذہب، ذات، برادری وغیرہ کے رشتے بھی دھوکا دے جاتے ہیں مگر دو انسانوں کے درمیان ایک بے نام رشتہ جسے خالص انسانی رشتہ کہتے ہیں سب سے بڑا رشتہ ہے۔''لہر لہر سمندر'' میں اسی نکتے کو خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ کہانی براہ راست انسانی جذبے کو جھنجھوڑتی ہے اور کہانی کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے قاری خود اندر سے بھیگ جاتا ہے۔ اس کہانی کی سادگی ہی اس کی قوت ہے۔ مصنفہ نے اپنے پیش لفظ میں جگہ جگہ خلیل جبران سے اپنی عقیدت کا

اظہار کیا ہے۔ کتاب کے آخر میں شامل چاروں تذکروں پر خلیل جبران کا اثر نمایاں ہے۔ ''پانی اور چٹان'' ایک سینئر افسانہ نگار خاتون کی چالیس سال کی کاوشوں کا حاصل ہے۔ امید ہے کہ اردو دنیا میں ان افسانوں کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

(تبصرہ ''پانی اور چٹان''، مطبوعہ ''انقلاب'' (روز نامہ، ممبئی ۶ ر جون ۲۰۰۶ء)

○

احمد ہمیش

''پانی اور چٹان'' ایک مختصر جائزہ

نجمہ محمود کا بہ یک وقت خلاق، اہل علم، اہل نقد ونظر اور اہل اسلوب ہونا اپنی جگہ مسلّم اور ثابت ہے جب کہ شعر ونثر میں ایسی مثالیں کم ہیں۔ نجمہ محمود کی کہانیوں میں ان کی تخلیقی انا اور فردیت پر نظر کرتے ہیں تو کہانی ''آئینہ کی تصویر'' میں موضوع، بیانیہ اور تکنک کے اعتبار سے تاثریت کی پینٹنگ سے کام لیا گیا ہے جہاں تک ''بوڑھا برگد''، ''ذکر ایک مشعل بہ کف اور قندیل بہ چشم کا''، ''دوسری دنیا کا باسی''، ''نرگس کے پھول''، ''قصہ ایک درخت کا'' کہانیوں کا تعلق ہے تو ان میں جاتک کتھاؤں اور صوفیائے کرام کے ملفوظات وحکایات جیسا برتاؤ پایا جاتا ہے۔ تاہم درون موضوع نجمہ محمود نے ''مدرگاڈیس'' کے تصور کو ہی اجاگر کیا ہے۔ جب کہ ''آسماں تیری لحد پر'' کہانی میں ماں کی موت اور اس کی قبر کے بیان میں نجمہ محمود کا تصورِ غم بھی مادرانہ نظام کی یاد دلاتا ہے۔ اور یہ حوالہ ہی نجمہ محمود کی کہانیوں کے تعین قدر کے لئے کافی ہے''۔

(اقتباس ماخوذ تبصرہ پانی اور چٹان پر مطبوعہ تشکیل)

○

○

''ان ہی سوگوار لمحوں میں زرد سوکھے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز ابھری..... کسی درخت پر اُلو بول رہا تھا۔ زمین پر بے جان پڑی صبا کا چہرہ ایک بیکراں سکون سے روشن تھا جیسے کہہ رہی ہو مجھ کو مار کر بھی رئیس خاں تم میری روح کو نہ مار سکے — فتح مند میں ہی رہی''۔

(''زرد پتے''، مشمولہ ''پانی اور چٹان''

افسانوی مجموعہ: اشاعت ۲۰۰۱ء)

''سید حامد کہ گم اس میں ہیں آفاق''

(قارئین کے مکاتیب)

○

یہ سطور ایک ایسی ہستی کی زندگی کے سفر کو قلم بند کرنے کی سعی ہے جس میں بہت سی وسعتیں پنہاں ہیں۔ ایک خلقت جس کی شریک سفر رہی ہے، جو "فکرِ رازِ ہستی کا پرستار" ہے، جس کا وجود رومی کے اس مصرعے کے مصداق ہے:

؎ آں یکے ریگے کہ جوشد آب ازو"

(اقتباس از: سید حامد کہ گم اس میں ہیں آفاق")

خلیق انجم

کل دوپہر آپ کی ارسال کردہ کتاب سید حامد کہ گم اس میں ہیں آفاق موصول ہوئی۔ رات کو اس کتاب کے تقریباً دوسو صفحات پڑھ ڈالے، جیسی شخصیت ہمارے حامد صاحب کی ہے ویسی ہی شاندار یہ کتاب ہے۔ مجھے حامد صاحب کو قریب سے جاننے کا شرف حاصل ہے۔ میں نے ان کی شخصیت اور سیرت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ کہاں تک کامیاب ہوا ہوں یہ تو نہیں کہہ سکتا ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ آپ کی کتاب سے جس عظیم المرتبت انسان کی شخصیت ابھرتی ہے وہ وہی ہے جس کے نقوش میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ آپ نے بہت اعلیٰ درجہ کا کام کیا ہے آپ کی اس کتاب سے حامد صاحب کی شخصیت کے تمام پہلو اجاگر ہو جاتے ہیں۔ اسے پڑھ کر مجھے خیال آیا کہ آپ ہمارے سب سے بڑے محسن سرسید پر بھی ایسی ہی کتاب لکھ سکتی ہیں۔ خدا آپ کو سلامت رکھے اور اس طرح کے کام کرنے کا مزید حوصلہ دے۔

دعا گو خلیق انجم

(۱۸ر دسمبر ۲۰۰۳ء)

○

جگن ناتھ آزاد

آپ کا مختصر سا کرم نامہ بھی ملا اور گراں قدر تحفہ بھی۔ ''سید حامد کہ گم اس میں ہیں آفاق'' آپ نے اقبال کے مصرعوں کا کیا عمدہ طور پر برمحل استعمال کیا ہے۔ ابواب کے عنوانات بھی آپ نے بہت عمدہ دیے ہیں اس سے آپ کا شعروادب کا ذوق نمایاں ہے۔ آپ نے انجمن کی صد سالہ کانفرنس کی ملاقات کا حوالہ دیا ہے مجھے وہ ملاقات یاد ہے۔ آپ علی گڑھ میں ہیں جب سید حامد صاحب کو خط لکھیں تو میرا سلام لکھ دیں۔ والسلام

دعا گو جگن ناتھ آزاد

(۱۹ر ستمبر ۲۰۰۳ء)

○

مولانا محمد رابع حسنی ندوی

آپ کا مرسلہ نسخہ ''سید حامد کہ گم اس میں ہیں آفاق'' مجھے وصول ہوا۔ آپ نے اچھا کام کیا ہے۔ ملت اسلامیہ کے ایک ممتاز دانشور کے حالات وکمالات پر کتاب تیار کی انشاء اللہ اس سے نوخیز نسل کو رہنمائی ملے گی۔

دعا گو محمد رابع ندوی

○

احمد سعید ملیح آبادی

اخوۃ العزیزہ پروفیسر نجمہ محمود سلمہا

محترم سید حامد صاحب پر آپ کی ضخیم کتاب موصول ہوئی۔ سید حامد صاحب پر آپ نے بہت اچھا کام کیا ہے اور حق ادا کر دیا۔ سید حامد صاحب کی شخصیت اور ان کی قومی اور ملی خدمات کا تقاضا تھا کہ ان کے متعلق یہ تصنیف منظر عام پر آئے۔ کتاب کی تقریب اجراء کے لیے کوئی پروگرام علی گڑھ میں ہوتا اور آپ کے سیاق وسباق میں سید حامد صاحب پر گفتگو ہوتی تو آپ کی محنت کا بھی حق ادا ہوتا۔

علی گڑھ میں آپ سے ملاقات اور محبت کا برتاؤ ذہن میں تازہ ہے مل کر جی بہت خوش ہوا تھا اور خود آپ کی شخصیت سے میں متاثر ہوا۔ یہ بات باعث فخر ہے کہ ملیح آباد کی خاتون نے دانش گاہ علم وفضل میں اپنے لیے باوقار جگہ بنائی۔ اللہ آپ کو اور متعلقین کو خوش وخرم رکھے۔ سب کو دعائیں متبول کا کیا حال ہے کیسے ہیں؟

دعا گو احمد سعید ملیح آبادی
(یکم اکتوبر ۲۰۰۳ء)

○

جمیل الدین عالی

بھئی میں آپ کی کتاب پر کیا کہوں (لکھنے کا تو اہل نہیں) آپ کے بہت ہی خوبصورت تجزیے، فقرے پوری انشاء خود آفاق کی وسعتوں کو شرمار ہے ہیں۔ میں نے آپ کی دوسری کتابوں

کے تذکرے سنے تھے بھارتی جرائد میں تبصرے پڑھے تھے تاثر بہت ہی بارعب اور موثر ہے۔ ادھر آنا بوجوہ کم ہوتا ہے ورنہ آپ کی شہرت ایں کتب جلیلہ کی وجہ سے آپ سے ملنے آتا۔

سید حامد ایک عجوبہ ہیں۔ میں تنقید کا آدمی نہیں ہوں مگر میں آپ کی کتاب پڑھتا جاتا ہوں اور بار بار ایک رعب اور آپ کی گیرائی فکر سے دوچار ہوتا جاتا ہوں۔ یا اللہ صرف اتنی سی عمر کی خاتون ایسی نظر رکھتی ہے اور میں اس کی تعریف کیسے کروں کر ہی نہیں سکتا۔ لیکن یہ خوشی کم نہیں ہے کہ ہمارے ملک میں نہ سہی ہمسائے ملک میں ایک ایسا آدمی پیدا ہوگیا۔ یہ سعادت میں نے فکروادب کی پاک بھارت تاریخ میں تو دیکھی نہیں باہر کی دنیا میں بھی کم کم پائی گئی ہے۔ بازویل ایک کم عقل، باوفا سوانح نگار ہے ایک ذہین تجزیہ کار نہیں جس کے افکار اور مطالعے ممدوح سے ایسی جائز اور خوبصورت وفا پر منتج ہوں۔

نہ معلوم بھارتی اردو طبقہ نے اس کتاب کا کیسے استقبال کیا۔ ان کی عمومی مداحی پچاسوں مستند صفات کے سبب ہمیں معلوم رہتی ہے زیادہ زوران کی سماجی خدمات پر ہوتا ہے مگر اس کتاب میں تو آپ نے

موج بہ موج یم بہ یم
سچائیوں کے رقص دکھائے ہیں

کہیں بھی ایک ایسے شخص کا پروان چڑھ جانا بذات خود ایک کرامت ہے۔ جی چاہتا ہے ایک پورا مقالہ آپ کی تعریف میں بھی لکھوں آپ کی نظر تو قابل صد داد ثابت ہو ہی گئی کہ سید حامد کو انتخاب کیا۔ آپ کی سحر بیانی، مقدمے قائم کرنا، تجزیاتی زاویے، قدم قدم پر دلیل اور ثبوت اور قاری سے ذرا نہ ڈرنا بلکہ اسے ہی خود اعتمادی کی خوشگوار مشق میں ڈال دینا۔ فی الحال اجازت دیجئے۔ اے حیرت زدہ کر دینے والی خاتون اللہ تجھے سلامت بھی رکھے اور ادب کے لیے خوب کام لے۔

دعائیں ہی دعائیں، جمیل الدین عالی

○

سید محمد اشرف

آپ نے بہت خلوص دل، محنت اور وابستگی کے ساتھ یہ کتاب لکھی ہے۔ سبحان اللہ میں بھی

اس زلف کا اسیر ہوں اور اسیر دیرینہ ان پر لکھنے کو میرا ابھی بہت دل چاہتا تھا اور چاہتا ہے تھوڑی سی تلافی ''آفتاب'' ۲۰۰۰ء کے انٹرویو میں کر دی تھی لیکن آپ کا معاملہ تو یہ ہے:

سب پہ جس بار نے گرانی کی　　اس کو میں ناتواں اٹھالایا

شدید وابستگی سے سوانح نگار کو تو نہیں لیکن سوانح کو خطرہ لاحق ہوتا ہے لیکن آپ کے قلم کے ضبط وتحمل نے ایسے مقامات کو بہ آسانی سر کرلیا ہے۔ اس کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں بہت سی معلومات یکجا ہوگئی ہیں آج سے پچاس سال بعد جب لوگ سید حامد پر کچھ لکھنا چاہیں گے تو یہ کتاب reference کا کام دے گی۔

(۴رنومبر ۲۰۰۳ء)

○

محمد اسحٰق

آپکی تصنیف وصول ہوئی۔ ایک ہی نشست میں بہت کچھ پڑھ ڈالا کیونکہ سید حامد سے ہماری عقیدت پیر ومرشد کی سی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ سید صاحب کی شخصیت شروع سے آخر تک ایک بلوری میں آئینہ خانہ ہے جس میں اس شخصیت کے کئی رنگ جھلکتے ہیں جو پڑھنے والے کے لیے سرچشمۂ وجدان ہیں۔ آپ نے خوب کیا کہ اس حسین شخصیت کی تفسیر حیات کا ذریعہ اقبال کے اشعار کو بنایا۔ ہر عنوان پر آپ کے گہرے تاثرات دیکھ کر یہ شعر یاد آیا:

ساقی ترا مستی سے کیا حال ہوا ہوگا

جب تو نے یہ مے ظالم شیشے میں بھری ہوگی

آپ نے جس والہانہ عقیدت سے یہ کتاب لکھی ہے۔ اس کے لیے آپ قابل مبارکباد ہیں کیونکہ ہماری موجودہ اور آئندہ نسلیں اس منارۂ نور سے بہت کچھ روشنی حاصل کریں گی۔

والسلام

(۱۰رنومبر ۲۰۰۴ء)

○

مولانا محمد سالم قاسمی

''سید حامد کہ گم اس میں ہیں آفاق'' کے دلکش عنوان پر آپ نے وقت کی تاریخ ساز شخصیت کے نقوش حیات وافکار جمع فرما کر جو عظیم خدمت انجام دی ہے وہ ایسی مربیانہ خدمت ہے کہ جو آج کی اور اگلی نسلوں کے لیے بھی ارتقاء پذیر ذہنوں کے لیے اہم ترین تربیتی درس ثابت ہوتی رہے گی۔

آں محترمہ اس تالیف وقیع پر بجا طور پر تبریک بے حساب کی مستحق ہیں۔ جزاک اللہ

(۲۷ رنومبر ۲۰۰۳ء)

○

احمد ندیم قاسمی

''سید حامد کہ گم اس میں ہیں آفاق'' کا بے حساب شکریہ۔ میں اپنے تاثرات سے آگاہ کروں گا۔ فنون میں تبصرہ بیماری کے سبب خود تو شاید نہ کر سکوں لیکن کسی معقول اہل قلم سے درخواست کرنے کا ارادہ ہے کہ اس پر تبصرہ لکھ دیں۔ محبت کے ساتھ کہ آپ نے بڑی اپنائیت سے نوازا۔

دعا گو احمد ندیم قاسمی

(۳ ردسمبر ۲۰۰۳ء)

○

عرفان صدیقی

بلاشبہ آپ کی کتاب ایک اہم شخصیت اور تعلیم کے شعبہ میں وقیع خدمات انجام دینے والی ہستی کے سمجھنے میں بہت مدد دیتی ہے یہ شخصیت نگاری کا بہت اچھا نمونہ ہے جس میں ذاتی ترجیحات کو دور رکھتے ہوئے ایک حقیقت پسندانہ اور معروضی تجزیہ اور مطالعہ پیش کیا گیا ہے ایسی اچھی کتاب کے لیے آپ کو مبارکباد۔ اللہ آپ کو ایسی اچھی کتابیں لکھنے کے لیے توانائی عطا فرمائے۔

والسلام

(۳ ردسمبر ۲۰۰۳ء)

○

سید حامد

"...... کہ گم اُس میں ہیں آفاق" کی تعریف میں نے دل کھول کر اس لئے نہیں کی کہ خود ستائی اور خودنگری کا گمان ہوتا..... کتاب کے فنکارانہ حسن ترتیب اور جمالِ تعمیر پر آپ نے خونِ جگر صرف کیا ہے۔ آپ نے بڑے حسین انداز سے میری تصویر کھینچی ہے۔ مصور نے سارے دھبے نکال دیئے ہیں۔ میرا روئے سخن اسکے موقلم کی ماہرانہ جنبشوں کی طرف ہے۔ آپ نے ایک سیدھی سادی بے رنگ سی زندگی کی داستان کوواقعات کی کھتونی بننے سے بچالیا۔ ایک سادہ سے خاکے میں آپ نے تخیل اور عبارت آرائی سے رنگ بھر دیا۔ آسان سا طریقہ ہوتا ہے سوانح نگار کا کہ مرورِ ایام کا اتباع کیا جائے۔ خاندان، ولادت، تعلیم، بلوغ، اکتساب، امتیاز کا تذکرہ زمانی اعتبار سے کر دیا جائے۔ لیکن یہ طریق نہ آپ کی وابستگی کوراس آتا، نہ انشاپردازی کو، نہ تخیل اور تخلیق کو، دونوں کا دم اس تنگنائے میں گھٹتا لہٰذا آپنے وہ طریقہ اختیار کیا جس میں وسعت ہے، کشادگی ہے، بلندی ہے، بلند پردازی ہے، رنگارنگی ہے۔ فنکار کے تخیل کی بھٹی میں زمان ومکان، واقعات، حادثات پگھل کر رہ گئے ہیں جنھیں نئے نئے سانچے، نئے نئے زاویے دیئے گئے ہیں، نوک پلک سے سجایا گیا ہے۔

اس ریاضت کو کیا کہئے جس نے مصنف کو سالوں جستجو میں منہمک رکھا۔ اُس حسنِ انتخاب کی داد کیا دیجئے جس نے مواد کے ایک انبار کو چھان کر اُن پہلوؤں کو چن لیا جن سے موضوعِ کتاب کی قبول صورت تصویر بن سکتی ہو۔ اس کتاب کے ضمن میں جو عرق ریزی کی وہ پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ موضوع کتاب سے اس کتاب کے مصنف کو کتنی وابستگی ہے۔ اقبال نے کہا تھا :

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر

لاریب کہ اس کتاب کے مصنف نے خونِ جگر دریغ نہیں کیا۔

صرف کرتے ہیں شبانہ روز آنکھوں کا لہو
اس طرح تخلیق میں رکھتے ہیں فن کی آبرو

نجمہ صاحبہ نے فن کی آبرو رکھ لی۔ ایک بہت اچھا طریقہ زیرِ نظر کتاب کی تحسین کا یہ ہے کہ مطالعہ کے دوران موضوعِ کتاب کو یکسر فراموش کر دیجئے اور اسالیب بیان اور سوانح نگاری کے

انداز پر ساری توجہ مرکوز کردیجئے۔ مصنف نے سوانحی تسلسل میں رکاوٹ ڈالے بغیر بہت سے بیل بوٹے بنائے ہیں پہلی نظر میں جو قاری پر نہیں کھلتے۔خزانہ بغیر تلاش کے ہاتھ نہیں آتا۔

قاری کی پہلی نگاہ پہلے کتاب کی جامعیت پر جاتی ہے اس میں موضوع کتاب کی زندگی کے حالات ہیں۔ اسکے افکار وحوادث پر تبصرہ ہے اسکی اردو نثر اور نظم کے معنی خیز انتخابات ہیں۔ اسکے انگریزی مضامین کا انتخاب بھی شامل کیا گیا ہے۔ اسکی کتابوں پر تبصرے ہیں، اسکے گھرانے کی تصویریں ہیں۔ سید حامد کی بابت کسی کو آگے جستجو کیوں ہونے لگی لیکن اگر اتفاق سے کسی کو ہوئی تو اسے سب کچھ اس کتاب میں مل جائے گا۔ ہر طریقہ سے، ہر ہر زاویے سے ایک کم پہلو، تنگ مایہ شخصیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ شرح و بیان کے علاوہ مکالمات ہیں، خطوں سے اقتباسات ہیں، ماحول اور گرد و پیش کا ذایقہ ہے، ایک دور ہے جسے سوانح نگار نے تسخیر کرلیا ہے اور مستقبل کے لئے محفوظ کردیا ہے۔ جس شخص کی سوانح عمری لکھی گئی ہے اسکی طرف شاید کوئی دوسرا اہل قلم ملتفت نہ ہوتا لیکن ایک بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ کسی دوسرے سوانح نگار نے کسی پیادہ رو اور سادہ دل انسان کے لئے اتنی کاوش، اتنی جستجو، ایسی وابستگی اور عقیدت، ایسے انہماک اور ایثار، ایسی تخلیقی صلاحیت کا مظاہرہ کبھی نہیں کیا۔

خدا حافظ خیر اندیش

سید حامد

(۲۵ر جنوری ۲۰۰۴ء)

○

آل حسن برنی بہ نام سید حامد

میں کراچی گیا تھا.......... دوران قیام یوسفی صاحب اور عالی صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ان ہی کے یہاں کھانے پر افتخار عارف امجد اسلام امجد اور چند دیگر شاعر و ادیب حضرات سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا۔ دونوں صاحبان آپ کو یاد کرتے تھے...... عالی صاحب کو مختلف عوارض نے گھیر رکھا ہے تاہم ان کی طبیعت کی جولانی اور گفتگو کی رنگینی بدستور موجود ہے اور لکھنے پڑھنے کا سلسلہ قائم ہے۔ انھوں نے مجھے اس کتاب ''کہیں اک گوشۂ بساط'' کہ جو

خاکوں، مضامین اور تاثرات کا مجموعہ ہے، مجھ کو عطا کی (اس میں ایک مضمون بہ عنوان ''یہ فرض ناتکمل'' (سید حامد پر بھی) شامل ہے...... عالی صاحب کی ظالمانہ صاف گوئی بعض کو منھ دکھانے کے لائق تو کیا منھ چھپانے کے بھی قابل نہیں چھوڑتی۔ آپ سے اور بھائی صاحب (سید ابن حسن برنی) سے دوستی کو وہ زندگی کا بیش قیمت اثاثہ سمجھتے ہیں۔ آپ کی اور بھائی صاحب کی ذات سے وابستہ کتنی پرانی یادیں ان کے ذہن میں تازہ ہیں اور وہ ان کو بشوق سناتے رہے۔ عالی صاحب نے مجھے اس کتاب کا پاکستانی ایڈیشن بھی عنایت کیا جو نجمہ محمود صاحبہ نے آپ پر لکھی ہے۔ عالی صاحب کی رائے اس کتاب کے بارے میں بہت اعلیٰ ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس نوعیت کی کوئی دوسری تصنیف اس معیار کی لکھی اور اتنی اچھی ترتیب دی ہوئی ان کی نظر سے نہیں گذری۔ یقیناً مصنفہ نے آپ کی ہمہ گیر شخصیت کے سارے پہلو نہایت عالمانہ انداز میں اُجاگر کیے ہیں۔ آپ کے محاسن بیان کرنے میں انھوں نے بلا شبہ Superlatives استعمال کیے ہیں لیکن باوجودیکہ مصنفہ کو آپ کی ذات سے انتہائی عقیدت ہے تاہم اس میں کسی طرح سے غلو شامل نہیں ہے کہ اس سے حقائق overshadow ہوتے ہیں۔ مقصد تو بیان کو مرصع بنانا ہے جس طرح بیش قیمت زیورات و جواہرات کو زیادہ presentable بنانے کے لیے جلا دی جاتی ہے۔ بہت سے لوگوں کا واسطہ آپ سے ایک سرکاری عہدہ دار کی حیثیت سے پڑا ہوگا۔ ان کو آپ نے ایک اچھے افسر کی پہچان دی ہوگی۔ کچھ نے آپ کو کھیلتے دیکھا ہوگا انھوں نے آپ کو ایک ہونہار کھلاڑی پایا ہوگا۔ کتنوں نے ذاتی مراسم اور قربت کی بنا پر آپ کو ایک مخلص اور ہمدرد دوست کہا ہوگا۔ ایسے مردم شناسوں کی بھی کمی نہ ہوگی جنھوں نے بہ حیثیت ایک۔ دانشور پہچانا ہوگا۔ بڑی تعداد میں ایسے بھی ہوں گے جو آپ کے بیشتر تعلیمی و معاشرتی کارہائے نمایاں سے واقف ہوں گے لیکن یہ پہچان آپ کی شخصیت کی الگ الگ تہوں کی ہوگی۔ لائق مصنفہ کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے آپ کی مکمل شخصیت کی ایک مربوط امیج ابھاری ہے۔ مصنفہ آپ کی لاتعداد صلاحیتوں اور خوبیوں سے بے حد متاثر ہیں۔ وہ آپ کو ہر پہلو سے ایک مرد کامل سمجھتی ہیں۔ وہ آپ کو سر سید کا ہم پلہ مانتی ہیں۔ وہ آپ کی ذات میں اقبال کے مرد کامل کا پرتو دیکھتی ہیں۔ اگر مصنفہ آپ کو غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل انسان نہ سمجھتیں کتاب کیوں اور کیوں کر لکھتیں اور وہ تاثر پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہوتیں جس میں وہ بدرجہ اتم کامیاب ہوئی ہیں۔ آپ کے اوصاف حمیدہ نے ان کو آپ

کا اتنا گرویدہ، عقیدت مند، خیر خواہ اور ہمدرد بنادیا کہ جب وہ آپ کے بارے میں concerned ہوتی ہیں تو وہ ان معاملات میں بھی دخل اندازی سے باز نہیں آتیں جن میں مداخلت آپ کی ناگواری کا موجب ہوسکنے کا احتمال تھا۔ کتاب اتنی فاصلانہ انداز میں لکھی گئی ہے کہ اس کو ختم کرنے پر پڑھنے والا آپ کی شخصیت سے مسحور اور مصنفہ کی علمی صلاحیت کا قائل ہو کر اٹھتا ہے۔ آپ کے ذکر اور مصنفہ کے بیان نے کتاب کو لافانی بنادیا ہے۔ مجھ کو دلی خوشی ہوئی اس کتاب کو پڑھ کر۔ میری جانب سے آپ کو اور مصنفہ صاحبہ کو پر جوش مبارک باد خوشی کے اس اظہار میں میں نے آپ کا خاصا قیمتی وقت ضائع کیا اس کے لیے معذرت خواہ ہوں—

بھابھی صاحبہ کو ہم سب کا آداب

فقط والسلام

آل حسن برنی

○

نجمہ محمود

مکرمی!

۳ رمئی ۲۰۰۵ء کے ''قومی آواز'' میں حکیم سید مہدی صاحب کا مراسلہ پڑھا مجھے محسوس ہوا کہ فاضل مراسلہ نگار پروفیسر شریف محمد خاں مرحوم کا تبصرہ (''قومی آواز'' مورخہ ۱۷ر اپریل ۲۰۰۵ء) پڑھ کر میری کتاب ''سید حامد کہ گم اس میں ہی آفاق'' کے بارے میں متجسس ہوئے ساتھ ہی الجھن میں بھی پڑے۔ تو ان کے تجسس کی تشفی کے لیے میں اپنی کتاب (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) ان کو جلد ہی بھیجوں گی۔ اور ان کی الجھن کو دور کرنے کے لیے یہ مراسلہ حاضر ہے۔ ورنہ میں کوئی ''پروفیشنل'' مراسلہ نگار نہیں ہوں (کہ وقت نہیں ہے)۔ یہ تبصرہ مارچ ۲۰۰۴ء میں ''شاعر'' میں شائع ہوا پھر میں نے اسے ''قومی آواز'' میں بھیج دیا جواب شائع ہوا ہے۔

اس کتاب کی علمی وادبی حلقوں میں پذیرائی ہوئی ہے۔ بہت سے خطوط آئے ہیں اور تبصرے شائع ہوئے ہیں۔ مثلاً مولانا سید رابع ندوی، مولانا عبدالوہاب خلجی، مولانا سالم قاسمی، احمد ندیم قاسمی، جمیل الدین عالی، جگن ناتھ آزاد، عرفان صدیقی، احمد سعید ملیح آبادی، محمد اسحٰق، حقانی القاسمی،

خلیق انجم، سید محمد اشرف، احمد عبدالحئی، حسن مسعود وغیرہ کے خطوط۔ جن صاحبان کے تبصرے شائع ہوئے ان میں سے چند کے نام ہیں محمد ثناء اللہ ندوی، حقانی القاسمی، محمد شریف خاں، سعید الظفر چغتائی، محمد اسحٰق، منور حسن کمال، عبدالمغنی، شمیم حنفی، شاہین مفتی، اشہد ندوی وغیرہ، انقلاب، ''نیشن اینڈ دی ورلڈ'' اور ''عالمی سہارا'' میں بھی تبصرے شائع ہوئے۔ اس کے اشتہارات، ''شاعر''، ''تہذیب الاخلاق''، ''کتاب نما'' اور ''راشٹریہ سہارا'' میں شائع ہوئے اور اتنی مدح سرائی میری کی گئی کہ میں اب تقریباً عاجز ہوں۔ یہ کتاب مکتبہ جامعہ دہلی، علی گڑھ اور ممبئی کی شاخوں، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، انجمن ترقی اردو نئی دہلی اور اردو وژن پبلی کیشنز علی گڑھ میں اگست ۲۰۰۳ء سے دستیاب رہی ہے۔ پاکستان میں جمیل الدین عالی نے (میری اجازت سے) اسے شائع کیا کہ بڑے مداح ہیں سید حامد صاحب کے۔ زبانی قصیدہ خوانی تو بہت ہوئی۔ شمس الرحمٰن فاروقی کو رائے جاننے کے لیے فون کیا بولے ''آپ نے حق ادا کر دیا'' گوپی چند نارنگ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک جلسہ میں مل گئے قصیدہ خوانی شروع کر دی "Magnum Opus" ہے یہ کتاب ''ہمیشہ سے زیادہ متاثر لگ رہے تھے مجھ سے۔

یہ سب کچھ فقط ایک نام کی وجہ سے ہوا اور وہ نام ہے سید حامد ورنہ میری کیا بساط۔ اب بتائیے اگر مرحوم شریف صاحب نے میری ''مدح سرائی'' کی تو ان کا کیا قصور تھا؟ کیا کیا جائے کچھ ماحول ہی ایسا بن گیا ہے۔ (فروغ اردو کاؤنسل نے ۵۰ کاپیاں خرید لیں) آپ اس سب سے سید حامد صاحب کی بے پناہ مقبولیت کا اندازہ لگائیں۔

مرحوم شریف خاں کا انتقال ۲۰۰۴ء کے اپریل میں کار حادثہ میں ہوا۔ ان کے انکسار اور سید حامد صاحب سے ان کی عقیدت، خلوص اور جذبۂ محبت کی انتہا تھی کہ وہ از خود تبصرہ لکھ کر (بغیر میری فرمائش کے) میری رہائش گاہ پر دے گئے وہ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ تعلیمات کے پروفیسر اور پرنسپل تھے۔ یوپی رابطہ کمیٹی کے مخلص اور فعال رکن تھے۔ سید حامد صاحب کے جاں نثاروں میں ان کا نام سرفہرست ہے) کتاب کے عنوان کی معنویت کے تحت انھوں نے بار بار ''سید حامد کی شخصیت'' لکھا ہے اور شخصیت ایک عارفانہ و مذہبی تصور ہے جو اپنے اندر سب کچھ سمیٹ لیتا ہے سوانح کارنامہ بھی۔ ادبیات عالم کا سب سے بڑا تصور۔ شخصیت یا انسان کامل کا تصور ہی رہا ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے حکیم علوم صاحب کو معلوم ہو جائے گا کہ شریف صاحب مرحوم نے اپنے تبصرے میں میری ''مدح سرائی'' کیوں کی ہے۔ دراصل یہ انھوں نے میری ہمت افزائی کی ہے تاکہ لوگ سچی تعریف میں بخل سے کام نہ لیں۔ یہ ان کی شرافت اور ایمانداری تھی۔ ویسے وہ کوئی پروفیشنل تبصرہ نگار نہیں تھے۔'' جذباتی استحسان کی بلندی کی وضاحت بڑی خوبصورتی سے انھوں نے اسی تبصرے میں کی تھی۔ مزید وضاحت کے لیے وہ اس وقت اس دنیا میں نہیں ہیں۔ سید حامد صاحب کی حمایت میں ان کی ہستی مثل ایک کوہ کے تھی جس کے لیے ہمت اور خلوص درکار ہے۔ (پہلے سے لے کر آخری پیراگراف تک ان کے یہ اوصاف مترشح ہیں)

ویسے میری کتاب کا جو بنیادی مقصد تھا وہ پورا نہیں ہوا کہ ہنوز ہندوستانی مسلمانوں میں قیادت کے فقدان کا رونا رویا جاتا رہا ہے۔ کم بصیرتی کے سبب ہمیں یہ نظر نہیں آتا کہ ملک کا سیاسی منظرنامہ معجزاتی طور پر تبدیل کیسے ہوا۔ فرقہ وارانہ ''سد بھاؤنا'' کیونکر پیدا ہوئی۔ رہا مسلم معاشرے میں اصلاح کا مسئلہ وہ ہمیں خود کرنا ہوگی راہیں وہ دکھا چکے ہیں، تعلیمی میدان میں ان کے کارناموں سے سب واقف ہیں۔ اور بھی بہت کچھ جس کا عموماً لوگوں کو علم نہیں یا چشم پوشی اور کیا چاہتے ہم ان سے؟ ہمیں وسیع القلب اور وسیع النظر ہونا چاہیے۔

(مراسلہ مطبوعہ 'قومی آواز' ۲۰۰۴)

○

○

''انسانِ کامل دکھی انسانیت کے لئے زندہ پیام رکھتا ہے حیاتِ انسانی کی بگڑی ہوئی قدروں کی اصلاح کرتا ہے''۔

(اقتباس از: ''سیّد حامد کہ اُس میں آفاق'')

''سید حامد کہ گم اس میں ہیں آفاق''

(تبصرے)

○

''اقبال کو وہ جذب کئے ہوئے تھے علم کی روح اُن میں سرایت تھی
.....ایک صاحب نے مسز گاندھی سے کہا کہ سیّد حامد شریف انسان
ہیں وہ یونیورسٹی کو کیسے چلا سکیں گے (گویا علمی ادارہ چلانے کے لئے
شرافت عیب گردانی گئی) جب معاشرہ اس نہج پر آجائے تو اس کی
زبوں حالی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے''۔

(اقتباس از: سیّد حامد کہ گم اُس میں ہیں آفاق'' ص:۷۹)

پروفیسر محمد شریف خاں

محترمہ نجمہ محمود نے جس جذبۂ انسانیت کے تحت سید حامد صاحب کے بارے میں اس تحریری مشن کا کام شروع کیا وہ ان کی اس جرات مندی کو ظاہر کرتا ہے جو انھوں نے بحیثیت معلّمہ طلبہ وطالبات کی تربیت کے لیے دکھائی۔ نجمہ محمود عام معلم/معلّمہ کے زمرے میں نہیں آتیں۔ انھوں نے بحیثیت معلّمہ اپنا ایک منفرد مقام بنایا جو اس دور میں کم ہی دکھائی دیتا ہے۔

سید حامد صاحب کے بارے میں لکھنے کے لیے جس حق وصداقت کی ضرورت تھی اس کا حق مصنفہ نے بڑی خوبی اور جرات کے ساتھ نبھایا۔ سید حامد صاحب کے بارے میں توصیفی الفاظ کا استعمال دوطرفہ خطرات کا باعث ہوتا ہے۔ ایک تو خود سید حامد صاحب ان کو غیرضروری سمجھتے ہیں دوسرے وہ حضرات جو تعصب اور تنگ نظری کی وجہ سے حقیقت سے نظریں نہیں ملا سکتے، وہ ہذیانی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

نجمہ محمود صاحبہ نے سید حامد صاحب کے بارے میں جس حق گوئی اور بے باکی کا اظہار کیا ہے وہ ان کے مضبوط اور واضح کردار اور تخلیقی قوت کا مظہر ہے۔ اگر قاری کو یہ بات نہ بھی معلوم ہو کہ اس کتاب کا مصنف کون ہے تو بلاشبہ قاری کسی مردِ آہن کو مصنف سمجھنے کی غلطی کر سکتا ہے۔

سید حامد صاحب کے بارے میں لکھنے کے لیے زبان کے معیار کا سوال بھی درپیش رہتا ہے۔ مصنفہ نے انگریزی کا پروفیسر ہونے کے باوجود اردو زبان کے وقار کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ بلند کیا۔ نجمہ محمود صاحبہ نے یہ کتاب لکھ کر ایسا حق ادا کیا ہے جس کی وجہ سے علی گڑھ کا تعلیم یافتہ طبقہ ناشکری کے الزام سے بچ گیا۔ مصنفہ نے سید حامد صاحب کی شخصیت کا احاطہ جس انداز سے کیا ہے وہ مصنفہ کی علمی دسترس اور صداقت کا ثبوت ہے۔ سید حامد صاحب کی شاعری کے سلسلہ میں پرکھ کے معیار کا مسئلہ اٹھا کر اپنے جواز میں جو تاثیر پیدا کی ہے وہ نہ صرف موثر ہے بلکہ دلکش بھی ہے۔ انھوں نے سید حامد صاحب کے بارے میں جو حوالے استعمال کیے ہیں وہ مستند ہیں۔ سید حامد صاحب پر مستقبل میں کام کرنے والے حضرات کے لیے یہ دستاویز کا کام دیں گے۔ سید حامد صاحب نے پوری زندگی جس احتیاط میں گزاری عام صورت میں مصنفہ کے لیے جذبات کے اظہار کا کوئی موقع نہ تھا لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ انھوں نے زبان کے استعمال میں بڑی ہوشمندی سے کام لے کر اپنی تحریر کو جذبات کے اظہار سے محفوظ رکھا۔

سید حامد صاحب کی شخصیت کے اظہار پر دسترس آسان کام نہیں تھا جب کہ خود سید حامد صاحب یہ نہیں چاہتے کہ کوئی ناقد ان پر حرفِ آخر ثابت ہو اور ان کی شخصیت احتیاط کے دائرے سے نکل کر عام ہو جائے لیکن نجمہ محمود صاحبہ کی ذہنی وسعتوں کا اندازہ بھی آسان کام نہیں ہے۔ انھوں نے جس مہارت کے ساتھ سید حامد صاحب کی شخصیت کا تجزیہ کیا ہے وہ جذبات کے اظہار کا کمال ہے۔ سید حامد صاحب کی شاعرانہ عظمت کے وقار کے لیے مصنفہ نے جن ذرائع کا استعمال کیا وہ ان کی تخلیقی صلاحیت اور شاعرانہ ذوق کا کمال ہے۔

مصنفہ نے سید حامد صاحب کی شخصیت کے اظہار میں جذباتی استحسان کی بلندی کا جو نمونہ پیش کیا ہے وہ مصنفہ کی علمی سنجیدگی اور سید حامد صاحب سے وابستگی کا مظہر ہے۔ ان تمام حقائق کے باوجود کتاب عام قاری کے معیار سے بلند ہے کتاب کا مطالعہ ہر سنجیدہ قاری کے لیے نہ صرف سودمند ہوگا بلکہ علی گڑھ سے متعلق معلومات کے لیے ایک بڑا ذریعہ ثابت ہوگا۔

کتاب کی طباعت دیدہ زیب، جلد مضبوط اور سرورق کا انتخاب تخیلات کی بلندی اور شاعرانہ انتخاب کا بہترین نمونہ ہے۔

(مطبوعہ 'قومی آواز')

پروفیسر عبدالمغنی

''سید حامد کہ گم اس میں ہیں آفاق'' نجمہ محمود کی تصنیف ہے۔ موضوع ہیں جناب سید حامد صاحب، سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور موجودہ چانسلر جامعہ ہمدرد۔ عنوان کتاب کا نصف حصہ مصرع اقبال کے اس مشہور شعر سے ماخوذ ہے جس میں مردِ مومن کی پہچان بتائی گئی ہے۔ مصنفہ نے اس حیثیت سے اپنے موضوع کا مطالعہ بھی وسیع پیمانے پر کیا ہے جس میں شخصی سوانح کے علاوہ علمی، انتظامی اور اخلاقی کمالات کا تفصیلی ذکر ہے۔

یہ کتاب بہت محنت اور جذبہ سے لکھی گئی ہے اس کی قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مختلف ابواب کے عنوانات اشعار سے ماخوذ ہیں اس میں بیشتر اقبال کے ہیں۔ اس سے اقبال کے ساتھ مصنفہ کی ذہنی وابستگی کا عکس کس حد تک موضوع کی شخصیت میں پایا جاتا ہے اس سوال کا جواب کتاب میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔

(مطبوعہ ''مریخ''، پٹنہ، فروری ۲۰۰۴ء)

پروفیسر سعید الظفر چغتائی

نجمہ محمود کی ۴۶۶ صفحات، ۲۱ ابواب اور دو حصوں پر مشتمل کتاب کا عنوان قدیم منطق کا یہ مسئلہ اقبال کے الفاظ میں ''مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق'' (کبرا) سید حامد مرد مومن ہیں (صغرا) اس لیے ''سید حامد کہ گم اس میں ہیں آفاق'' سامنے لاتا ہے۔

موصوف بلاشبہ کثیر الابعاد شخصیت کے مالک ہیں۔ ہاکی وٹینس کے معروف کھلاڑی، منتظم، مصلح، شاعر، دانشور، ادیب اور ناقد ادب۔ خاندانی حالات اور بچپن سے آئی اے ایس عہدہ دار کی کارکردگیوں تک ان کی زندگی مصنفہ نے انھیں کی تحریروں کے ذریعہ پیش کی ہے جس میں بیچ بیچ میں ان کے تبصروں کی پیوندکاری بھی ملتی ہے۔ پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے ۱۹۸۰ء-۱۹۸۵ء تک ان کی زندگی کے پانچ برسوں کا اجمالی بیان ہے جب انھوں نے ''سر سے کفن باندھ کر'' یونیورسٹی کے بگڑے حالات درست کرنے اور اس کا معیار بلند کرنے کی انتھک کوشش کی اور جس کے خاتمہ پر ایک طرف مخالفوں نے ''یوم نجات'' منایا اور دوسری طرف ڈاکٹر امریک سنگھ نے ٹائمس آف انڈیا کے پورے دو کالم میں A Salute to a Doer لکھ کر خراج تحسین پیش کیا۔

یہاں سے فارغ ہو کر سید حامد نے ہمدرد یونیورسٹی قائم کرنے اور تعلیم آباد بنانے میں حکیم عبدالحمید کے خوابوں کی تعبیر مہیا کی اور تعلیمی کارواں نکالے۔ ان کی ایسی کوششیں پیرانہ سالی میں بھی ہنوز جاری ہیں۔ مصنفہ نے یہ سب باتیں تفصیل، عقیدت اور شاعرانہ نثر میں بیان کی ہیں۔

سید حامد کی غزلوں کا مجموعہ 'لمحات' اور نظموں کا 'شیرازہ' برسوں سے منظر عام پر ہیں۔ نجمہ نے صوفی مفکروں اور انگریز شاعروں کے تقابل میں ان کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اشعار کا بارہ صفحے میں انتخاب پیش کیا ہے اور نظموں میں حمد، نعت، تشنہ لبی، مثنوی سحر عشق، خانہ بدوش کا گیت، سفینہ اور شریک حیات کے انتظار میں وغیرہ پر تفصیل سے لکھا ہے۔

سید حامد نے علی گڑھ سے ماہوار 'تہذیب الاخلاق' کی تجدید کرنے کے بعد سے اس میں بلاناغہ ایک دانشورانہ مضمون لکھا ہے۔ کچھ رشحات قلم قومی آواز وغیرہ میں بھی شائع کرائے۔ اب وہ ''ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل'' وغیرہ مجموعوں میں اکٹھا چھپ گئے ہیں۔ انھوں نے دہلی سے Nation & the world کے نام سے پندرہ روزہ اخبار نکالا تو اس میں بھی بہت سے شذرے اور مضامین چھاپے۔ مصنفہ نے ان کا جائزہ بھی لیا ہے۔

سید حامد کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''نگار خانہ رقصاں ہے'' جو مصحفی کی شاعری پر ان کے تحسینی مضمون کا عنوان ہے۔ اچھا ہوتا کہ مجموعہ کا نام الگ سے رکھا جاتا، جس میں مصحفی کے علاوہ آتش، ذوق، رشید احمد صدیقی، حسرت، جوش ملیح آبادی، خواجہ حسن نظامی اور اقبال پر اچھے مضامین شامل ہیں۔ نجمہ محمود نے ان مضامین پر لکھتے وقت ہمارے صوفیوں اور انگریز شاعروں، ناقدوں کے حوالے بھی دیے ہیں۔

ان کے علاوہ مصنفہ نے سید حامد کے خطوط اور ان کی گفتگو کے حوالے سے ان کے ساتھ اپنے ادبی، علمی اور عقیدت مندانہ روابط کا اظہار کیا ہے۔ لکھ دیا ہے کہ پڑھنے والے اس باب میں معروضیت نہ ڈھونڈیں۔ کتاب کا اسلوب نگارش شاعرانہ اور جذباتی ہے مگر اس میں حقائق کے دستاویزی ثبوت مہیا کیے گئے ہیں اور یوں بھی کتاب حالات حاضرہ پر ہے، جن میں سے اکثر ہم نے اپنی آنکھوں دیکھے ہیں۔ بعض لوگ کتاب میں سنجیدہ اختصار نویسی نہ پاکر مایوس ہوں گے مگر دوسرے لوگ انگریزی زبان وادب کی استانی اور اردو وانگریزی شاعری ونقد کی گہری طالبہ کے ذاتی تاثرات سے بھرپور اس تحریر سے لطف اٹھائیں گے، جس کا ہر جملہ کہتا ہے:

لذیذ بود حکایت دراز تر خواندیم

(مطبوعہ کتاب نما، اردو بک ریویو)

○

تبصرہ ''انقلاب''، ممبئی

سید حامد کا نام محتاج تعارف نہیں۔ فی زمانہ ملت اسلامیہ ہند کے چند مخلصوں، مفکروں اور مدبروں میں ان کا شمار اول اول کیا جاتا ہے۔ علی گڑھ سے گذشتہ دنوں ان پر شائع ہوئی ہے جسے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی استاد پروفیسر نجمہ محمود نے قلمبند کیا ہے جس میں سید حامد کے علم وکمال اور شخصیت کی تفہیم نہ صرف ایک سلیقہ سے کرنے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ اس میں محترمہ نے بڑی عرق ریزی سے بھی کام لیا ہے اس طرح کا کام سچے جذبے اور استقلال کے بغیر انجام پذیر نہیں ہوسکتا۔ یہ کتاب نہ صرف سید حامد کی شخصیت اور افکار کو ہی پوری طرح روشن کرتی ہے بلکہ اس میں نجمہ محمود بھی نمایاں ہوگئی ہیں۔

یہ کام وقعت کی نگاہ سے دیکھے جانے کے قابل ہی نہیں بلکہ اس سے استفادے کے چراغ بھی جلائے جانے چاہئیں۔ یہ کتاب اپنے آپ میں ایک منارۂ نور جیسی ہے کہ جو چاہے اس کی روشنی میں اپنے لیے راہ تلاش کر لے۔ یہ اور بات ہے کہ تلاش کرنے والوں کو نور میں بھی ظلمت نظر آ جائے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جو تم تلاش کرو گے وہی تمہیں ملے گا۔

محترمہ نجمہ محمود نے اس کتاب میں اجالوں کے در کھول دیے ہیں پڑھنے والے کو خلوص کے ساتھ اپنی بصارت سے کام لینا ہوگا جس کے نتیجہ میں اسے بصیرت یقیناً ہاتھ لگے گی۔

○

شمیم حنفی

پروفیسر نجمہ محمود علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ویمنس کالج میں انگریزی زبان و ادب کا درس دیتی تھیں۔ انھوں نے افسانے لکھے ہیں، شعر کہے ہیں، ادبی اور تہذیبی موضوعات پر اردو اور انگریزی میں ان کے کئی مضامین اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ سید حامد کہ گم اس میں ہیں آفاق ان کا تازہ ترین تصنیفی کارنامہ ہے اسے سید حامد صاحب کی سوانح سے زیادہ ان کی شخصیت کا مرقع کہنا چاہیے۔ حامد صاحب کی ادبی، تہذیبی، تعلیمی اور فکری سرگرمیوں کی روداد اس کتاب میں مصنفہ نے بہت خوش اسلوبی سے بیان کی ہیں۔ اپنے موضوع سے جذباتی اور ذہنی مناسبت کی وجہ سے عقیدت کا رنگ کہیں کہیں گہرا ہو گیا ہے لیکن مجموعی طور پر اس کتاب سے ہمارے زمانے کی ایک انتہائی دلآویز اور معروف سماجی شخصیت کا خاکہ رونما ہوا ہے۔ حامد صاحب کی زندگی جن مقاصد کے لیے وقف رہی ہے اس کا سب سے اہم پہلو حامد صاحب کی قومی دردمندی اور اپنی قوم کی اصلاح وترقی کا جذبہ رہا ہے۔ نجمہ محمود صاحبہ نے حامد صاحب کی شخصیت کے اس پہلو کو اچھی طرح اجاگر کیا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے لے کر ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی تک حامد صاحب کی سرگرمیوں کا میدان خاصا وسیع رہا ہے اور یہ کتاب بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس کا احاطہ کرتی ہے۔

(مطبوعہ ملی گزٹ، دہلی)

○

ڈاکٹر حقانی القاسمی

کسی نابغۂ روزگار اور سالم شخصیت کی سمفنی اور آہنگ کو اظہاری تجسیم عطا کرنا گویا جوئے شیر لانا ہے۔اس عمل کے لیے دشت کے قیس کا جنون اور کوہ کے فرہاد کی جد و جہد درکار ہے۔

لطف حیرت یہ ہے کہ قیس و فرہاد کا حسن امتزاج ایک خاتون میں نظر آیا جنھیں خدا نے ''مقدس دیوانگی'' بھی عطا کی ہے اور جہد محکم، عمل پیہم کا پیکر بھی بنایا ہے۔ نجمہ محمود اس پیکر جمیل کا نام ہے، جنھوں نے نثری بیانیے میں ایک خوبصورت شعری تخلیق کی تشکیل کی ہے۔ایک دائروی شخصیت کی صفات حمیدہ پر محیط اس تخلیق کی جو فکری، اسلوبی، اظہاری جمالیات ہیں وہ قاری کو مسحور کردینے کے لیے کافی ہیں۔انھوں نے اپنے جذبات، احساسات، تفکرات کے موج مضطرب کو جس خوش سلیقگی سے اظہار کے سانچے میں ڈھالا ہے اس کے لیے ذہنی دراکی اور تخلیقی وفور ناگزیر ہے۔ نجمہ محمود کے ہاں جو تخلیقی ابال ہے اس کا مکمل انعکاس اس کتاب میں ہوا ہے، جس کا نام ہے ''سید حامد کہ گم اس میں ہیں آفاق''

چار سو چھیاسٹھ صفحات پر محیط اس کتاب میں ایک ایسے دردمند اور صاحب سوز شخص کی داستان دراز تر ہے، جس نے خلقت کو مختلف نہج سے فائدہ پہنچایا ہے۔فیض آباد کے فرزند اور سید مہدی حسن اور ستارہ شاہجہاں بیگم کے خلف الصدق نے زندگی کے تمام تر میدان میں جو امتیازی نقوش مرتسم کیے ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔ان کی انتہائی مربوط، متوازن، غیر منقسم شخصیت سے پوری دنیا آگاہ ہے۔

وہ کسری آدمی نہیں ہیں بلکہ ہمارے عہد میں پورے آدمی کی شناخت ان کے بطور کی جاسکتی ہے۔ یہی وہ پورا آدمی ہے، جنھیں اقبال نے مومن کامل کہا ہے اور اسی مومن کامل کی تمام تر نشانیاں ہمیں سید حامد کی بھی شخصیت میں نظر آتی ہیں۔اسی لیے نجمہ محمود نے اپنی کتاب کا عنوان ہی ایسا رکھا ہے، جس سے سید حامد کی اکملیت اور آفاقیت ہویدا ہے .... گو کہ کچھ متوحش افراد ان میں ایطائے جلی/ ایطائے خفی اور تعقیدِ جلی تلاش کرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ سید حامد کی شخصیت ہزار پہلو ہے اور ان سے ملک و قوم کو بے پناہ فیض بھی پہنچا ہے ان کے اندر جو الوہی اضطراب ہے، ماورائی نور ہے اس کے شاہد عدل ان کے مقالات، خطبات اور دیگر رشحات ہیں۔ ان کے سینۂ سوزاں میں قوم، ملت، وطن، زبان، تہذیب کا درد پنہاں ہے۔ان کا درد جب لفظوں کی صورت

ظہور میں آتا ہے تو آنکھیں جیجوں بن جاتی ہیں اور دل شعلہ سوزاں۔ان کی ہر تحریر رگ جاں کو کاٹتی آگے بڑھتی ہے۔ایسے مجمع الکمالات، مخزن الفضائل شخصیت سے آگہی انتہائی ضروری ہے۔

پروفیسر نجمہ محمود نے بہت اچھا کیا کہ سید حامد کی کثیر العبادی شخصیت کو اپنا موضوع بنایا اور اپنا سارا لہو نچوڑ کر رکھ دیا اور سید حامد جیسے مشعل بہ کف اور قندیل بہ چشم شخص سے ایک ایسی دنیا کو آگاہ کرایا جو ناقدری میں نظیر نہیں رکھتی، جوہر کی شناخت جس کا شیوہ نہیں۔ایسے بحرانی دور میں سید حامد کی ہمہ جہت شخصیت سے متعارف کرانا کارفرہاد سے کم نہیں۔

یہ کتاب سید حامد کے شخصی اوصاف، علمی کمالات، ادبی فتوحات پر محیط ہے مگر یہ کتاب محض کتاب المناقب نہیں ہے بلکہ اس میں عرفان وآگہی، علام ومعارفہ کی لہریں موجزن ہیں اس میں سید حامد کے ساتھ ساتھ انفاس العارفین سے بھی ملاقاتیں ہوجاتی ہیں اور ان اخیار سے بھی آشنائی ہوجاتی ہے جو خفتگان خاک ہیں۔اس کتاب میں تہذیبی، ثقافتی، ادبی، معاشرتی، سیاسی اور مذہبی تاریخ کا تسلسل بھی ہے کیونکہ سید حامد کی شخصیت میں جو لہریں ہیں ان کا رشتہ ازمنہ ہائے قدیم کی تاریخ، تہذیب اور ثقافت سے بھی ہے۔سید حامد کی علمی، فکری شخصیت سے تو پوری دنیا آگاہ ہے مگر ان کی تخلیقی شخصیت سے آگاہی کم ہی لوگوں کو ہے۔محترمہ نجمہ محمود نے ان کی شخصیت کے اس پہلو کو بھی نمایاں کیا ہے اور ان کی شاعری اور تنقید کے حوالے سے جو معروضی اور منطقی رائے پیش کی ہے اسے کوئی مسترد کرنے کی جرات نہیں کرسکتا۔ان کی تنقیدی شخصیت کے تعلق سے پروفیسر نجمہ محمود یہ حیرت زدہ انکشاف کرتی ہیں کہ سید حامد کی تنقید آرنلڈ کی تنقید کی یاد تازہ کرتی ہے اور یہ کہ ان کی تنقید کیٹس کے طرز کی ہے جو زود ادراکی، جوش، شگفتگی اور فطری سادگی سے عبارت ہے۔

سید حامد نے نگارخانہ رقصاں میں جن ادبی شخصیات کی تخلیقی حرکیات پر قلم اٹھایا ہے وہ شخصیات ہماری ادبی روایات کا غیر منفکہ حصہ ہیں۔انھوں نے اپنے مضامین میں جس تخلیق شناسی، ادب فہمی کا ثبوت دیا ہے اس سے ہمارے بہت سے نقاد بھی محروم ہیں۔

ان کی تخلیق شناسی کا منہج اور معیار مختلف ہے یہی وجہ ہے کہ پروفیسر نجمہ محمود نے ان کی تنقید کو تخلیق قرار دیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ عام فرسودہ پیرامیٹرز سے انھوں نے ادب کی تعین قدر نہیں کی بلکہ نئے طور پر سوچا اور نئے زاویے تلاش کئے ہیں۔سید حامد کا ہر کام اکملیت کا استعارہ ہے۔تنقید ہو

یا تخلیق، ملی مسائل، سیاسی مباحث پر مضامین ہوں یا کچھ اور وہ لکھتے وقت مالہ و ماعلیہ پر غور وفکر کرتے ہیں تب کسی نتیجہ کا استخراج کرتے ہیں۔ یہی استخراجی طریقہ کار ان کے نقد میں بھی نمایاں ہے۔

پروفیسر نجمہ محمود کی یہ کتاب ہر لحاظ سے مکمل ہے اور اس کتاب سے ان کے تنقیدی و تخلیقی وجود کے روشن امتیازات سے آگہی ہوتی ہے۔ انھوں نے زبان کے فطری پن کو بحال رکھا ہے۔ بغیر کسی تصنع اور تکلف کے اپنے جذبات اور احساسات کو خوبصورت پیکر میں ڈھال دیا ہے۔ اس کتاب سے صرف سید حامد کے شخصی، فکری ابعاد کی تفہیم میں ہی مدد نہیں ملے گی بلکہ مشرق و مغرب کے بہت سے دانش وروں اور تخلیق کاروں کے افکار و نظریات سے بھی آگاہی ہوگی۔ تصوف، تاریخ، تہذیب کے بہت سے تصورات سے بھی آشنائی ہوگی۔

یہ کتاب محض ایک شخص پر مرتکز تذکار نہیں ہے بلکہ اس شخص کے بہانے ہمارے علمی، ثقافتی، سماجی، عمرانی، سیاسی اور روحانی تاریخ بھی اس میں سمٹ آئی ہے اس لیے یہ تذکرہ نہیں بلکہ ایک تہذیب و تاریخ ہے اور تہذیب و تاریخ سے آگہی ہمارا اولین فریضہ ہے۔

پروفیسر نجمہ محمود مبارکباد کی مستحق ہیں کہ انھوں نے اسلوب جمیل و جلیل کے جادو سے بہت سے قارئین کو مسخر کرلیا ہے اور ہمارا سینہ مشارق الانوار سے منور کر دیا ہے۔

(مطبوعہ: 'اخبار مشرق'، جون ۲۰۰۴ء)

○

ڈاکٹر شاہین مفتی

سید حامد کا شمار ہندوستان کے ان معدودے چند پُر خلوص مفکروں، باکردار مدبروں اور مردانِ کار میں ہوتا ہے جو انسانیت کی گم کردہ اکائی کو از سرِ نو تشکیل دینا چاہتے ہیں۔ اس کارِ خیر کے لیے وہ کاسۂ گدائی تھام سکتے ہیں، عوام کی ناقدری برداشت کرسکتے ہیں، اسٹیج پر اسوانگ بھر سکتے ہیں اور اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر ملتِ اسلامیہ کو عارفانہ بصیرت اور عالمانہ آگہی عطا کرنے کا خواب دیکھ سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے انہیں علی گڑھ کا سرسید ثانی کہنا بیجا نہ ہوگا۔ سید حامد نے ۱۹۳۷ء، تا ۱۹۴۲ء علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۴۳ء میں پروونشل سول سروس، پھر ۱۹۴۹ء میں آئی۔ اے۔ ایس آفیسر کی حیثیت سے ۱۹۸۵ء تک مختلف مناصب سے وابستہ رہے۔ ۱۹۸۰ء، تا

۱۹۸۵ء علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ ۱۹۸۲ء میں تہذیب الاخلاق کی تجدید کا بیڑا اٹھایا۔ ازاں بعد مرحوم حکیم عبدالحمید کے ساتھ مل کر جامعہ ہمدرد کو یونیورسٹی کا درجہ دلایا۔ ان دنوں وہ جامعہ ہمدرد کے چانسلر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

سید صاحب کی انتظامی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ان کی وہ خدمات بھی دامن دل اپنی طرف کھینچتی ہیں جو اردو ادب، شاعری، تنقید، اقبال پسندی اور تاریخی سیاق وسباق سے علاقہ رکھتی ہیں۔ لمحات، کرب آگہی، شیرازہ اور نگارخانۂ رقصاں ان کی عارفانہ اور عالمانہ گرفت کی فسوں سازی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

ہندوستان میں اقلیتی امور کی نزاکتوں کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ایک ایسے تناظر کا آرزومند ہے جو مصلحت، گروہ بندی، مفاد پرستی اور طالع آزمائی سے مبرا ہو۔

نجمہ محمود نے، جن کا اپنا تعلق بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ہے، شخصیت سازی کے عمل کو زندہ رکھنے کے لیے سید حامد کو اپنے ممدوح کا درجہ دیا ہے۔ اقبال کے انسان کامل اور ورجینیا وولف کے سپرمین سے نجمہ بہت متاثر ہیں۔ وہ تخلیقی سطح پر شاعر، افسانہ نگار اور تنقید نگار ہیں۔ اعلیٰ اقدار کی ترویج اور نجات دہندہ کے خواب نے نجمہ کو سید حامد کی شخصیت کے گرد پروانہ وار گھومنے کا تجربہ کرنے میں کافی مدد دی ہے۔ محبت اور عقیدت کے دوچار مشکل مقامات میں ایک مقام وہ بھی آتا ہے، جس کی حدیں مغلوبیت اور فنافی الذات ہونے کے احساسات کی ترجمانی کرنے لگتی ہیں۔ اسی مشکل مقام پر نجمہ محمود کے تخلیقی نظریات سے آگہی ضروری ہے، وہ لکھتی ہیں:

”تحقیق میکانکی عمل نہیں۔ اس کے سرچشمے اندرون سے پھوٹتے ہیں۔ یہ ایک فطری جذبہ جس کے پس پردہ جستجو ہے۔ بے زنجیر جستجو...... ایک روشن خیال، اندرونی اُپج، تخلیقی عمل...... گہرائیوں میں اتر کر وہ موتی نکالنے کی کوشش جن تک کسی کی رسائی نہ ہوسکی۔“

نجمہ کا خیال ہے کہ ان کی تصنیف ”سید حامد — کہ گم اس میں ہیں آفاق“ ایک دائرٔدی شخصیت کا مطالعہ ہے، جس کی تفسیر بھی دائرٔدی وژن کے ساتھ ہونی چاہیے۔ مصنفہ نے کتاب کو اکیس ابواب پر تقسیم کیا ہے اور بیشتر عنوانات کے لیے اقبال کے مصرعے استعمال کیے گئے ہیں۔ سید حامد کی ذاتی زندگی سے اجتماعی زندگی تک نجمہ بڑے احترام سے اپنے ممدوح کے ہمراہ رہی

ہیں۔ سید صاحب کے انگریزی، اردو مضامین، تقاریر، علی گڑھ یونیورسٹی کی سازشیں، ارباب اقتدار کی تکلیف دہ عنایات، یہ سب کچھ ہم اہل علم اور اہل اسلام کے لیے مطالعے کی خاص چیز ہیں۔ حامد صاحب اور اہل خانہ کی تصاویر، حامد صاحب کا طویل انٹرویو، زندگی کے بارے میں ان کے مثبت افکار ہندوستان کے دل برداشتہ مسلمانوں اور خصوصاً اردو زبان کی سرپرستی کرنے والوں کے لیے درماندگی اور ناخواندگی کی فضا میں ایک مژدۂ جانفزا ہیں:

نجمہ محمود اور سید حامد کے ذہنی اشتراک نے کتاب میں مانوسیت کی جس فضا کو جنم دیا ہے اس کی بنیاد سراسر خلوص اور رواداری پر رکھی گئی ہے۔ ذاتی طور پر مجھے کتاب کا وہ باب بہت دلچسپ لگا ہے، جس میں سید صاحب کی شاعری کا انتخاب شامل کیا گیا ہے:

محفل میں ان کی لے کے گئے تھے قبائے ہوش
آئے ہیں تار تار گریباں لیے ہوئے

نجمہ محمود نے اپنے ممدوح کے توسط سے ان کی کتاب نگارخانۂ رقصاں کو ایک نغمگی، ایک آہنگ، کھوئی ہوئی جنت کی بازیافت اور زندگی کو خوبصورت دیکھنے کی خواہش قرار دیا ہے۔ نجمہ کا کہنا ہے کہ ارضیت اور ماورائیت کا امتزاج ہی بشر ہے۔

محبت اور احترام سے لبریز چار سو پینسٹھ صفحات کی اس کتاب میں آپ بھی اسرار کائنات اور نور آتش کدۂ فکر سے روشن دماغ سید حامد کے ساتھ کچھ وقت گزار سکتے ہیں۔ نجمہ نے اروند گھوش کی نظم ''ساوتری'' کی یہ سطور ایسے ہی خاص لوگوں کے لیے درج کی ہیں:

جیسے کہ ایک تنہا ستارہ آسمان میں حرکت کرتا ہے
خلا کی بیکرانیوں سے متحیر ہوئے بغیر
اپنی ہی روشنی کے ذریعے فضا کی بیکرانیوں
میں گرم سفر رہتا ہے، اسی طرح عظیم لوگ
تنہا ہی انتہائی طاقتور ہوتے ہیں

(مطبوعہ: ''فنون'' لاہور، مئی-اگست ۲۰۰۴ء)

○

پروفیسر ثناء اللہ ندوی

حرف اول

''سید حامد کہ گم اس میں ہیں آفاق''

اردو ادب اور تنقید کا موجودہ نگار خانہ نیرنگیوں سے معمور ہے۔ نیرنگیاں ادب اور تنقید میں کبھی تو آذری اور سحر کاری کا نتیجہ ہوتی ہیں جس کو صادق احساس، کھرے زاویۂ نگاہ اور راست باز تنقید کے لیے فال نیک نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن نیرنگیاں اگر براہیمی سوچ اور انداز کلیمانہ کی حامل ہوں تو اس سے ادب اور تنقید کی تکریم کا سامان فراہم ہوتا ہے۔ ایسا ادب ہمارے قوائے فکر اور جمالیاتی شعور کو بالیدہ کرتا ہے۔ ہماری عقل اور استدلالی آگہی کو غنوص اور وجدان کے حظیرۃ القدس میں باریاب کرتا ہے۔ ایسا ادب روایتی نہیں ہوتا اس کی تخلیق کرنے والے بت شکن یا بت گر نہیں ہوتے۔ انھیں بابل یا مصر کی اسیری راس نہیں آتی۔ وہ حقیقت فہم ہی نہیں حقیقت بیں بھی ہوتے ہیں جن کے احساس، شعور اور آگہی میں الواح موسیٰ کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ پروفیسر نجمہ محمود ایک ایسی ہی حقیقت بیں تخلیق کار اور نقاد ہیں جو اپنی تحریروں میں آیات انفس و اسرار کائنات کا دل نواز جلوہ قاری کو دکھاتی ہیں۔ اپنی انگریزی کتابوں خصوصاً دائرے سے نقطہ تک اور ورجینیا وولف کی تحریروں میں انسان کامل کا تصور میں جس انداز سے انھوں نے حقیقت کی تفہیم کی ہے وہ ان کی فکر بلند آہنگ اور ذوق رسا کا آئینہ دار ہے۔ پانی اور چٹان میں انھوں نے تخلیقی ادب کو نئی بلندیوں تک لے جانے کی کوشش کی ہے۔ اور زیر نظر کتاب سید حامد کہ گم اس میں ہیں آفاق مصنفہ کی اس تنقیدی سوچ اور سوانحی پرکھ کی عکاسی کرتی ہے جو اپنے کردار میں مصلحت کیش نہیں ہوتی بلکہ معروضیت کی حامل حقیقت فہمی کے لیے مراقبہ کا درجہ رکھتی ہے۔ اس پرکھ کا موضوع سید حامد کی شخصیت ہے جس کی تفہیم کے لیے اہل قلم کے متعدد مضامین موجود ہیں لیکن زیر نظر کاوش اس موضوع پر پہلی باضابطہ اور مکمل تصنیف ہے۔

سید حامد کا شمار ملت کے معدودے چند پرخلوص مفکروں، باکردار مدبروں اور مردان کار میں

ہوتا ہے۔ ایسے افراد تاریخ کی کوکھ سے اس وقت جنم لیتے ہیں جب انسانیت کی کسی گم کردہ اکائی کو اس کے فرائض منصبی کی یاددہانی کی ضرورت ہوتی ہے یہ قلندر صفت انسان ملت کی تعمیر کے لیے کاسۂ گدائی بھی تھام سکتے ہیں عوام کی ناقدری بھی سہہ سکتے ہیں اور یہ اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کے بعد ایسے انسان معمار قوم کہلاتے ہیں۔ برصغیر ہندوپاک میں سرسید احمد خاں ایسے ہی انسان تھے۔

آج کے ہندوپاک کا باشعور، تعلیم یافتہ اور معزز مسلمان سرسید کی معنوی اولاد نہیں تو اور کیا ہے؟

سرسید کی معنوی اولاد کی فہرست طویل یا مختصر ہوسکتی ہے مگر آج کے دور میں کسی کو اگر سرسید ثانی (بجا یا بیجا طور پر؟) کہا گیا ہے تو وہ سید حامد ہیں جو بلاشبہ سرسید کی متاع حیات کے کچھ حصوں کے وارث و امین ہیں۔ عالمانہ آگہی، عارفانہ بصیرت اور مجاہدانہ سعی وعمل پیہم نے سید حامد کو جدید ہندوستان میں خادم ملت اور معمار قوم کے منصب پر فائز کیا ہے جب مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیوں میں شان مخدومی کے حامل مسلمان سب سے آگے ہیں۔ سید حامد کی شخصیت تہہ دار بھی ہے اور طرحدار بھی۔

......یہ درست ہے کہ انسانی افکار تاریخ کے سیاق وسباق سے بڑی حد تک الگ نہیں کیے جاسکتے لیکن احوال اور ایج کا تصور اگر اپنی جگہ درست ہے تو پھر تاریخی تسلسل کا آسیب شخصیت فہمی کے لیے صحت مند نہیں ہوسکتا۔ ہر انسان کا اپنا وجود اپنی سوچ اور اپنا کردار ہوتا ہے۔ اقبال کی عظمت اس میں پوشیدہ نہ تھی کہ انھوں نے رومی یا عطار کا زمزمہ سنایا یا برگساں کے وجدان کو اپنی شاعری میں جگہ دی تھی۔ اقبال کی عظمت اقبال کی ذات میں تھی۔ سرسید اپنی ذات میں سرسید تھے۔ ہمارا تصور یہ ہونا چاہیے کہ سید حامد سید حامد ہیں اور نجمہ محمود نجمہ محمود۔ اگر ہمیں یہ اصرار ہو کہ سید حامد عکس سرسید ہیں اور نجمہ محمود سید حامد کا فقط سایہ تو یہ تقاضائے انصاف سے دور ہوگا۔

......سید حامد کوئی پیشہ ور ادیب نہیں اور نہ ہی ادب ان کے لیے ذریعۂ عزت۔ وہ اپنی آگہی کے کرب کو خون جگر سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتے ہیں کہ شاید کوئی ہمدرد مل جائے جو ان کے ساتھ نالہ کش ہو۔ جگر لخت لخت تحریر آورد نہیں ہوتی اس کا کوئی خاص اشتہار، مکتب فکر مخصوص بینر نہیں ہوتا لیکن خوبصورت زبان، دلنشین اسلوب اور اچھوتا بے تکلف طرز تخاطب اس انداز خسروانہ کے حامل نہیں جو قاری کے دل ودماغ کو اسیر کرلیتا ہے۔

سید حامد کی لمحوں پر عارفانہ گرفت کا جو اظہار ان کے مجموعۂ کلام 'لمحات' اور 'شیرازہ' میں ہمیں نظر آتا ہے اور نگارخانہ رقصاں میں انھوں نے تنقیدی بصیرت کی جو قندیلیں روشن کی ہیں وہ ان کی طرحدار ادبی شخصیت کی آئینہ دار ہیں۔ کسی غیر پیشہ ور ادیب اور دانشور کی تفہیم کا کام میں نہیں سمجھتا کہ کوئی پیشہ ور ادیب کر سکتا ہے۔ ادب وتنقید کے سوداگر، فسوں ساز دانش ور اور مصلحت کیش ارباب سیاست کیا جانیں کہ جگر سوزی کیا ہے۔ ایک ماں ہی جانتی ہے کہ دردزہ کسے کہتے ہیں...... سید حامد جیسی شخصیت کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے اولیں شرط یہ ہے کہ ہم اور آپ تھوڑی دیر ہی کے لیے سہی اپنی ذات، گروہ بندی، مصلحت بینی اور مفاد پرستی سے اوپر اٹھیں اپنے ذہن کو سماج وملت اور پوری انسانیت کے حوالہ سے سوچنے کا عادی بنائیں۔ ہندوستان میں اردو، انگریزی دانشوری اور تخلیقی وتنقیدی دنیا میں متعدد دل سوز وفکر انگیز تصانیف، فن پاروں اور تحریروں سے اپنی پہچان آپ بنانے والی پروفیسر نجمہ محمود نے بجا طور پر تفہیم حامد کا بیڑا اٹھایا ہے اور ان کی ہمنوائی کی ہے۔

پروفیسر نجمہ محمود اس سے پہلے بھی سید حامد کی شخصیت کے تنقیدی پہلوؤں پر نگارخانہ رقصاں کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کر چکی ہیں۔ مصنفہ نے سید حامد کہ گم اس میں ہیں آفاق میں جس طرح موضوع کے مختلف پہلوؤں (نمود از خاک سے لے کر تعلیم، سرکاری ملازمت، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری، جامعہ ہمدرد سے وابستگی، تعلیم آباد کی تشکیل، قومی وملی خدمات، ادبی و تنقیدی کاوشیں، شعری تخلیقات وغیرہ) سے متعلق مواد کا احاطہ خود سید صاحب کی مطبوعہ وغیر مطبوعہ تحریروں، نجی خطوط اور متعدد ملاقاتوں اور گفتگو سے کیا ہے اس سے ان کی یہ کاوش بڑی حد تک authorized بن جاتی ہے جس کے مشمولات کی مجلسی، ادبی اور تنقیدی قدر وقیمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ خود سید صاحب کے بقول تفہیم سید حامد کے لیے 'نگارخانۂ رقصاں' پر مصنفہ کے طویل مقالہ کا مطالعہ ضروری ہے۔

اردو کی موجودہ ادبی سوانحی اور تنقیدی منظرنامہ میں اس طرح کے کام کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا جانا چاہیے۔ امید کی جاتی ہے کہ ایوان ہائے اردو میں اس کاوش کو شرف پذیرائی سے نوازا جائے گا۔

(مطبوعہ: "سید حامد کہ گم اس میں آفاق" ۲۰۰۳ء)

○

اشہد رفیق ندوی

''سید حامد کہ گم اس میں ہیں آفاق'' کو نجمہ محمود نے خون جگر سے رقم کیا ہے۔ یہ ملت کے ایک عظیم محسن کی خدمات کا اعتراف اور خراج عقیدت ہے۔ جس طرح سید سلیمان ندوی نے ''حیات شبلی'' لکھ کر، حالی نے ''حیات جاوید'' لکھ کر اپنے اپنے ممدوح کی مدلل مداحی کی تھی اسی صنف کی یہ ایک مدلل کوشش ہے۔ جس سے اردو ادب میں بلاشبہ ایک گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔ کتاب کا ہر عنوان اچھوتا اور معنی خیز ہے جو کسی بہت خوبصورت مصرعے پر مشتمل ہے۔ اس کا حرف اول اور پیش لفظ بھی بہت قیمتی ہے۔

مادر علمی کے تحفظ وارتقاء کے سلسلہ میں سید حامد صاحب کی کاوشیں بلاشبہ علی گڑھ کی نشاۃ الثانیہ کا عنوان ہیں اور نجمہ محمود صاحبہ کی یہ کتاب ان ہی کاوشوں کو خراج عقیدت ہے۔ ایک دستاویز اس تخلیقی تنقید میں مصنفہ نے ادبی تنقید وتحقیق کے تمام معیارات کو بروئے کار لا کر سید حامد کے کلام واسلوب کی خوبیاں بیان کی ہیں۔ اس کا کلائمکس یہ ہے کہ غزل کے مجموعہ ''لمحات'' کی جان اس کی ابتدا میں شامل حمد اور نعت میں تلاش کی ہے۔ ان کی نظموں کے مجموعہ ''شیرازہ'' پر طویل تحقیقی و تنقیدی مقالہ ہے۔ انھوں نے اقبال، شیکسپیئر، ابن عربی، ورڈز ورتھ، کیٹس اور خلیل جبران وغیرہ کی شاعری کی خوبیاں سید حامد کی شاعری میں دیکھی ہیں۔ یہ عظیم دریافت وہی کرسکتا ہے جس کے اندر واقع تنقیدی بصیرت ہو۔ ''شیرازہ'' میں شامل نعت، ت ''شنہ لبی''، ''خانہ بدوش'' کا گیت، سفینہ اور ''شریک حیات'' کا انتظار وغیرہ نظموں پر تفصیل سے لکھا ہے۔ اس تصنیف کا آخری مقالہ سید حامد نگار خانۂ رقصاں کی روشنی میں مصنفہ کا وہ معرکتہ الآراء تحقیقی وتنقیدی مقالہ ہے جو سید حامد صاحب کے تنقیدی مضامین کے مجموعے 'نگار خانۂ رقصاں' پر ۱۹۸۷ء میں شائع ہو کر زبردست خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔ اس میں مصنفہ نے بڑی عرق ریزی سے نقد ونظر کے اعلیٰ معیار پر سید حامد کی تنقیدوں کو پرکھا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ سید حامد ایک معتبر نام اور 'نگار خانۂ رقصاں' ایک مکمل اور معتبر تنقید ہے۔ مصنفہ محترمہ نے زیر نظر کتاب کو ایک نئی جہت دی ہے۔ راقم الحروف کو چونکہ سید صاحب اور مصنفہ محترمہ دونوں سے عقیدت ہے اس لیے تخلیقی تنقید کا

یہ اسلوب اچھا لگا۔

''سید حامد کہ گم اس میں ہیں آفاق'' (جو ایک گراں قدر تحفہ ہے) کو پڑھ کر کچھ کر گزرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ سید حامد جیسے عظیم محسن قوم کے کارناموں کو اجاگر کرنے کا فرض کفایہ ایک عقیدت مند خاتون نے کیا۔ سید حامد کو خراج عقیدت دراصل قوم کو خراج عقیدت ہے۔ اس سے قوم کو ہی فائدہ ہوگا۔

○

○

''سیّد حامد کے شعری مجموعہ 'شیرازہ' کے مطالعہ کے دوران میں نے شدت سے محسوس کیا کہ آج کے اس ریگستانی ادبی منظرنامے میں سیّد حامد نے نہ صرف نظم کی لاج رکھی ہے (اور اقبال کی روایت سے جڑے ہیں) بلکہ غزل کی بھی لاج رکھی ہے۔ ان کے جذبۂ تحریر نے ان کو ''شعور کی منزلوں سے اٹھاکر وجدان کی رفعتوں سے روشناس کرایا ہے''۔

(اقتباس: از: ''سیّد حامد کہ گم اُس میں ہیں آفاق'')

''جنگل کی آواز'' (ادبی تخلیقات کا مجموعہ)

(مضامین)

○

''ایسے ہی نہ جانے کتنے قصے وہ اپنی ماں سے سنا کرتی تھی جنہیں سن کر وہ سوچتی تھی کہ جاگیرداری ہندوستان سے ختم ہوگئی لیکن اس کے زہریلے اثرات اب تک ذہنوں پر مسلط ہیں۔ جاگیردار ختم ہو گئے لیکن اپنی میراث چھوڑ گئے ہیں۔ نہ جانے ''بزرگوں'' کی اس میراث، سے کب چھٹکارا ملے گا''۔

(اقتباس: ۱۳ سال کی عمر میں لکھی ہوئی کہانی ''میراث'' سے)

سید امین اشرف

جنگل کی آواز ایک مطالعہ

پروفیسر نجمہ محمود کی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی ادبیات میں علم و تعلم اور درس و تدریس سے وابستگی ان کی علمی و ادبی شخصیت کے امتیاز کی حدِ آخر نہیں ہے بلکہ ان کی شناخت اگر ہے تو وہ ان کے ایک قابل قدر فن کار ہونے کے سبب سے ہے اور اس وجہ سے ہے کہ موصوفہ نے ایک حقیقت پسند محقق، معتبر نقاد، منفرد سوانح نگار، نئے اسلوب کی افسانہ و ناول نگار اور ایک حساس شاعرہ کی حیثیت سے ادب میں اپنی جگہ آپ بنائی ہے۔ خاص بات تو یہ بھی ہے کہ انھوں نے مغربی ادب سے گہری وابستگی کے باوصف مشرقی ادب کو گلے لگا کر اس کی عظمت و وقعت میں مقدور بھر اضافہ بھی کیا ہے۔ پی ایچ۔ ڈی کے لیے ورجینیا وولف پر لکھی ان کی تحقیقی کتاب کی حلقۂ ارباب نقد و بصر میں توقع سے زیادہ پذیرائی ہوئی تھی۔ ان کے قلم کا ثمرہ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر سید حامد تو شتہ ان کی سوانح زیر عنوان ''سید حامد کہ گم اس میں ہیں آفاق'' بھی اپنی انفرادیت اور تنوع کے سبب عالمی منظر نامے پر نمودار ہو کر شرف قبولیت سے سرفراز ہو چکی ہے۔ اسی طرح ان کے افسانوں پر مبنی مجموعہ ''پانی اور چٹان'' بھی شائقین ادب کے ہاتھوں میں پہنچ کر داد و ستائش سے ہم کنار ہوا تھا اور اب ۲۶۷ صفحات پر مشتمل ان کے افسانوں اور افسانہ پیکر مختصر ناولوں پر مبنی مجموعہ ''جنگل کی آواز'' بھی منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہو کر شرفِ قبولیت خاص و عامہ سے معزز و مفتخر ہو کر درجۂ استناد سے ہم کنار نظر آتا ہے۔

اردو ادب میں ناول و افسانہ کے آغاز کی تاریخی حیثیت قدیمی نہیں ہے بیسویں صدی کے پہلے دہے میں مغرب نژاد ناول و افسانہ کی تخلیق میں جن ادیبوں نے علمی دلچسپی کا مظاہرہ کیا ان میں محمد حسین آزاد، عبدالحلیم شرر، راشد الخیری، ڈپٹی نذیر احمد اور قرۃ العین حیدر کے والد سجاد حیدر یلدرم کے نام سر فہرست ہیں اور فرمان فتح پوری کے فرمان عالیہ کے مطابق اردو کا پہلا افسانہ ''نشے کی

ترنگ'' تھا جس کے خالق سجاد حیدر یلدرم کے نام سرفہرست ہیں لیکن ابتدائی دور کے یہ افسانے محض دینی تعلیم، تہذیبی و اخلاقی تربیت، پند و موعظت اور قوم کی اصلاح تک ہی محدود تھے اور حقیقی معنوں میں انھیں افسانہ کہنے میں بھی تردد ہوتا تھا، مگر آگے چل کر جنھوں نے افسانہ کو زندگی اور حقیقت نگاری سے روشناس کر کے اس کے سر پر عظمت کا تاج رکھا، وہ منشی پریم چند اور سدرشن بالی ہیں، جہاں تک ناول کا تعلق ہے مرزا ہادی رسوا نے بھی ناول ''امراؤ جان ادا'' لکھ کر برائے زندگی کی بنیاد مستحکم کر دی تھی۔ اسی دور کی کوکھ سے ۱۹۳۶ء میں ایک نئے دور نے جنم لیا جسے انگارے کے دور سے تعبیر کرنا غلط نہ ہوگا۔ دس افسانوں پر مشتمل کتاب ''انگارے'' کو ۱۹۳۶ء میں احمد علی نے مرتب کیا تھا جس میں پانچ افسانے سجاد ظہیر کے تھے، دو احمد علی کے، دو رشید جہاں کے اور ایک افسانہ محمود الظفر کا تھا۔ ان افسانوں میں انگریزوں اور جاگیرداروں کے خلاف جہاں آواز اٹھائی گئی وہیں سماجی بے راہ روی نیز مذہب کی آڑ میں پنپنے والی برائیوں کو بھی ملامت کا ہدف بنایا گیا تھا۔ ان افسانوں پر مارکس کے جدلیاتی فلسفے اور فرائڈ کے حیاتی نظریے کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ لہٰذا سرکاری طور پر یہ کتاب ضبط ہوئی، نذر آتش کی گئی اور افسانہ نگاروں کو قتل کی دھمکیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ یہ سب دیکھ کر سجاد ظہیر کو برطانیہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی داغ بیل ڈالنی پڑی اور پھر ۱۹۳۶ء میں ہی لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی اولیں کانفرنس کا انعقاد منشی پریم چند کی صدارت میں بڑی شان و شوکت سے انجام پایا۔ پھر توجہ طلب اور خاص بات تو یہ ہے کہ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۴۷ء یعنی تقسیم ہند تک کے گنتی کے کل گیارہ بارہ سال میں اردو فکشن تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کر کے اپنے منتہائے اوج پر پہنچ گیا۔ ناول و افسانے کا یہ دور نشاۃ الثانیہ یا عہد زریں کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس خاص عرصے میں جو ادب تخلیق ہوا وہ بقدر معیار و وقار دنیا کے کسی بھی ادب کے مقابلے میں بصد افتخار پیش کیا جا سکتا ہے۔ ناول و افسانے کو عظمت و وقعت سے سرفراز کرنے اور ان کی سر پر عزت کا تاج رکھنے والے ادیبوں میں بطور مشتے نمونہ از خروارے منشی پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، علی عباس حسینی، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، مہندر ناتھ، احمد علی، حیات اللہ انصاری، اختر انصاری، بلونت سنگھ، حسن عسکری، وقار عظیم، ابراہیم جلیس، سہیل عظیم آبادی، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، ممتاز شیریں اور ہاجرہ مسرور کے

نام پیش کر دینا ہی کافی ہوگا۔ پھر ترقی پسند تحریک کے روبہ زوال ہونے کے بعد جب ادب پر جدیدیت متمکن ہوئی تو شاعری کے ساتھ افسانہ نگاری بھی متاثر ہوئی اور اس میں ہونے والے نت نئے تجربات سے بیانیہ کے طور طریقے بھی بدل گئے جن سے بیانیہ کا اکہرا پن دور ہونے اور مختلف النوع علوم کے انجذاب کی گنجائش نکل آنے سے جہاں افسانے میں تکثیریت پیدا ہوئی وہیں آفاقی معنویت کے دریچے بھی وا ہو گئے۔

اب میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ کتاب میں شامل بارہ افسانوں کے علاوہ نجمہ نے حجاب امتیاز علی تاج کے اسلوب میں جو تین طرحی کہانیاں الگ سے پیش کی ہیں ان کے عناوین اس طرح ہیں: (۱) گل مہر کے سائے تلے، (۲) 'املتاس کی چھاؤں میں' اور (۳) 'چنار کے سائے تلے'۔ اسی طرح انھوں نے اپنے افسانہ پیکر ناولوں: (۱) مانجھی اور (۲) 'جنگل کی آواز' کے علاوہ الگ سے جو ناول ''صنوبر کے سائے تلے' شامل کتاب کی ہے وہ بھی حجاب امتیاز علی تاج کے pattern پر تخلیق کی گئی ہے۔

ان سبھی کہانیوں اور ناولوں کے مطالعے کے بعد یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نجمہ کو زبان و بیان پر کما حقہ قدرت کاملہ حاصل ہے اور انھوں نے ہر تکنیک اور ہر اسلوب کی کہانیاں مرتب کی ہیں۔ انھوں نے پلاٹ، کہانی اور مربوط واقعات پر مبنی کہانیاں بھی لکھی ہیں اور شعوری لہر کی تکنک کا بھی اپنے افسانوں میں استعمال کیا ہے۔ دیگر افسانوں سے پہلے میں ان کے افسانوں پر جو انھوں نے حجاب امتیاز علی کے طرز اسلوب سے متاثر ہو کر لکھے ہیں، اس پر بحث و تمحیص کو ترجیح دوں گا۔ مصنفہ نے ان کو طرحی افسانوں کا نام دیا ہے جو اپنے آپ میں ایک جدّت ہے۔ حجاب امتیاز علی کے افسانے کو وہ مصرع اولیٰ مان کر بطور مصرع ثانی جو گرہ لگاتی ہیں تو نتیجتاً جو ایک نیا افسانہ معرضِ وجود میں آتا ہے وہ حجاب امتیاز علی کا زائیدہ یا اس کی توسیع ہی مانا جائے گا۔ جہاں تک ماحول کی فضا بندی کا تعلق ہے تو اس میں مماثلت پیدا کرنا بذاتِ خود ایک خلاقانہ کارکردگی ہے، علاوہ ازیں افسانوں کی تعمیر میں شامل تجربہ، احساس، جذبہ، فکر، لفظیات، نفسیات، خیالات، نقطۂ نظر سبھی کچھ تو نجمہ محمود کا ہے کسی اور کا نہیں ہے۔ لہٰذا یہ کہانیاں ہر طرح سے طبع زاد کہانیاں ہیں اور بات صرف اتنی سی ہے کہ انھیں حجاب امتیاز علی، جمیلہ ہاشمی اور ورجینا وولف دل سے پسند ہیں اس لیے انھوں نے اپنی خوشی کی

خاطر اپنی کہانیوں میں حجاب امتیاز علی تاج کی کہانیوں کے ماحول کی تجدید کا تجربہ کیا ہے۔ جس میں وہ پوری طرح کامیاب ہیں۔ ان کی تینوں طرح کہانیوں یعنی ''گل مہر کے سائے تلے''، ''املتاس کی چھاؤں میں'' اور ''چنار کے سائے تلے'' کے ماحول، کردار اور منظر کشی میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ مثلاً واحد متکلم کا افسانوی نام نوری کی موجودگی اور اس کا ذکر تینوں کہانیوں میں موجود ہے اور وہ وقتاً فوقتاً یوڈی کلون سونگھتی ہے۔ تینوں کہانیوں میں حویلی کے مدوّر ستونوں والے دائروی برآمدے اور اس میں بچھی کرسیوں کا ذکر ملتا ہے۔ سبھی میں صحن گلستاں میں ایستادہ املتاس، چنار، پام، دیودار، صنوبر اور گل مہر کے درختوں کا ذکر ہے۔ املتاس اور گل مہر کے درخت افسانہ نگار کے دیرینہ دوست اور ہمراز ہیں انھیں کے سائے تلے میز کرسی پر وہ افسانوں کو جنم دیتی ہے۔ طیور جن کا ذکر بار بار ہوتا رہتا ہے، وہ ہیں سنگاپوری لال پروں والی مینا جو نغمہ زن ہوتی ہے۔ بلبل لیموں کے درخت کی شاخ پر بیٹھی نوحہ خوانی کیا کرتی ہے۔ کوئل کوکتی ہے حواصلوں اور آبی پرندوں کو بھی منظر کا حصہ بنایا گیا ہے۔ سیامی بلی بھی بار بار سامنے آکر اپنی موجودگی سے باخبر کرتی ہے۔ افسانہ نگار نوری کے علاوہ گفتگو میں شامل رہنے والے مستقل کرداروں کے نام ہیں نور، پرنور، افق، ندیم، چچا ادراک، ذوالقرنین بھائی وغیرہ اور نانی ثمرہ جو چالیس سال کی عمر میں بیوہ ہو کر اب حویلی میں کبرسنی اور اور تنہائی کی دکھی زندگی بسر کرتی ہیں۔ عربی دریچے اور فرانسیسی دریچوں سے بھی جان پہچان کرائی گئی ہے۔ میز پر طلائی کشتیوں سے انار و موسمی کا رس، اناس کے قتلے، ایرانی کھجوریں، عراقی چھوارے، قہوے اور لبنانی مٹھائیوں سے آراستہ طلائی طشتریوں سے مدور میز کی زیب و زینت میں اضافہ کیا جاتا ہے اور جب افسانہ نگار مراقب ہو کر فطرت کو اپنے وجود میں سرایت کرنے کے عمل میں منہمک ہوتی ہے تو اسے نظر آنے والے کوہ شیباز، دریائے شاکاک، کہسار، پہاڑیاں، گل پوش وادیاں، چشمے، جھرنے، گلِ ابر، امنڈتی بپھرتی کالی گھٹائیں، بھیگی ہوائیں، بادوباراں، لہراتی گنگناتی ندیاں، کہرا، گلیشیر، درخت، جھاڑیاں، تنگ پہاڑی راستے، برف پوش پہاڑیاں، گھاس کا ہرا سمندر، دہکتے برفانی تودے، ایشیائی بادل اور سمندری جل پریوں کی طرح سرگوشیاں کرتی، سرسراتی ہوائیں قارئین کے بھی احساس کا حصہ بن جاتی ہیں۔

نجمہ محمود کا علم وسیع ہے ان کے افسانے میں انسانیت آمیز صالح اقدار کی بازیافت کا رجحان

نمایاں ہے۔ عصری بحرانی کیفیت سے دو چار پر آشوب معاشرے کے زوال و انحطاط اور انسانی زندگی کی نا آسودگی، محرومی و محزونی، مصائب و مشکلات اور درد و کرب کے روح فرسا احساسات سے برآت کی خاطر وہ مظاہر فطرت کی سحر زائیوں میں کھو کر اپنے حیاتی دکھ درد کا مداوا کرنے میں کوئی برائی نہیں سمجھتیں۔ ان کے افسانوں میں کثیر الجہات موضوعات اپنا تعارف کراتے ہیں اور ان میں بیشتر علوم کا انجذاب بھی معانی کی تکثیریت میں اہم کردار نبھاتا ہے۔ ان کی عالمی نوعیت کی سیاسی، تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی، سائنسی اور تکنیکی معلومات اور ان کے اپنے داخلی تجربات و احساسات کی آمیزش سے جنم لینے والے لازمی نتائج ان کے افسانوں میں جب جگنو کی طرح چمکتے اور دہکتے ہیں تو بہت سی آفاقی سچائیاں خود بخود روشنی میں آجاتی ہیں۔ نجمہ محمود کے افسانوں میں مذہب، فلسفہ، تصوف، تاریخ اخلاقیات، نفسیات، معاشرت اور رومانی جذبے رہ رہ کر مختصر وقفوں میں اپنی جھلک دکھاتے رہتے ہیں۔ شاعری تمام تر علوم کی روح ہے اور قدامت اور وصف ہر دو اعتبار سے نظم کو نثر پر فوقیت و برتری حاصل ہے۔ کرشن چندر، حجاب امتیاز علی، قرۃ العین حیدر، جمیلہ ہاشمی اور اے۔حمید کی طرح نجمہ صاحبہ نے بھی افسانوں اور ناولوں میں شاعری کی ہے۔ ایسی شاعری جس کا مقصد شخصیت سازی اور تہذیب گم گشتہ کی بازیافت ہے۔ فطرت کی جلوہ آرائیاں ان کے وجود میں سرایت پذیر ہو کر جب انھیں تازہ دم کر دیتی ہیں تو پھر گیت کے ٹیپ کے بند کی طرح ان کے لب پر جمیلہ ہاشمی اور ورجینیا وولف کے یہ اقوال گردش کرنے لگتے ہیں کہ ''دنیا شورشوں سے پر ہو چکی ہے'' اور ''.The Wall of civilization is in ruins'' اور پھر وہ انھیں کسی دھواں دھواں اور دھماکہ خیز صورت حال کی افسوس ناک تعبیر میں گم ہو رو بہ زوال تہذیب کے ویرانوں اور اعلیٰ روحانی اقدار کے کھنڈرات کے درمیان سے ہو کر دور تک نکل جاتی ہیں۔ انھیں خلیل جبران کا وطن لبنان یاد آجاتا ہے جس کے کوچے اور بازار لہو کی بہتی ندیاں بن چکے ہیں۔ مذہب انسان کے وحشیانہ کارنامے، دہشت گردی، مذہبی عصبیت، ذات پات کا امتیاز، خون خرابہ، نسل کشی، پرائے ملکوں پر جارحانہ و غاصبانہ قبضے، قبرستانوں میں تبدیل ہوتے ہوئے بارونق شہر، مجبوریوں کا استحصال، طاقت کا انسانی لاشوں پر وحشیانہ و جارحانہ شیطانی رقص یہ سب دیکھ انھیں یقین ہو جاتا ہے کہ واقعی دنیا شورشوں سے پر ہو چکی ہے۔ حقیقتاً اس لیے وہ اپنے افسانہ

پیکر ناول ''جنگل کی آواز'' میں یہ مان کر کہ دنیا اب انسانوں کے رہنے کے لائق نہیں رہی ہے وہ دنیا والوں کو جنگل کی جانب مراجعت کی دعوت عام دیتی ہیں کیوں کہ بقول خلیل جبران: ''اگر جنگل اور بانسری نہ ہوتے تو یہ دنیا ایک ویران جزیرہ ہوتی''۔ فطرت کی بانسری وحدت کا رمز ہے۔ فطرت سے ہم آہنگی کی کیفیت چٹانوں کو رونے اور درختوں کو بولنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ لہٰذا فطری مناظر نہ صرف جائے اماں ہیں بلکہ وہ ذات، حیات، کائنات، وقت اور قدرت کی وحدانیت کا مکاشفہ بھی ہیں۔ ان کا طرحی ناول ''صنوبر کے سائے تلے'' بھی مادی نوعیت کے سنگین حقائق اور حسی نوعیت کے مراقبے کی دلکش وروح پرور جنتوں کا آمیزہ ہے۔

ان کے غیر طرحی افسانے بھی سماج کے سلگتے ہوئے سنگین مسائل کا حل احادیث کی روشنی میں حل کرنے کی دعوت دیتے ہیں تیرہ سال کی عمر میں لکھا ان کا پہلا افسانہ ''میراث'' جس نے سجاد ظہیر کو چونکا دیا تھا، خانگی ماحول میں پرورش پانے والے جاہلانہ مفروضات واعتقادات پر گہرا طنز ہے۔ ان کا اہم افسانہ ''پانی اور چٹان'' بے جوڑ شادی کے حوالے سے فلسفیانہ اور منطقی طرز فکر کی ایک ایسی کہانی ہے جو تعلیمی تفاوت کو خاطر میں نہیں لاتی، مگر ذہنیت کے ظالمانہ اور غیر رفیقانہ فرق سے مفاہمت کے لیے کسی طور بھی تیار نہیں۔ وہ ایسی شادی پر تجرد کی زندگی کو ترجیح دیتی ہے۔ ان کی کہانی ''تحفہ'' ثابت کرتی ہے کہ بڑے آدمی کی شناخت اصلاً سیم وزر سے نہیں بلکہ اس کے دل کی وسعت سے ہوتی ہے۔ ان کی اگلی کہانی ''لہر لہر سمندر'' بھی جداگانہ پیرائے میں اسی خیال کی تمثیلی توثیق ہے کہ کبھی کبھی انجانوں سے وہ رفاقت ملتی ہے جو یگانوں سے بھی نہیں ملتی۔ ''مٹی کا مادھو'' کام کی عظمت کی نشان دہی کرتی ہے۔

بحیثیت مجموعی نجمہ محمود ایک ایسی نابغہ وثقہ اور جینوئن قسم کی فکشن نگار ہیں جن کے خلاقانہ اور متنوع فن پارے عالمی ادب میں ان کا نام ہمیشہ تاباں ودرخشاں رکھیں گے۔ انشاءاللہ

(مطبوعہ ماہنامہ ''تحریر نو''، ممبئی، جولائی ۲۰۱۲ء)

○

خان جمیل

'جنگل کی آواز' میں روح کا نغمہ

اردو افسانے کی دنیا میں خواتین کے ادب کے حوالے سے محترمہ نجمہ محمود نے اپنا نام تخلیقی استقلال سے روشن کیا ہے، انھوں نے اپنی انفرادیت کا لوہا یکے بعد دیگرے عمدہ افسانے پیش کر کے منوایا ہے، ان کی تازہ کتاب ''جنگل کی آواز'' اور اس میں شامل دیگر کہانیاں .... (جو کہ ناول جنگل کی آواز کے مختلف ابواب کے طور پر سامنے آتی ہیں اور جو کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے سے منسلک ہیں) اس کی گواہ ہیں۔

زیر نظر کتاب ہمیں ایک ایسی مصنفہ سے متعارف کرواتی ہے جس کا صاف وشفاف و معصوم و پاکیزہ قلب دوسروں کے درد والم، حزن وملال، سماج سے مٹتی ہوئی اعلیٰ اخلاقی اقدار اور ریا کاری کے روز افزوں ہوتے ہوئے رجحان سے اشکبار ہے۔

انھوں نے اپنے کرداروں کے توسط سے ہماری تہذیب، ہماری زندگی کا عکس پیش کرنے کی سعی کی ہے، لیکن ان کے کرداروں کے باطن میں جو دنیا آباد ہے اس کی نقاب کشائی کرتے ہوئے انھوں نے اپنے منفرد اسلوب سے اپنی کہانیوں کو عمدہ فن پاروں کا روپ عطا کیا ہے'جنگل کی آواز'، 'نرگس کے پھول'، 'املتاس کی چھاؤں میں'، 'صنوبر کے سائے تلے، اور اپنا 'اپنا پرایا' اس کا کھلا ثبوت ہیں۔

ان کی کہانیوں کا استعاراتی بیانیہ جو کہ انسانی وجود کے اندرون، بالخصوص نسائی احساسات وجذبات، کو پرت در پرت گوشہ گوشہ پیچیدگیوں کو ایک معصومانہ سادگی کے ساتھ پینٹ کرتا چلا جاتا ہے...... اور نجمہ صاحبہ کی کہانیاں شمالی ہندوستان کی تہذیبی، ثقافتی اور سماجی آئینہ ہی نہیں بلکہ امانت اور وراثت کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتی ہیں۔

عالمی تناظر میں بھی ان کی تحریریں تمام انسانیت کے دکھوں، رنج وغم، انسانوں کے خلاف

انسانوں کا جبر و تشدد اور بے انصافیوں کے خلاف احتجاج کا علم بھی بلند کرتی ہیں اور گمراہ انسانوں کو اشاروں کنایوں میں ایک بار پھر اپنی ازلی معصومیت اختیار کرنے کے تلقین بھی کرتی نظر آتی ہیں۔

خاکسار نے اپنے گذشتہ ایک خط نما مضمون میں محترمہ نجمہ محمود کے بیانیہ کے باطن میں صوفیانہ تصور کی روشن لہر کا ذکر کیا تھا اس ضمن میں ان کے افسانوں کے کچھ اقتباسات پیش کرنے سے قبل ضروری ہے کہ ذیل کی ان سطروں کو پیش کر دیا جائے۔

بعض صوفیوں کا قول ہے کہ خدا کی ذات سے الگ کائنات کا تصور محض وہم ہے۔ جو کچھ ہے وہ خدا کے جلال اور جمال کا پرتو ہی ہے جو مظاہر فطرت میں گوناگوں جلوہ گر ہے یہ باغ یہ بہار، یہ ندی وکوہسار، یہ بیاباں یہ وادی وجنگل، یہ ابر و باراں، یہ شمس و قمر یہ تمام کواکب، یہ مرد و زن، یہ ماں کی گود میں مسکراتا ہوا معصوم بچہ، رنگ روشنی، آواز اور موسیقی سے بھرپور یہ پوری کائنات یہ بھی فطرت کا ہی حصہ ہیں........

ایک دریا ہے ذات مطلق کے پرتو کا جو ہر جانب بہہ رہا ہے، لہریں، بلبلے اور گرداب ابھر رہے ہیں اور ہمہ اوست ہی ہمہ اوست ہے (سب کچھ وہی ہے) کا سنگیت گونج رہا ہے)

میں خود ہی جلوہ ریز ہوں، خود ہی نگاہِ شوق
شفاف پانیوں پہ جھکی ڈال کی طرح
شکیب جلالی

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں
غالب

نجمہ صاحبہ کی کہانیوں کے بیشتر کردار اپنے وجدان کی جوت جگائے فطرت کی معرفت اسی ذات مطلق کی تلاش وجستجو، اعانت اور پناہ کے متمنی نظر آتے ہیں، ملاحظہ ہوں ان کی کہانیوں سے کچھ اقتباسات........

”اور وہ محیط بے کراں، کائنات کے ذرّے ذرّے میں جو پنہاں ہے
لگتا ہے کوئی مجھ سے سرگوشی میں کہہ رہا ہو آجاؤ ہمارے پاس کہ یہی منزل

ہے تمہاری۔ ہوائیں سرسرا رہی ہیں۔ سائیں سائیں۔ پھر ایسا لگتا ہے بہت دور سے کسی نے آواز دی ہو۔ میرے سامنے ایک میدان ہے میں وہاں تنہا کھڑا ہوں، پھر زور زور سے بھاگنے لگتا ہوں اور اوندھے منھ گر پڑتا ہوں، چوٹ لگتی ہے۔ خون بہہ رہا ہے، جسم پر زخم ہی زخم ہیں، پھر کوئی ان دیکھا ہاتھ میرے زخموں پر مرہم رکھ رہا ہے۔ اب وہاں خون ہے نہ زخم۔ میں مسکرا رہا ہوں۔''

(آسماں تیری لحد پر)

''اس کا دل مسرت سے لبریز تھا...... گمشدہ انسان..... اس نے سوچا فطرت میں کتنے اسرار پوشیدہ ہیں، کیسی گہرائیاں ہیں پانی کی لہروں کے نیچے، زمین پر بسنے والے انسانوں میں جن کے مختلف رنگ وروپ ہیں، لہریں ابھرتی ہیں ڈوبتی ہیں اور سمندر کا حصہ بن جاتی ہیں، انسان مرتے ہیں، لیکن زندگی چلتی رہتی ہے رواں رہتی ہے آج اسے فطرت کے حسن کا مکمل ادراک ہوا۔''

(لہر لہر سمندر)

بچہ پھر بول پڑا ''چندا ماموں تم بڑے تھکے تھکے لگتے ہو رات بھر چلتے رہنے سے تو تم بہت جلد بوڑھے ہو جاؤ گے، تھوڑی دیر آرام بھی کر لیا کرو۔ دیکھو تو یہ درخت بابا کتنے اکیلے ہیں ان کے آس پاس ایک بھی درخت نہیں، تم بھی ان ہی کی طرح اکیلے اور اداس ہو جب تم تھک جایا کرو تو تھوڑی دیر کے لیے ان کے پاس آجایا کرو۔''

(بوڑھا برگد)

''اس نے کھڑکی کھول دی۔ ہوائیں سرسراتی ہوئی اندر داخل ہوئیں اس کی آنکھیں دور خلاء میں کسی ابھرتے ہیولے پر مرکوز ہوگئیں۔ ہمارا سب سے بڑا غم یہ ہے کہ سمندر کی اوپری سطح پر تیرتے رہنا ہمیں آسان لگتا ہے

لیکن اس کی گہرائیوں میں ڈوب کر ان دیکھی ان جانی دنیاؤں کا سراغ لگاتے ہوئے ہم ڈرتے ہیں روح کے نہاں خانے کتنے حیرت خیز ہیں۔''

(گل مہر کے سائے تلے)

''اسی لمحہ میرے ذہن کے پردے پر ایک منظر ابھرا۔ میں آسمانوں میں محو پرواز تھی میرا طیارہ بحیرۂ عرب پار کر رہا تھا میں نے دائروی دریچے کے شیشے سے باہر دیکھا تو کھوسی گئی تھی۔ سفید، چاندی جیسے چمکیلے برفانی تودے خلاء میں منجمد تھے جن کی برف کبھی ژالہ باری کرتی ہے کبھی بارش کی صورت برستی ہے........ برف کے پہاڑ سے پانی جھرنے کی صورت میں بہہ رہا تھا شبیہیں الٹ رہی تھیں........ برس رہا ہوگا کہیں وہ پانی ...... سمندر پر بارش...... دائرہ جہاں سے شروع ہوتا ہے وہیں ختم ہوتا ہے عجب سرشاری اور جذب کی کیفیت طاری تھی مجھ پر۔ فطرت جادو جگاتی ہے۔ اس کے جمال وجلال میں پنہاں حقیقت کی جستجو لازمی ہے۔ کاش فطرت اور دین فطرت کی طرف واپس آجائیں وہ سب جنھوں نے دنیا کو جہنم بنادیا ہے۔''

(املتاس کی چھاؤں میں)

''اس کے وجود نے تسلی بخش لہجے میں کہا۔'' چٹان نما پتھروں، کھلتی کلیوں، کاسنی اور پیازی پھولوں اور جنگلی گلابوں کو دیکھو، تاڑ کے خوشنما چھتری جیسے پتوں کو دیکھو، گرجتے سمندر کی پرشور لہروں کو دیکھو، ان کوئلوں کو دیکھو جو کواو کی تان الاپ کر دل کو جذبوں سے لبریز کرتی ہیں، ان شاخوں کو دیکھو جو جھوم جھوم کر روح کو سرشار کرتی ہیں، درختوں کے سبز پتوں پر وجود مطلق کا نام پڑھو۔''.........

اس نے زیر لب کہا'' وجود مطلق کی ذات میں جذب بندگان خدا...... حسین بن منصور حلاج، سرمد، رومی، جبران، میرا، کبیر، اور اللہ عافہ......

انفرادی روح کی قلب ماہیت، شعور کی وجود سے بے خبری، بے خودی، برتر آفاقی ذہنیت سے رشتہ۔ حسین ترین تجربہ پر اسرار ہوا کرتا ہے روحانی دیوالیہ پن کی طرف بڑھ رہی ہے وہ ہماری متروک دنیا۔ ٹیکنالوجی نے سب کچھ نگل لیا....... لیکن یہ میں کہاں پہنچ گئی وہ دنیا تو میں چھوڑ چکی اور یہ دنیا فطرت کی یہ پناہ گاہ کتنی، مسحور کن ہے، کتنی پرسکون، کیسی روح پرور اور زندگی بخش....... میرے وجود تم تو میرے ساتھ ہونا.........‘‘؟

(جنگل کی آواز)

مندرجہ بالا اقتباسات راقم الحروف کی اس بات کی تائید کے لیے کافی ہیں کہ ’’نجمہ محمود کے بیانیہ کے باطن میں موجزن ہمہ اوست و وحدت الوجود کے صوفیانہ تصور کی ایک واضح اور روشن لہر رہ رہ کر چمک اٹھتی ہے اور خیال و شعور کو سرشاری کے احساس سے بھر دیتی ہے۔

نجمہ محمود کی تحریروں کا یہ غیر رسمی صوفیانہ پن اور ان کے بیانیہ میں رچی بسی ایک حزن آمیز روحانی بصیرت افروزی ہی ان کی ’اوریجنیلیٹی‘ کی ضامن بن کر ہماری توجہ کا سبب ہی نہیں ہمارے وجود کے گھنے جنگلوں میں نغمہ ریزی کا باعث بھی بنتی ہے۔

(مطبوعہ سہ ماہی ’’ابجد‘‘ ارریا، جولائی - دسمبر ۲۰۱۱ء)

○

محمد اسلم غازی

''جنگل کی آواز صدا بہ صحرا نہیں''

معروف ادیبہ نجمہ محمود کی تخلیقات کا مجموعہ ''جنگل کی آواز'' کے بارے میں میرا پہلا تاثر یہ ہے کہ ان شاءاللہ یہ'' آواز'' صدا بہ صحرا ثابت نہیں ہوگی۔ میں اپنے اس تاثر کا سبب بیان کردوں۔

''جنگل کی آواز'' کے پیش لفظ میں ادب اور مقصدیت کے متعلق نجمہ محمود صفحہ ۳ پر رقمطراز ہیں۔''...... وہ فن پارہ ہم کو خود سے اوپر اٹھادے۔ محظوظ و سرشار کرے اور زندگی بھی سنواردے۔'' صفحہ ۵ پر قیصر تمکین کے حوالے سے لکھتی ہیں'' .... ڈرائڈن نے کہانی کو شخصیت سازی کا ذریعہ کہا تھا۔ تعلیم، اخلاق، سبق آموز افسانہ کا اصل مقصد ہے۔ قدیم داستانوں اور ناولوں میں تہذیب نفس پر زور ہے۔ خیر وشر کے تضاد کی پیشکش ہے۔'' صفحہ ۶ پر لکھتی ہیں'' ...... اکثر سننے میں آیا کہ کسی تخلیق میں مقصد کی بات نہ کی جائے، تو کہنا یہ ہے کہ مقصد کا برعکس لفظ بے مقصد ہوا۔ یعنی فضول!'' صفحہ ۷ پر نکتہ سنج ہوئی ہیں'' ..... (اور دینی فکرو یجی مذہبیت میں ادب کی روح ہے۔ سیاست ہی نہیں ادب سے بھی اگر'' دین جدا ہوجائے تو فقط'' چنگیزی'' رہ جاتی ہے)'' صفحہ ۸ پر گوہر فشانی کرتی ہیں'' کامل انسان کا تصور عالمی ادب کا اہم ترین موضوع ہے۔ آج کے دور میں اخلاقی قدریں اپنی قیمت کھو چکی ہیں۔ بے حسی اور غنڈہ گردی، نفس پرستی اور ظلم عام ہو چکے ہیں کہ خون بہتا دیکھتے رہتے ہیں (نظر آنے والا اور نظر نہ آنے والا خون) اور آنکھ میں آنسو نہیں آتا، دل پر تکلیف نہیں ہوتی۔'' صفحہ ۹ پر فرماتی ہیں'' میرا مقصد روح کے تاروں کو مرتعش کرنا، ضمیر کو جھنجھوڑنا، زندگی کو اوپر اٹھانا، اسے خوبصورت بنانا تھا۔ میرا مقصد بے حسی پر نکتہ چیں ہونا تھا۔ وہ ایک حد تک پورا ہوا۔'' صفحہ ۱۷ پر موتی رولتی ہیں'' ادب کا مقصد انتہائی عظیم ہے (نہ انعام واکرام، نہ شہرت اور Recognition)۔ ادب اور انسانیت کی خدمت اپنے آپ میں سب سے بڑا انعام ہے۔ ادب سارے علم کی روح ہے۔ زندگی کی تشریح ہے، تعبیر ہے، زندگی کو سنوارنا، اسے اوپر

اٹھانا، تہذیب نفس، شخصیت سازی ہی اس کا اصل مقصد ہے اور ہونا چاہیے۔ اس کے برعکس سوچنا ادبی بد دیانتی ہے۔ ادب کو سستی شہرت اور حصول زر کا وسیلہ ہرگز نہ ہونا چاہیے۔ ''ہوس زندگی کو بدصورت بنادیتی ہے''..... (آگے مزید لکھتی ہیں)

ادب کا اصل مرتبہ سمجھیں اور اس کے ذریعہ موجودہ زوال پذیر معاشرے کو بدلنے کی کوشش کریں انقلاب لائیں اپنی تحریروں کے ذریعہ وقت کے دھاروں کا رخ موڑ دیں۔ ایک خوبصورت صحت مند معاشرہ کی تشکیل کریں جس میں مجرم دندناتے نہ پھریں، جس کی بنیاد اعلیٰ انسانی اقدار پر ہو۔ ایسا معاشرہ جس میں ظلم، بے ایمانی اور ناانصافی نیست و نابود ہو جائیں، جس میں نیک، مخلص اور ایماندار متنفس عزت اور سکون سے جی سکیں، حق داروں کو ان کا حق ملے، ان کو فریب اور دھوکہ نہ دیا جا سکے، ان کے وجود سے لہو نہ ٹپکے، ان کی جڑیں نہ کاٹی جائیں اور ایسا معاشرہ آپ قلم کے زور سے قائم کریں۔'' صفحہ ۱۸ پر فرماتی ہیں'' اور راقم الحروف یہ وعدہ کرتی ہے، دنیا کے سارے قلم کاروں سے، کہ اگر عالمی سطح پر آپ نے ایک مثالی معاشرہ قائم کر دیا تو وہ قلم رکھ دے گی۔''

نجمہ محمود کے درج بالا رشحات قلم پڑھنے کے بعد جب ان کی تخلیقات کا مطالعہ کیا تو دل اس احساس سے سرشار تھا کہ ان کے قول و فعل میں سر مو فرق نہیں۔ سورۃ الصف کی آیت نمبر ۲ اور ۳ یٰایھا الذین آمنوا لم تقولون مالا تفعلون، کبر مقتاً عِندَ اللہ ان تقولوا مالا تفعلون (ترجمہ: اے ایمان والو تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں؟ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ ہے کہ تم جو کہو وہ کرو نہیں) غالباً ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتی ہیں۔ زمین پر خیر و فلاح اور عدل و انصاف کے قیام کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ اور کلمہ ''کن'' کے ذریعہ تمام اسباب و علل کو متحرک اور کارفرما کیا ہے۔ نجمہ محمود کا مقصد بعینہٖ یہی ہے۔ وہ مرضی الٰہی سے ہم آہنگ ہیں۔ اس لیے ساری کائنات اور اس کی موجودات حصول مقصد میں موصوفہ کی ادبی کاوشوں کے ممد و معاون ہیں۔ گویا خدا کی قدرت کاملہ بھی نجمہ محمود کے حصول مقصد میں مددگار ہے۔ تو پھر ان کا خواب پورا کیوں نہ ہوگا؟ ''جنگل کی آواز'' میں پیش لفظ کے علاوہ ۱۳ کہانیاں، ۵ تذکرے، ۱۳ افسانے، ۳ ناول اور ۲۶ مشاہیر اہل قلم کی آراء ہیں۔

کہانی ''میراث'' میں برصغیر کے اس قدیم مسلم معاشرے پر بجا تنقید کی گئی ہے جس میں

بیٹیوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کی بجائے گھریلو کام کاج سکھانے پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ نیز ان کی رضامندی کے بغیر انہیں کسی کے بھی پلے باندھ دینے کا غیر اسلامی طریقہ رائج تھا۔

''پانی اور چٹان'' اس مجموعے کی بہترین کہانیوں میں سے ایک ہے۔ اس کا پس منظر بھی وہی مسلم معاشرہ ہے جس میں تعلیم نسواں کو غیر اسلامی لڑکیوں کو والدین کی مرضی سے بیاہ دینے کو ''اسلامی'' سمجھا جاتا تھا۔ تعلیم یافتہ اور باشعور شاہینہ اس کہانی کا مرکزی کردار ہے جسے اس کی والدہ اس کی مرضی کے خلاف اپنے بھانجے کلیم سے بیاہنا چاہتی ہے۔ بچپن کے منگیتر کی کم علمی اور ناشائستگی پر کبیدہ خاطر شاہینہ شادی سے انکار کر دیتی اور طے کرتی ہے کہ وہ کلیم کو علم وادب سکھائے گی۔ اس کہانی میں شاہینہ کا ایثار نوجوان لڑکیوں کے لیے سبق آموز ہے ورنہ حقوق نسواں کی آڑ میں لڑکیوں کو عموماً نافرمانی پر اکسایا جاتا ہے۔

انسانی جذبات اور تعلقات کو ''تحفہ'' میں بہت خوبصورت اور موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ گرلز ہوسٹل کا چوکیدار اپنی مختصر آمدنی کے باوجود ہوسٹل کی لڑکیوں کے لیے اکثر پھل وغیرہ لاتا ہے جو اپنے گھر والوں سے دور ہیں۔ وہ انھیں اپنی بیٹیاں سمجھتا ہے۔

''لہر لہر سمندر'' بھی ایک خوبصورت موثر کہانی ہے جس میں ٹرین کے ڈبے میں تنہا لڑکی کو کچھ لوفر قسم کے طالب علم پریشان کرتے ہیں لیکن ایک ان پڑھ دیہاتی ان غنڈوں سے لڑکی کو نجات دلاتا ہے۔

مجموعے کی سب سے اچھی کہانی ''مٹی کا مادھو'' ہے۔ کہانی لکھنے کے لیے پرسکون ماحول کی تلاش ایک ادیب کو دیہات لے جاتی ہے لیکن وہاں پڑوسی موچی راتوں میں بھی کام کر کے ماحول کا سکون غارت کرتا رہتا ہے۔ ادیب اسے رات میں کام نہ کرنے کے لیے ایک خطیر رقم پیش کرتا ہے۔ گھر میں تنگی اور بچے کی بیماری کی وجہ سے موچی وہ رقم قبول کر لیتا ہے لیکن بعد میں ضمیر کے کچوکے اسے وہ رقم لوٹانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

''آسماں تیری لحد پر'' میں اسلامی فلسفہ موت پیش کیا گیا ہے کہ موت زندگی کا اختتام نہیں بلکہ تسلسل ہے۔

''بوڑھا برگد'' بچوں کے لیے ایک کہانی ہے جس میں گھر والوں سے روٹھا ہوا ایک بچہ، برگد

کا ایک پیڑ اور چاند کی دوستی کا ماجرا ہے۔

''اپنا پرایا'' بھی ایک اچھی کہانی ہے جس میں انسانی جان کی اہمیت اجاگر کی گئی ہے کہ کیسے ایک نوجوان جسے بڑی کوششوں سے ملازمت ملی ہے ایک بچے کی جان بچانے کے لیے اس کو داؤ پر لگا دیتا ہے۔

''خالی جھولی'' ان والدین کی کہانی ہے جو زندگی کو پر تعیش بنانے کے لئے اپنا زیادہ سے زیادہ وقت آمدنی بڑھانے کی فکر میں خرچ کرتے اور اولاد سے بے پرواہ رہتے ہیں۔اس کہانی میں والد کا کردار زیادہ بے حس ہے جو بیوی سے تو ملازمت کرواتا ہے لیکن اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتا اور گھر اور اولاد پر زیادہ توجہ نہیں دیتا۔کہانی کا انجام چونکانے والا اور دردناک ہے۔قاری دیر تک کہانی کے تاثر سے اداس رہتا ہے۔

نجمہ محمود نے خواتین کے مسائل خصوصاً طلاق اور بیوگی کے بعد ان کے نکاح ثانی کو معیوب سمجھے جانے کے خلاف بجا طور پر زور آواز اٹھائی ہے۔''وجود کے سوتے سے جدا'' کہانی کا مرکزی موضوع یہی ہے۔''چنار کے سائے تلے'' افسانے میں بھی اس پر ہمدردانہ اظہار خیال ہے۔

''وجود کے سوتے سے جدا'' میں مرکزی کردار مسلمان خاتون نے اس کا ''پچھلے جنم'' پر یقین رکھنا عجیب سا لگتا ہے۔

اہل قلم عموماً اپنے حلقۂ تعارف میں سے بعضوں کا خاکہ یا تذکرہ لکھ دیتے ہیں۔لیکن نجمہ محمود نے اپنے پانچ عدد نادر روزگار تذکروں میں نبیوں اور رشیوں کے احوال وکوائف بیان کیے ہیں۔یہ تذکرے ظاہر کرتے ہیں کہ نجمہ محمود کو اپنے عزم ومشن سے نہ صرف سچا لگاؤ ہے بلکہ انھیں اپنی سمت سفر بھی بخوبی معلوم ہے۔

نجمہ محمود نے اپنے افسانوں کو طرحی اور مرحومہ حجاب امتیاز علی تاج کی طرز کا قرار دیا ہے۔بدقسمتی سے مرحومہ کی تخلیقات کبھی میرے مطالعے میں نہ آسکیں۔البتہ ان افسانوں کو پڑھ کر مجھے قرۃ العین حیدر کے بعض افسانوں اور ناولوں کا ماحول ضرور یاد آیا جن میں دولت مند طبقوں کی زندگیوں کو پیش کیا گیا ہے۔ان افسانوں میں امریکہ اور مغربی ممالک کی اسلام دشمنی اور تخریب کاریوں کی مذمت کا برملا اظہار نجمہ محمود کو مصلحت کوش ادیبوں کی بھیڑ سے الگ اور نمایاں کر دیتا ہے۔

اس مجموعے میں نجمہ محمود کے انتہائی مختصر تین ناول بھی ہیں۔ میری رائے ہے کہ اختصار کی وجہ سے انھیں ناول تو نہیں البتہ جدید افسانہ کہا جاسکتا ہے۔ نجمہ محمود نے کہانی اور افسانہ کو بھی علیحدہ اصناف شمار کیا ہے محل نظر ہے۔

نجمہ محمود کئی طرح کے طرز تحریر کی ماہر ہیں۔ یہ انوکھی خصوصیت شاید ہی کسی اور میں ملے۔ مثلاً ایک وہ سلیس، رواں، غیر مبہم اور سبق آموز اسلوب، جو ان کی اکثر کہانیوں میں نظر آتا ہے۔ ان کا دوسرا اسلوب جدید، مبہم اور پیچیدہ ہے۔ تیسرا اسلوب وہ ہے جس میں انھوں نے حجاب امتیاز علی کے طرز کو اپنایا ہے۔

نجمہ محمود کا دنیا کو بدلنے کا عزم انبیائی مشن جیسا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ انھیں صرف اور صرف قرآن اور حدیث کی طرح بیّن، سیدھے وصاف، غیر مبہم اور واضح اسلوب میں اپنی بات کہنی چاہیے۔ از دل خیزد بر دل ریزد والا انداز اپنانا چاہیے جو ترسیل وابلاغ میں صد فیصد کامیاب رہے، جیسے کہ زیر نظر مجموعے کی اکثر کہانیوں میں ہے۔

مشاہیر اہل قلم بجا طور پر نجمہ محمود کی صلاحیتوں کے معترف ہیں لیکن ادب کی مقصدیت کا اعتراف صرف چند نے کیا۔ کاش سبھی نجمہ محمود کے اس نیک مشن کی تائید وحمایت کرتے اور ادب کی تعمیری واصلاحی قوتوں سے سماج سدھار کا کام لیتے۔

نجمہ محمود کو یہ جان کر یقیناً خوشی ہوگی کہ انھی کی طرح تعمیری واصلاحی رجحان رکھنے والے اہل قلم کا ایک بڑا طبقہ اردو ادب کی مخلصانہ خدمت کر رہا ہے اور یہ جان کر نجمہ محمود کو شاید اپنا غم ہلکا نظر آنے لگے کہ انھیں بھی برصغیر کے نام نہاد اردو حلقے نظر انداز کرتے رہے ہیں۔ نجمہ محمود کی طرح ہی ان کا جرم بھی صرف اتنا ہی ہے کہ یہ ادب کی مقصدیت کے قائل اور اس سے اصلاح معاشرہ کا کام لینا چاہتے ہیں۔

عمدہ اور معیاری کتابت، طباعت اور بائنڈنگ والی ۲۶۷ صفحات کی اس کتاب کی قیمت / ۳۰۰ روپے بہت زیادہ ہے۔ اردو کتب کے خریداروں اور قارئین کی تعداد کم ہو جانے کا ایک بڑا سبب ان کی اونچی قیمتیں بھی ہیں۔

(مطبوعہ ''تریاق'')

○

جوہی عثمانی

جنگل کی آواز: میری نظر میں

نجمہ محمود کسی تعارف کی محتاج نہیں، اردو ادب کو، بغیر بیساکھی کے، بے رحم زمانے کے تھپیڑوں کو پار کرتے ہوئے، سمندر کی گہرائیوں سے چن کر ادب کے نایاب موتیوں کا ذخیرہ لانے والی نجمہ محمود کے قلم سے نکلی ہوئی تمام تحریریں خود اپنے آپ میں ادب کی اونچائیوں کی انتہا کو پہنچتی ہیں جو کسی تمغہ کا محتاج نہیں ہے— کوئی بھی زرخرید تمغہ اس بلند شاہکار کے امتیاز کو مثل سورج کو دِیا دکھانے جیسا ہوگا۔

جنگل کی آواز (ادبی تخلیقات کا مجموعہ) ایک ایسی ہی کتاب ہے، جو کہ ادب کی بلندیوں سے پَرے فلک کی پیشانی پر چمکتا ہوا تاج ہے۔

قارئین کو اس کے مطالعہ سے ایک روحانی تسکین حاصل ہوتی ہے جو آج کے مشینی دور میں از حد ضروری ہے۔ قدرت کی بے پناہ نعمتوں سے، فطری مظاہر سے ایک سرشاری اور سکون کا احساس ہوتا ہے۔ (ہر لفظ ادب کا بے مثال نمونہ ہے، ایسی تحریریں عصر جدید میں نایاب ہیں۔

(عظیم ریزیڈنسی، علی گڑھ)

○

○

جنگل بھیگا بھیگا تھا۔ درختوں کی شاخیں کائی پوش تھیں ۔ پتے ٹوٹ ٹوٹ کر زمین پر بچھ گئے تھے..... جگہ جگہ گڑھوں میں پانی بھرا ہوا تھا اور ایک تیزی سے رَواں دَواں چشمہ جو پتھروں کے درمیان سے بہتا چلا آتا تھا اس میں دھند سی اُبل رہی تھی ۔ دُھلے دُھلے سبزے کی روئیدگی، چشمہ کی نمو، خاردار جھاڑیاں کہیں تر و تازہ کاسنی پھولوں کے جھنڈ، دُور سے جانوروں کے بولنے کی آوازیں اور بڑھتا ہوا اندھیرا جنگل کی تازہ ہوا فرحت بخش تھی اس کی رگ و پے میں ایک سرور و انبساط کی کیفیت پیدا ہوئی ۔ یکا یک اسے احساس ہوا کہ وہ تنہا ہے لیکن وہ تنہا کب ہے...... چوں بہ خیال سَر خوشیم

(افسانہ پیکر ناول ''جنگل کی آواز'' سے اقتباس)

''جنگل کی آواز''

(تبصرے)

○

''صبح کا اجالا پھیل رہا تھا..... یہ پودے، پھول، پتے، یہ مناظر، وجودِ مطلق کے بیکراں حُسن کے مظہر اور انسان؟ وہ نشانیاں کہاں گئیں جن کا ذکر آسمانی صحائف میں ہے۔ ہر طرف ریزہ ریزہ انسان اور درندگی کی تمام ہوتی ہوئی حدیں، درندگی جو لہو چوستی ہے۔ اس کے تصور میں اُبھرا ایک پُر جمال و پُر جلال گنبد جو چند ہی لمحوں میں کھنڈر میں بدل گیا.....''

(اقتباس از: افسانہ بہ عنوان ''غار'' مشمولہ جنگل کی آواز، ادبی تخلیقات کا مجموعہ)

پروفیسر علیم اللہ حالی

نجمہ محمود کا ایک تازہ شناخت نامہ ''جنگل کی آواز'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ یہ صرف ان کی ادبی تخلیقات کا مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ اس میں نجمہ کی تخلیقات کے بارے میں اہل الرائے قلم کاروں کی مختصر رائیں بھی ہیں، بعض تحریریں طویل ہیں جو مقالات کے ضمن میں شائع کی گئی ہیں، کم وبیش ۵۰ صفحات پر مشتمل ان رایوں اور کتاب کے ابتدائی صفحات پر مصنفہ کے ۱۸ صفحات پر پھیلے ہوئے پیش لفظ سے نجمہ کے فکروفن اور ان کے اسلوب ولہجہ کی شناخت میں مدد ضرور ملتی ہے لیکن ایک آزاد مشاہد کے لئے یہ باتیں زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ متن کا راست مطالعہ سب سے بہتر ہوتا ہے۔ نجمہ محمود ان خوش نصیبوں میں ہیں جن کے فکروفن کے سلسلے میں بڑے چھوٹے متعدد اہل قلم نے اپنے مطالعات پیش کئے ہیں۔ یہ اتنی تعداد میں ہیں کہ ان پر مشتمل ایک الگ کتاب ''نجمہ محمود: شخصیت اور فکروفن'' یا اسی طرح کے کسی نام سے مرتب ہوسکتی ہے۔ اور یہ کام ہونا چاہئے، نجمہ محمود ایک ایسی تخلیق کار ہیں جنھیں اردو تخلیق کی مروجہ اصناف شعرونثر میں سے کسی ایک صنف کے لئے مختص ومحدود نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے یہاں جس طرح شاعری اور نثر کی تفریق بے معنی نظر آتی ہے اسی طرح ناول، افسانے اور اس نوع کی دوسری بیانیہ تحریروں کی علیحدہ پہچان کے کوئی معنی نہیں۔ ایک اصیل فن کار ہیئتوں کا غلام نہیں ہوتا۔ نجمہ کا غیر معمولی تخلیقی فشار بنے بنائے چوکھٹے میں مقید نہیں رہ سکتا۔ غالب نے بہت پہلے یہ بتادیا کہ:

ہاتھ دھودل سے یہی گرمی گراندیشہ میں ہے
آبگینہ تندئی صہبا سے پگھلا جائے ہے

نجمہ کا سیل فکرو احساس پابندیاں قبول نہیں کرتا، تخلیقی تحریروں کی جو تقسیم کہانی ''تذکرے'' افسانے اور ناول کے عنوانات کے تحت کی گئی ہے اسے رسمی ہی کہا جاسکتا ہے۔ ایسا تو محض ان لوگوں کی تسلی کے لئے کیا گیا ہے جو خمار رسوم وقیود میں مبتلا رہتے ہیں۔ کہانی اور افسانے کی الگ الگ صنفی تقسیم کا معاملہ بھی سمجھ میں نہیں آتا، نجمہ کی طرح کچھ اور لوگ بھی ہوں گے جو کہانی کو افسانے سے الگ کوئی صنف تصور کرتے ہوں گے۔ بات تو صرف یہ ہے کہ اردو میں جس صنف کو افسانہ کہتے ہیں اسی کو ہندی میں کہانی کہا جاتا ہے۔ ویسے اس علیحدہ صنفی شناخت سے ہٹ کر دیکھا جائے تو

کہانی دراصل واقعات کے اس تانے بانے کو کہتے ہیں جو افسانے، ڈرامے اور ناول جیسے تمام بیانیہ میں ریڑھ کی ہڈی کی طرح موجود ہوتے ہیں۔ Story element خواہ کسی نثری تحریر میں ہو وہ کہانی ہے۔ کہانی تو ایک Raw meterial ہے کہ اس کے بغیر کوئی نثری تخلیق وجود میں نہیں آسکتی۔ مجھے الجھن ہوتی ہے جب بعض اردو والے افسانے کے ہم معنی ہندی کے لفظ ''کہانی'' کو ایک الگ صنف ماننے پر اصرار کرتے ہیں۔ اس ضمن میں نجمہ محمود سے بھی گفتگو کی جاسکتی ہے۔

خیر یہ نکتہ تو جملہ معترضہ کے طور پر آ گیا ہے۔ بات چل رہی تھی نجمہ کی تخلیقی یورش کی۔ ان کا تخلیقی ابال ہیئتوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ ان کے افسانوں میں ایک پرسکون فضا کا احساس ہوتا ہے جہاں کسی سماوی اور الوہی وجود کا شائبہ ہوتا ہے، جہاں پہنچ کر قاری اپنے وجود کی گہرائیوں سے ہمکنار ہونے لگتا ہے۔ نجمہ مابعد الطبیعات اور ماورائی احساسات کی خوبصورت ترجمانی کرتی ہیں۔ اس مادی دنیا سے پرے ایک جہانِ بے گمان کی تلاش اور کسک ان کی تحریروں میں ایک ایسی سحر انگیز کیفیت پیدا کرتی ہے جو حجاب امتیاز علی کے اسلوب سے ادنیٰ مماثلت کے باوجود ایک منفرد تیور اور سماوی سرور پیدا کرتی ہے۔ نجمہ محمود نے ایک فن پارہ ''جنگل کی آواز'' کے عنوان سے پیش کیا ہے، یہی نام انھوں نے اپنی کتاب کا بھی مقرر کرلیا ہے لیکن ان کی تخلیقات کے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے تک پہنچا ہوں کہ ان کے یہاں وہ ماحول نہیں بنتا جہاں وحوش وطیور کی بے ہنگم آوازیں سنائی دیں، شوروشغب، خوف اور سراسیمگی کی بجائے نجمہ کے یہاں ایک پرسکون ملکوتی وجود کا احساس ہوتا ہے جس کی وجہ سے روحانی بشاشت واہتزاز کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ اپنے من میں ڈوب کے سراغ زندگی پالینے کا ماحول ملتا ہے۔ ان کے کردار بولتے کم ہیں لیکن احساسات کو پیہم جگاتے رہتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں واقعات سے زیادہ محسوسات کا عمل دخل ہے۔ Story element کی کمی نجمہ کے یہاں خودکلامی کی خصوصیت کے ذریعہ پوری ہوتی ہے۔ اصیل تخلیق کا جوہر مرکزے میں رہتا ہے۔ وہیں سے اپنے وجود کا اثبات کراتا ہے۔ ان کے یہاں روحانی شیفتگی آدمی کو انسان بنانے کے لئے ایک ایسا نسخہ کیمیاوی عطا کرتی ہے جس پر مذہب سے زیادہ Theosophical concept کا احساس ہوتا ہے۔ سماجی واخلاقی موضوعات اور ان کی قدروں کی بازیافت نجمہ کے یہاں وقوعوں کے تنوع یا وسعت سے مرتب نہیں ہوتی بلکہ یہ کردار کے

In-born ethical value کی زائیدہ ہوتی ہے۔ نجمہ کا فن اکتساب کا رہین منت نہیں فیضان کا مظہر ہے۔ وہ نا قابل تقلید بھی ہیں اور غیر مقلد بھی۔

(مطبوعہ سہ ماہی ''انتخاب'' پٹنہ، ۲۰۱۲ء)

○

سلمیٰ حجاب

خلیل جبران کے ایک قول کے حوالے سے جب ایک آزاد روح قلم ہاتھ میں لے کر محسوسات کے بحر بیکراں میں اترتی ہے تو وہ گوہر آبدار اپنے دامن میں سمیٹ لاتی ہے جن کی آب وتاب سے ماحول روشن ہو جاتا ہے۔ شاہراہِ حیات پر چراغ خود بخود جل اٹھتے ہیں۔ الوہیت کے نور سے سرشار و معمور وجود روحانی اپنے جسمانی پیکر کی قید سے آزاد ہو کر افلاک وسعتوں میں جب سفر کرتا ہے تو ان ماورائی حقائق کا انکشاف کرتا ہے جو منبع حیات ہیں! پروفیسر نجمہ محمود کی یہ تمام ادبی تخلیقات اسی زمرے میں رکھی جا سکتی ہیں۔ یعنی گوہر آبدار شاہراہِ حیات کے روشن چراغ اور انکشافاتِ حقائق۔

پروفیسر نجمہ محمود کا زیر نظر مجموعہ ''جنگل کی آواز'' نثری تخلیقات کے اعتبار سے مجمع البحرین ہے۔ جس میں افسانے، تذکرے اور مختصر ناولیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مصنفہ کے ادبی قد و وقار کے بارے میں مختلف مصنفین کی قیمتی آراء مضامین کی شکل میں شامل ہیں۔ جن میں سے بیشتر اردو ادب میں اپنا خاص مقام رکھتے ہیں مثلاً سید حامد، سجاد ظہیر، قاضی عبدالستار، سلام بن رزاق اور عظیم اختر وغیرہ۔ مصنفہ نے خود پیش لفظ کے عنوان سے اپنے تخلیقی سفر کی مختصر تاریخ بیان کر دی ہے۔ یوں ان کی تمام ادبی کاوشیں ایک طرح سے ان کے ارتقائی سفر کے مختلف پڑاؤ ہیں۔۔۔ اپنے آپ میں منزل بھی ہیں اور نئی منزلوں کے نقیب بھی۔ تیرہ سال کی عمر ۱۹۵۵ء میں لکھا گیا افسانہ ''میراث'' اور ۱۹۹۹ء میں تحریر کردہ افسانہ ''وجود کے سوتے سے جدا'' بھی شامل ہے۔ ان تمام افسانوں کا سب سے بڑا وصف ہے ان کی انفرادیت۔ موضوع کے لحاظ سے بھی اور اندازِ بیان کے اعتبار سے بھی۔ اپنی تخلیقات کو جنھیں ایک عام قاری افسانہ ہی شمار کریگا، ''کہانی''، ''تذکرے''، ''افسانے'' اور ''ناول'' کے عنوانات سے تقسیم کر دیا ہے۔ مطالعہ کرنے کے بعد کہانی اور افسانے کا فرق قاری کی

سمجھ میں آجائیگا۔ کسی خاص لمحہ کو گرفت میں لے کر کرداروں اور واقعات کے اردگرد الفاظ کے تانے بانے کی مدد سے ایک مخصوص تاثیر پیدا کرنے والے بیانیہ کو مصنفہ نے کہانی کا نام دیا ہے۔ واقعہ نگاری نے ان تمام کہانیوں کے کہانی پن کو برقرار رکھا ہے۔ افسانہ نسبتاً ایک وسیع کینوس پر حرف بیان کے مختلف رنگوں کے امتزاج سے بنائی ہوئی وہ تصویر ہے۔ جس کے پیش منظر میں ادیبہ خود اور پس منظر میں وہ پوری کائنات جلوہ افروز ہے جس کا وہ ایک ''جزو'' ہے۔ وہ ''جزو'' جو کل تمام وسعتیں اور آفاقیت خود میں سمیٹے ہوئے ہے۔ حجاب امتیاز علی کے رنگ میں لکھے گئے تین طرحی افسانے (طرحی افسانے مصنفہ کی ذہنی اختراع ہے جو بالکل نئی ہے) اپنے اندر کائنات کی وسعت اور آفاقیت سمیٹے ہوئے ہیں۔ ادب، فلسفہ، مذہب، تصوف، شعریت اور موسیقیت کے حسین امتزاج سے ان سب افسانوں میں ماورائی حسن پیدا ہوگیا ہے، یہ الگ بات ہے کہ ہر قاری اس سے وہ حظ نہ اٹھا سکے جس کے زیر اثر یہ تحریریں نذر قرطاس کی گئی ہیں۔ شعور کی عمیق گہرائیوں میں پیوست احساس کی جڑوں کی آبیاری کر کے شجر حیات کو پھلنے پھولنے اور ثمر بار کرنے کی سعی کرنا پیکر خاکی میں اسیر روح کو آزاد کرنا، احساس کے سوئے ہوئے چشموں کو آبشار کرنا۔ اور ایک حسین دنیا کے تصور کو زندگی دینا۔ یہ سب ان تخلیقات کا مقصد ہے جو یقیناً نیک بھی ہے اور قابل تقلید بھی۔

انگریزی اور اساطیری ادب سے متاثر ادیبہ نے جابجا ایسے حوالے بھی دئے کہ علم کی آفاقیت پر یقین آجاتا ہے۔ انسانی وجود کی حقیقت اور عالم گیریت پر شبہ نہیں رہتا ہے۔ تلاشِ حق ہمالیہ کی گپھاؤں میں ہو یا 'غار حرا' میں تلاش حق ہی ہے۔ وہ منزل وہ جہاں تمام راستے ختم ہو کر بس ایک نور میں تبدیل جاتے ہیں۔ خود آگہی کی جس منزل پر پہونچ کر ادیبہ نے ان افسانوں اور ناولوں کی تخلیق کی ہے وہ الہام کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ افسانے نہیں یہ تو الہامی نثری شاعری ہے۔ جس میں مصرعے وسعت پا کر افسانے بن گئے ہیں۔ حقیقت نگاری ہے مگر اساطیری انداز کی ''نثر نگاری شاعرانہ انداز کی، منظر نگاری ہے تو افسانوں میں فلسفیانہ انداز کی، کردار نگاری مصورانہ انداز کی۔ اور ان سب کے امتزاج سے ایک خوابناک ماحول پیدا ہوگیا جس کے حسن میں قاری گم بھی ہو سکتا ہے اور ان خوابوں کی تعبیر پانے کی آرزو بھی کر سکتا ہے۔

مجموعہ میں یکجا تمام تخلیقات کی ترتیب سے مجموعہ میں از خود ایک سوانحی رنگ پیدا ہوگیا ہے۔

اپنے بارے میں کچھ مصنفہ نے خود کہہ دیا، کچھ دوسرے مصنفین نے اور کچھ خود مصنفہ کی تحریروں نے! اپنی تخلیقات کو یوں پیش کرنے کا طریقہ بھی اپنے آپ میں ایک قدرت رکھتا ہے۔ اپنی تخلیقات کے معیار کے بارے میں اپنی رائے پیش کرنا بھی ایک نیا قدم ہے۔ یہ تبصرہ مجموعہ کے مجموعی تاثر کے زیر اثر تحریر کیا گیا ہے۔ ان کہانیوں اور افسانوں یا کسی خاص کہانی یا افسانہ کے معیار ومقام کا فیصلہ اہل نقد ونظر ہی کریں گے۔

موجودہ دور کی افسانہ نگاری (جس میں تخیل کی نفی اور حقیقت نگاری پر زور دیا جاتا ہے) کی دنیا میں یہ افسانے جو مقام پائیں مجھے اس سے غرض نہیں مگر یہ سچ ہے ایک سچے، دیانتدار، ایمان دار، ذی حس اور فطری ادیب کو یہ تمام تخلیقات اس دنیا میں ضرور لے جائیں گی جہاں اسکو حسنِ فطرت سے اپنی ہم آہنگی کا سرور طاری ہو جائیگا اور اپنے نورانی وجود کا احساس اجاگر ہوگا۔ نجمہ محمود صاحبہ انسانیت کی خدمت کو ادب کا فرضِ اولین سمجھتی ہیں اور اسی مقصد کی تکمیل کے لئے کوشاں ہیں۔ خدا انھیں کامیابی عطا کرے۔ آمین۔

یوں تو میں ہمیشہ ہی یہ لکھتی ہوں کہ کتابیں خرید کر پڑھیں مگر اس مجموعہ کیلئے میں خاص طور پر یہ اپیل کر رہی ہوں کہ اسے ضرور پڑھیں۔ خواہ قرض لے کر پڑھیں۔ درِ دل کو اور دیدۂ بینا کو کھول کر پڑھیں تا کہ گلشن ادب سے آئے ہوئے ان مہکتے ہوئے جھونکوں سے آپ کی روح سرشار ہو سکے۔

ادیبہ محترمہ سے ایک گذارش ہے، اپنی بالکل نئی اور خوبصورت تحریروں کے ذریعہ انھوں نے سوئے ذہنوں اور خوابیدہ روحوں پر دستک دی ہے۔ ان دستکوں سے دروازے کھل بھی سکتے ہیں اور دروازہ کھولنے والے سوالات بھی کریں گے۔ ان تمام استفسار کے جوابات کے لئے وہ تیار رہیں۔ اگر والہانِ ادب کے قلم سانس لے رہے ہیں تو ردِ عمل کا اظہار ہوگا۔

(مطبوعہ امکان، لکھنؤ، مئی۔ جون ۲۰۱۲ء)

○

ذکی طارق

افسانہ، کہانی اور ناول نگاروں میں مردوں کے مقابلے خواتین تخلیق کاروں کی خدمات کہیں احسن، مربوط اور قابل ذکر ہیں۔ معاشرتی طور پر اگر غور کیا جائے تو خواتین کو غور وفکر کرنے

میں برتری حاصل ہے کیونکہ ہندستانی معاشرے میں عورت ، مرد کے مظالم کا شکار رہتی ہے۔ مسلمانوں میں ہندو معاشرے کی بے شمار رسمیں اور بدعتیں اس انداز سے درآئی ہیں جیسے یہ مذہبی بنیاد پرمبنی ہوں جبکہ اسلام نے عورت اور مرد کو برابر کے حقوق دیے ہیں۔ وراثت میں بھی خواتین کے حقوق کو تسلیم کیا گیا ہے۔ شوہر سے مہر کے علاوہ والدین کی جائیداد میں اگر دو حصے کے تو ایک حصہ بیٹی کا ہے۔ اس کے علاوہ گھر کے کام کاج میں اگر عورت اپنے شوہر کے علاوہ اس کے والدین کی اور اس کے بچوں کی خدمات انجام دیتی ہے تو یہ شوہر پر احسان کرتی ہے۔ حدتو یہ ہے کہ اپنے بچوں کو دودھ پلانا بھی شوہر پر احسان کرنے کے مترادف ہے لیکن ہندستان خصوصاً غیر منقسم ہندستان میں شوہر اپنی بیویوں سے نہ صرف اپنے والدین اور اپنی خدمات کو اپنا حق سمجھتے ہیں بلکہ وہ اپنی بیٹیوں کو بھی جائیداد میں حصہ دینے سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔ ان حالات سے نبردآزما عورت ہمیشہ غور وفکر میں مبتلا رہتی ہے اور کچھ تعلیم یافتہ خواتین اگر اپنے شوہر سے اپنے حقوق کا مطالبہ کرتی ہیں تو یہ معیوب سمجھا جاتا ہے۔ نجمہ محمود ایسی تعلیم یافتہ مصنفہ ہیں جنھیں اپنے حقوق کا ادراک ہے بلکہ عورتوں کے مسائل سے وہ کماحقہ واقف بھی ہیں یہی سبب ہے کہ ان کے افسانے ہوں یا ناول یا کہانی، ان میں انھیں مسائل کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور عملی طور پر اس ظلم وجبر کے خلاف خود بھی حصہ لیا ہے۔

پروفیسر نجمہ محمود کے افسانوں اور ناولوں میں ہندستانی معاشرے کے وہ مناظر جلوہ گر ہوئے ہیں جنھیں بڑی گہرائی کے ساتھ اور سادہ اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ ان مناظر میں مثبت اقدار بھی ہیں اور منفی بھی۔ منفی اقدار کو کہانی میں اسی لیے اجاگر کیا جاتا ہے تاکہ مثبت اقدار کی اہمیت واضح کر سکے لہٰذا اس نقطۂ نظر سے ہر منفی قدر کی اہمیت سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ یوں بھی فطری طور پر رات اور دن کا تصور ابتدائے آفرینش سے موجود ہے اور حقیقت کا ہونا بلند مقاصد کے تحت ہی قائم ہوا۔

نجمہ محمود کے فن میں کچھ تو فطری احساسات کی جلوہ گری ہے اور کچھ ان کے مطالعے کا اکتساب۔ اکتساب سے اختراعی صلاحیتیں نمو پاتی ہے اور مطالعہ اگر بالغ نظری کے ساتھ کیا جائے تو اس کے اثرات زیادہ جامع ثابت ہوتے ہیں۔ سعدی، عطار، رومی، دانتے، خلیل جبران، ٹیگور، اقبال، شیکسپیئر اور اسی انداز دیگر فلاسفہ زندگی کی اعلا حقیقتوں کی طرف متوجہ کرتے ہیں جس سے نجمہ محمود نے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ بقول سید حامد:

''نجمہ محمود کی نگارشات سے ان کے وسیع مطالعہ کے ثبوت ملتے ہیں۔
انگریزی ادب پر عبور سے عام ذوق ادب پر نکھار آ گیا ہے۔زبان وبیان
کے لطافت ونکات ان کی رگِ جاں میں پیوست ہیں۔ نجمہ محمود کا نشانِ
امتیاز ادب کی تخلیق اور ادب کی قدر شناسی ہے جس کے لیے قدرت نے
ان کا انتخاب کیا ہے''۔

(اقتباس از ''نجمہ محمود کا نشانِ امتیاز'' مشمولہ جنگل کی آواز: ادبی تخلیقات کا مجموعہ،ص:۲۴۳۔۲۴۲)
مطبوعہ (اردو بک ریویو)

○

پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی

کتاب پیش لفظ کے علاوہ حسب ذیل عناوین میں تقسیم ہے:
کہانیاں (تعداد۱۳)، تذکرے (تعداد ۵)، افسانے (تعداد۳)، ناول (تعداد۳)، کہتی ہے خلق خدا (تعداد۲۳) اور مضامین، ان کے نہیں، دوسروں کے ان کے بارے میں (تعداد۶) پیش لفظ خود مصنفہ کا لکھا ہوا ہے اور ۱۸ صفحات پر محیط ہے۔ پیش لفظ میں مصنفہ نے کہانی کی جو تعریف خود یا دوسروں کے حوالے سے بیان کی ہے ہم اس سے جزوی اتفاق ہی کر سکتے ہیں۔ ہمارے خیال سے ''سرشاری کی کیفیت اور جمالیاتی حظ'' تو صحیح ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ ''وجود کے کرب سے نجات'' کی ضامن ہو۔اس کے بہ خلاف وہ بسا اوقات ''وجود کے کرب'' میں اضافے کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔رہا مسئلہ شاعری اور کہانی کے باہمی تعلق کا تو یہ صحیح ہے کہ مثلاً شیکسپیئر کے یہاں شاعری اور کہانی ایک ہو گئے ہیں۔ مولانا رومی کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔خلیل جبران شاعر تھے یا کہانی کار اس میں اس لیے اختلافات کی گنجائش ہے کہ ان کے یہاں بھی شاعری اور کہانی کی سرحدیں غیر معمولی طور پر قریب سے گزرتی ہیں۔ہمیں یاد آتا ہے محترمہ نجمہ محمود نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے ایک سمینار میں مقالہ پڑھتے ہوئے جبران کو شاعر کی حیثیت سے پیش کیا تھا اور بعد میں ہم نے اس سے اختلاف کیا تھا۔ یہاں ایک پرانی بات دہرا دی جائے۔ راقم الحروف سے اس کے پہلے انٹرویو میں سوال ہوا تھا کہ جبران کیسی

نثر لکھتے ہیں۔ اس نے جواب دیا تھا ادب لطیف سے ملتی جلتی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین انٹرویو کی صدارت فرما رہے تھے۔ ان کا ریمارک تھا یہ ادب لطیف جبران نے نیاز فتح پوری سے سیکھا ہوگا۔ راقم الحروف نے ہمت کر کے عرض کیا تھا کہ نہیں، نیاز صاحب نے جبران سے اخذ کیا ہے۔

''ادب کو خانوں میں تقسیم کرنا'' اس لحاظ سے تو یقیناً ''غیر مستحسن'' ہے کہ کون بڑا اور کون چھوٹا جیسا کہ خود مصنفہ نے ایک ہی سطر اوپر ایک صاحب کا قول نقل کیا ہے کہ ''شاعری اگر پیغامبری ہے تو افسانہ خدائی ہے'' اور غالباً ان کا مقصد بھی اس دعوے کی تردید ہے۔ انھوں نے پیش نظر افسانوی مجموعے کی تخلیقات کو ''ایک فن کار کا مطالعہ'' کہا ہے جو ''ذاتی بھی ہیں اور آفاقی بھی''۔ مصنفہ کی یہ رائے درست ہے کہ افسانے کا اسلوب راست بیانی اور ابہام کی درمیانی شکل ہونا چاہیے ورنہ راست بیان اسے سپاٹ بنا دے گی اور ابہام قاری کو ''مخمصے میں'' ڈال دے گا۔ ہمارے نزدیک فن کے موضوع سے زیادہ اہم افسانہ نگار کا Treatment ہوتا ہے۔ Treatment کی بلندی ادنیٰ موضوع کو بلندی اور اس کی پستی اعلیٰ موضوع کو پستی عطا کر سکتی ہے۔ افسانے میں افسانویت کا پایا جانا تو یقیناً شرط اولین ہے۔ اگر اس میں افسانویت نہیں ہے تو وہ افسانہ نہیں ہو سکتا چاہے اور جو کچھ بھی ہو جیسے کہ اگر شعر میں شعریت نہ ہو تو آپ اس کا جو نام چاہیے رکھ دیجئے، وہ شعر نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک مقصدیت کا سوال ہے اس میں ہمیشہ دو رائے رہی ہیں اور رہیں گی۔

ہمارے خیال سے ان افسانوں کی کہانی، افسانہ اور تذکرہ میں تقسیم غیر ضروری تھی۔ وہ مختصر ہوں یا طویل تر ہیں، بہر صورت، افسانے ہی۔ البتہ ناول کو ان سے جدا رکھنا ضروری تھا کیوں کہ وہ فکشن کا حصہ ہوتے ہوئے بھی افسانے اور کہانی سے مختلف نوعیت کا حامل ہوتا ہے۔ نجمہ محمود صاحبہ کی زندگی کا حاوی جذبہ مذہب محسوس ہوتا ہے۔ مذہب ایک اعلیٰ وارفع جذبہ ہے اور اس کی پاس داری ایک مستحسن عمل ہے لیکن جب مذہب کا رشتہ فن سے جوڑا جائے تو سوال وہی Treatment کا سامنے آتا ہے۔ اقبال ایک بڑے فن کار ہیں لیکن ایک بڑے فن کار کی اصطلاح ماہر القادری، حفیظ جالندھری، نسیم حجازی یا ایم۔ اسلم پر صادق نہیں آتی حالاں کہ ان سب کا مذہب سے قریبی علاقہ ہے۔ اقبال کو بڑا شاعر بنانے میں ان کی فکر کو بھی یقیناً بہت دخل ہے لیکن اس سے زیادہ دخل فن پر ان کی گرفت کو ہے ورنہ وہ سب بھی اتنے ہی بڑے فن کار ہوتے جن کے نام اوپر

گنوائے جتنے بڑے فن کا اقبال ہیں۔ اب ذرا نیچے اتر آیئے۔ تصوف کتنوں کی شاعری کا جزو اعظم ہے لیکن کیا وہ سب سید امین اشرف کے درجے کے شاعر ہیں؟ مذہب کی کوئی بھی مخصوص شاخ ہو (اور تصوف بھی یقیناً اس کی ایک شاخ ہے) پہلا سوال اسے سیکھنے اور ہضم کرنے کا ہوتا ہے۔ بڑی بڑی ڈگریاں بہت سے حاصل کر لیتے ہیں لیکن ان کے تقاضے ہم میں کتنے پورے کرتے ہیں یہ سوچنے کی بات ہے۔ اسی طرح مذہب کو بنیاد بنا کر فکشن یا شاعری کی تخلیق (لغوی معنی میں) کرنے سے وہ افسانہ، ناول، ڈرامہ یا شاعری عظیم نہیں بن جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح یہ بھی درست ہے کہ فن کا مذہب سے علاقہ لازمی طور پر اس کی عظمت میں کمی نہیں کر دیتا ہے۔ اس لیے دیکھنا یہ ہوگا کہ نجمہ محمود صاحبہ نے مذہب کو اپنے فن کی اساس کس طرح بنایا ہے۔ ان کے بعض افسانوں کے عنوان ہیں ''پانی اور چٹان''، ''لہر لہر سمندر''، ''آسماں تیری لحد پر''، ''بوڑھا برگد''، ''غار'' اور ''جنگل کی آواز''۔ اس آخر الذکر کو انھوں نے ناول کہا ہے۔ ان سب عنوانوں پر غور کیجیے۔ ان کا رشتہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی مذہب سے جڑ جاتا ہے لیکن یہ براہ راست مذہبی عنوانات نہیں ہیں۔ اگر انھوں نے ان عنوانوں کے بجائے ایسے عنوان تجویز کیے ہوتے جو کسی مذہب کی طرف براہ راست اشارہ کرتے تو ان کا وہ تاثر نہ ہوتا جواب ہوتا ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ ان پر نظر ڈال کر آپ کے اندر وہ تجسس نہ پیدا ہوتا جواب ہوتا ہے۔ اسی کا نام فن ہے۔ جنگل کی آواز کی ہیروئن اپنے ''وجود'' کی تلاش میں ہے۔ وہ پکارتی ہے: ''کہاں ہو تم میرے وجود''..... آواز جنگل میں گونج بن گئی...... کہاں ہو تم..... کہاں ہو تم؟...... وہ میرے وجود میں سرایت! میرا اپنا وجود! بانسری، نغمے..... اس کے لبوں پر رومی کا یہ شعر لرز اٹھا۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند   در جدیہا شکایت می کند

اس نے زیر لب کہا بانسری سے سن وہ کیا حال بیان کرتی ہے اور اپنے ہجر و فراق کی کیا شکایت کرتی ہے...... شیکسپیئر کے طربیوں میں جنگل کا پس منظر...... جبران کا جنگل سے عشق......! اس نے زیر لب کہا، جنگل بھیگا بھیگا تھا، درختوں کی شاخیں کائی پوش تھیں، پتے ٹوٹ ٹوٹ کر زمین پر بچھ گئے تھے...... جگہ جگہ گڑھوں میں پانی بھرا ہوا تھا...... دُھلے دُھلے سبزے کی روئیدگی، چشمے کی نمو، خاردار جھاڑیاں، کہیں تر و تازہ کاسنی پھولوں کے جھنڈ، دور سے جانوروں کے

بولنے کی آوازیں اور بڑھتا ہوا اندھیرا، جنگل کی تازہ ہوا فرحت بخش تھی۔ اس کی رگ و پے میں ایک سرور و انبساط کی کیفیت پیدا ہوئی، یکا یک اسے احساس ہوا کہ وہ تنہا ہے لیکن...... وہ تنہا کب ہے؟ چوں بہ خیال سرخوشیم دو ہستیاں جب ایک دوسرے میں ضم ہو جائیں، تحلیل ہو جائیں تو وہ ایک ہو جاتی ہیں اور تنہائی و جدائی بے معنی ہو جاتی ہے۔'' وجود کی تلاش جب احساسِ تنہائی سے اوپر اٹھا دے تو یہ عشق کا اعلیٰ مقام ہوتا ہے اور اس عشق کا منبع و مرجع جتنا ارفع و اعلیٰ ہوگا عشق بھی اتنا ہی پاکیزہ اور جاوداں ہوگا۔

ان کے افسانے ''پانی اور چٹان'' کا ذکر کئی جگہ آیا ہے، خود انھوں نے بھی کیا ہے اور اپنے افسانوں سے متعلق جن حضرات کے خیالات نقل کیے ہیں انھوں نے بھی۔ یہ ایک خاصہ طویل افسانہ ہے۔ یہ افسانہ ایک پینٹنگ سے شروع ہوتا ہے اور پھر ہیروئن کی آنکھوں کے سامنے بیرونی مناظر آجاتے ہیں اور وہ فطرت کے حسن کے اعتراف پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اعتراف حسن اسے فکر کی دنیا میں لے جاتا ہے اور اسے یاد آجاتا ہے کہ قرآن کریم بھی فکر ہی کی دعوت دیتا ہے اور پھر وہ فکر کی مختلف سطحوں سے گزرنے لگتی ہے۔ اللہ کے کلام کے علاوہ دوسرے مختلف زبانوں کے بڑے ادیبوں اور شاعروں کی طرف دھیان چلا جاتا ہے کہ ان کی کتابیں اس کی الماری کی زینت تھیں۔ ان میں ابوالکلام آزاد اور عبداللہ یوسف علی (قرآن مجید کے ترجموں کے حوالے سے) ہیں، میر، غالب، اقبال، ٹیگور، جبران، شیکسپیئر اور رومی ہیں۔ وہ سوچتی ہے کہ ایسے عظیم المرتبت ساتھیوں کے ہوتے ہوئے اسے تنہائی اور خلا کا احساس کیوں ہے۔ وہ ان ہی خیالات میں کھوئی ہوئی تھی کہ ان میں رخنہ پڑتا ہے، طبیعت بدمزہ ہو جاتی ہے، افسانوں کا تصادم ان کے اخلاق، کردار اور مزاج کے اعتبار سے رونما ہو جاتا ہے اور اب افسانہ نیا رخ اختیار کر لیتا ہے۔ بے جوڑ شادیاں اور پھر باقی افسانے کا اصلی موضوع یہی قرار پاتا ہے۔ قدیم اور جدید کی کش مکش، بزرگوں کی یہ رائے کہ چھوٹے ہر اعتبار سے ان کے تابع فرمان ہیں، بزرگوں میں بھی مردوں اور عورتوں کی فکر کے دائرے ہمیشہ متوازی نہیں چلتے ہیں، ایک دوسرے سے ٹکراتے بھی ہیں۔ اس طرح یہ افسانہ جہاں ایک طرف دو نسلوں کے تصادم کی روداد بیان کرتا ہے وہاں دو جنسوں کے رویے کے فرق کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ پیش نظر افسانے کی ہیروئن ماں کے مقابلے میں اپنے کو باپ سے زیادہ قریب محسوس کرتی ہے، شاید

ایک نسل پہلے کی اس لیے کہ اب مرورایام نے یہ فرق بڑی حد تک مٹا دیا ہے۔ افسانے کی ہیروئن شاہینہ بالآخر ہمت باندھتی ہے اور بے جوڑ شادی سے انکار کردیتی ہے لیکن پھر ایک موڑ آتا ہے۔ یہ موڑ جس طرح آتا ہے کچھ دل کو لگتا نہیں، کچھ غیر حقیقی سا محسوس ہوتا ہے۔ ہم نے سنا تھا بعض باتیں صرف سینما کے پردوں پر ہوتی ہیں یا افسانوں میں، حقیقی زندگی میں نہیں ہوتیں۔ اس کا مطلب ہے کہ فلم اور افسانے کو حقیقی زندگی سے جدا ہونا چاہیے یا پھر ہوسکتا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد کے یا راشدالخیری کے زمانے میں ہوتی ہوں، اب تو بالکل نہیں ہوتیں۔ ہاں ایک صورت میں یہ تبدیلی ہوسکتی ہے۔ عشق عقل پر غالب آجائے لیکن یہاں تو عشق کا بھی دور دور پتہ نہیں تھا۔ پھر یہ تالیف قلب کیوں؟ ہمیں تو وہی شاہینہ پسند آتی تھی جس نے ہمت کر کے دل کی بات کہہ دی تھی، یہ دوسری شاہینہ بالکل پسند نہیں آئی۔ خدمت خلق کا ایسا جذبہ بھی کس کام کا؟ اگر کسی ''ثریا'' نے کسی جاہل لڑکے کو پڑھا لکھا کر اس سے شادی کر لی تھی تو ممکن ہے وہاں معاملہ عشق کا رہا ہو یا پھر وہ نذیر احمد کے زمانے کی بات ہو، یہاں تو ایسی بھی کوئی صورت نہیں تھی۔ باقی افسانہ اسی اجمال کی تفصیل ہے۔

''کہانیاں'' اور افسانے کا فرق شروع میں واضح نہیں ہوتا ہے۔ بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ افسانے طرحی غزل کے مترادف ہیں اور حجاب امتیاز علی کے افسانوں کے نمونے پر لکھے گئے ہیں۔ حجاب امتیاز علی نے اپنے افسانے آج سے تقریباً ۷۰ سال قبل لکھے تھے اور انھوں نے اس وقت کے اور کچھ بعد میں آنے والے نوجوانوں کو اپنی طلسماتی فضا اور اپنے دلکش اسلوب نگارش سے بہت متاثر کیا تھا۔ طرز تحریر محترمہ نجمہ محمود کا بھی بہت خوب صورت اور دل نشیں ہے۔ ممکن ہے ان کے یہ طرحی افسانے پڑھ کر آج کی نوجوان نسل بھی متاثر ہوتی ہو۔

ناول تین ہیں۔ جنگل کی آواز کو بھی مصنفہ نے ناول ہی کے زمرے میں رکھا ہے۔ جس پر ہم تبصرے کے آغاز میں کسی قدر گفتگو کر چکے ہیں۔ ''صنوبر کے سائے تلے'' طرحی ناول ہے اور یہ طرح حجاب امتیاز علی ہی کی دین ہے۔ ناول ''مانجھی'' صرف دو صفحوں کا احاطہ کرتا ہے۔ ہم نے اتنا مختصر ناول اس سے قبل نہیں پڑھا۔ دراصل اس ناول کا مانجھی کوئی پہنچی ہوئی شخصیت ہے جو خوف زدہ مسافر خاتون سے کہتا ہے: ''مجھے خوف نہیں محسوس ہو رہا ہے کیوں کہ خدا حافظ ہے، ہر سو موجود ہے۔'' اور جب طوفان تھم جاتا ہے، کشتی کنارے لگ جاتی ہے تو مسافر خاتون دریافت کرتی ہے:

''کیا تم اسی دنیا کی مخلوق ہو مانجھی؟'' وہ جواب دیتا ہے: ''ہاں، میں اسی دنیا کی مخلوق ہوں اور مجھ جیسوں کا جنم تم جیسوں کے لیے ہی ہوا ہے۔'' ابھی اسی نام کا ناول غضنفر کا لکھا ہوا آیا ہے۔ دونوں کا تھیم مختلف ہے لیکن یہاں ان دونوں کے موازنے کا موقع نہیں۔ ''جنگل کی آواز'' ایک خوبصورت کتاب ہے، گیٹ اُپ کے لحاظ سے بھی اور اندازِ تحریر کے اعتبار سے بھی۔

(ریاض الرحمٰن خاں شروانی (مطبوعہ کانفرنس گزٹ، مئی ۲۰۱۲ء)

○

اے خیام

نجمہ محمود بہت سینئر، باشعور اور پختہ کار فکشن نگار ہیں۔ ان کے لکھنے لکھانے کا عمل تقریباً چھ دہائیوں سے جاری ہے۔ کبھی کبھی اس میں طویل وقفہ بھی آیا لیکن انھوں نے فکشن اور فکشن کی تنقید کی آرا پڑھنے سے خود کو منسلک رکھا، غور و فکر میں منہمک رہیں اور ادب کے باب میں ایک واضح نظریہ قائم کرنے میں کامیاب ہوئیں اور یہ نظریہ تمام لکھنے اور پڑھنے والوں کے لیے بھی مشعل راہ ثابت ہوسکتا ہے۔ ان کے نزدیک ''ادب کا مقصد انتہائی عظیم ہے، نہ انعام و اکرام، نہ شہرت اور نہ recognition۔ ادب اور انسانیت کی خدمت اپنے آپ میں سب سے بڑا انعام ہے۔ ادب سارے علم کی روح ہے، زندگی کی تشریح ہے، تعبیر ہے۔ زندگی کو سنوارنا، اسے اوپر اٹھانا، تہذیب نفس، شخصیت سازی ہی اس کا اصل مقصد ہے اور ہونا چاہیے۔ ساتھ ہی جمالیاتی حظ اور سرشاری کی کیفیت پیدا کرنا جو زبان پر قدرت اور اسلوب کی خوب صورتی کے بغیر ممکن نہیں۔ حسن الوہی صفت ہے اس لیے سرشاری پیدا کرتا ہے۔ اس کے برعکس سوچنا ادبی بددیانتی ہے۔''

نجمہ محمود محض نظریہ قائم کرنے کی حد تک نہیں، بلکہ ایک باعمل خاتون ہیں۔ وہ ادب کو ایک بڑا مقصد سمجھتی ہیں اور ادب کو مقصد کے حصول کا بڑا ذریعہ سمجھتی ہیں۔ وہ مسلسل غور و فکر کرتی رہنے والی ادیب ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ ''ہوس زندگی کو بدصورت بنا دیتی ہے۔ جن کے مقاصد بلند ہوتے ہیں، جن کی نگاہیں آسمان کی رفعتوں پر رہتی ہیں وہ خلوص سے، خاموشی سے کام کرتے ہیں، خودنمائی اور شہرت کی خواہش اور کوشش عدم تحفظ، خود اعتمادی کے فقدان اور یوں کمزور شخصیت کی دلیل ہیں۔''

نجمہ محمود کے مجموعہ ''جنگل کی آواز'' میں ایک طویل پیش لفظ خود انھیں کا تحریر کردہ ہے، جس میں بڑی وضاحت سے انھوں نے معاشرے میں ادب کے کردار پر بحث کی ہے اور ساتھ ہی اپنی مدلل رائے بھی دی ہے، جس سے ہر باشعور قلم کار اتفاق کرے گا۔ نجمہ محمود نے اس اٹھارہ صفحے کے پیش لفظ میں ادب اور خصوصاً فکشن کے منصب کی روح کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔

اس مجموعے میں تیرہ کہانیاں، پانچ تذکرے، تین افسانے اور تین مختصر ناول ہیں۔ ''جنگل کی آواز کو انھوں نے ''مختصر ترین ناول'' کہا ہے۔ ''کہانی'' اور ''افسانے'' کو وہ دو الگ صنف سمجھتی ہیں اسی لیے 'کہانی' اور 'افسانے' کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

نجمہ محمود لکھتے وقت ایک بہاؤ اور سرشاری میں مبتلا رہتی ہیں۔ اور یہ بہاؤ اور سرشاری خاص طور پر ان کے ناولوں میں اور تذکروں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ قاری خود بھی ان کے اس بہاؤ اور سرشاری میں غوطہ زن ہو جاتا ہے۔ نجمہ محمود نے خصوصی طور پر ورجینیا وولف کا مطالعہ کیا ہے اور اسی پر ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی ہے۔ وہ ورجینیا وولف سے بے حد متاثر ہیں اور بہاؤ اور سرشاری کی کیفیت کا حصول اور ان کا اظہار غالباً اسی مطالعے کے مرہون منت ہیں۔

نجمہ محمود ادب میں مقصدیت کی حامی ہیں۔ انھوں نے واضح طور پر کہا ہے کہ:

> ''میرے افسانے خالص مقصدی ہیں۔ ان میں ایک پیغام ہے، شخصیت سازی...... اور تہذیب نفس پر زور ہے، اصلاحِ معاشرہ کی کوشش ہے اور اصلاحِ معاشرہ کی کوشش کوئی فرسودہ و معیوب عمل ہرگز نہیں ہے۔ اس کا مقصد زندگی کو اوپر اٹھانا، اسے خوب صورت بنانا، جینے کے قابل بنانا ہے۔ میرے ان افسانوں میں سبق آموزی ہے، تاریک ذہنوں اور گمراہ مسافروں کے لیے۔ ان میں انسانوں کی بازیافت ہے......''

نجمہ محمود نے درست کہا ہے کہ یہ کوشش کوئی فرسودہ و معیوب عمل ہرگز نہیں ہے۔ اسے براہ راست کہا جائے یا بالواسطہ کیا جائے۔ یہ بہرحال کچھ پیغام دیتا ہوا محسوس ہونا چاہیے اور واقعتاً ایسا ہی ہے۔

کتاب میں نجمہ محمود کے فن کے بارے میں ادبی مشاہیر کی آرا بھی شامل کر دی گئی ہیں، کچھ مختصر آراء اور کئی مضامین کی شکل میں، جن کی کتاب میں شمولیت کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ ان کی تحریریں

بہت واضح ہیں، کہیں ابہام نہیں، کہیں بیانیہ کی صورت میں اور کہیں ''شعور کی رَو'' کی تکنیک میں۔

نجمہ محمود کی ادب کے باب میں طویل خدمات کو مدنظر رکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ فکشن نگاری میں ان کی وہ حیثیت متعین نہیں کی جا سکی ہے جو ان کا حق ہے۔ ان کی پذیرائی اس سے زیادہ ہونی چاہیے۔ انھوں نے خود بھی اس بات کو محسوس کیا ہے اسی لیے اپنے پیش لفظ میں وہ کہیں کہیں تلخ بھی ہو گئی ہیں اور یہ غیر فطری نہیں ہے۔

(مطبوعہ ''روشنائی'' کراچی)

○

”جنگل کی آواز“

مکاتیب

○

''اسی وقت شوفاز موسمی کا عرق لے آئی۔ میں نے کہا''نور'' اب ذرا موجودہ بین الاقوامی صورتِ حال پر بات ہو جائے ورلڈ گورنمنٹ، کوسموپولٹن سٹی، یو۔این او، ہیومن رائٹس، دجالی حکومت اور ہم قلندر صفت متنفس اس دجّالی حکومت کے شکار۔ مسلمانوں میں یہودی موجود ہیں جو نیک انسانوں کا خوف کرتے ہیں مسلمانوں کی اکثریت ابلیس کی گرویدہ ہو چکی ہے۔ صیہونیت، بابری مسجد، مسجد اقصیٰ، ہیکل سلیمانی، رام مندر سب باہم مربوط.....

(اقتباس از:''طرحی افسانہ گل مہر کے سائے تلے'')

پروفیسر عتیق اللہ

محترمہ نجمہ صاحبہ آداب امید ہے بہ خیر ہوں گی۔ ''جنگل کی آواز'' موصول ہوا۔ یاد فرمائی کے لئے شکر گذار ہوں۔ فون پر جو گفتگو ہوتی ہے اس میں بہت سی Missing links واقع ہو جاتی ہیں۔ اکثر جانے پہچانے نام بھی نامانوس اور نئے کا تاثر دیتے ہیں۔ آپ نے دونوں مرتبہ اتنی رواروی اور جلد بازی کے ساتھ دو چار باتیں کیں کہ میں اپنی یادداشت کو کرید بھی نہ سکا۔ اور نہ پوری طرح نام ہی سن سکا۔ صرف نجمہ محمود جیسے کوئی نیا نام ہو۔ آپ کے نام سے بہ خوبی واقف ہوں میرے مطالعے میں آپ کی بہت سی کہانیاں رہی ہیں۔ آپ کی کتاب سے محروم رہا ورنہ میرے مجموعی تاثر کی صورت کچھ اور ہوتی۔ ''جنگل کی آواز'' کو دیکھ کر بہت سی چیزیں میرے ذہن میں نشو ونما پانے لگیں۔ ''پانی اور چٹان''، ''بوڑھا برگد'' اور ''لہر لہر سمندر'' کہیں پڑھی تھیں۔

''جنگل کی آواز'' کے علاوہ دوسری کہانیاں بھی پڑھیں — سب سے پہلی بات تو یہ کہ ہمارے دور کی بے شمار بوجھل اور ٹیڑھی میڑھی کہانیوں کی بھیڑ میں یہ کہانیاں Readable (قرآت نواز) ہیں۔ زبان پر آپ کی گرفت مضبوط ہے۔ تخلیقیت کا ایک سیلاب ہے جس کو بڑی خوبی کے ساتھ ......Retain اور Sustain کرنے کا آپ کو یارا ہے۔ آپ کا سب سے بڑا عذاب آپ کی آگہی اور دوسرے وجود کی آگہی ہے جسے میں Intensity of Existence (شدت وجود) کا نام دیتا ہوں یہ چیزیں میر تقی میر، قرۃ العین، جمیلہ ہاشمی اور پروین شیر میں مشترک ہیں۔ اکثر آپ کے جذبوں نے چیخ کی صورت اختیار کر لی ہے جو خارج اور باطن کے درمیان کی ناآہنگیوں کے شدید احساس سے نمو پاتی ہے۔ آپ کی تحریروں میں ایک زیریں لے شکوہ Complaint اور کبھی کبھی احتجاج کے ساتھ بھی خصوصیت رکھتی ہے۔ یہ چیز بالخصوص داخلی کلامی کے لمحوں میں جا بجا اپنے لئے جگہ بنا لیتی ہے میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ اپنی دنیا جس طور پر مرتب کرنا چاہتی تھیں وہ ایک ادھورا خواب بن کر رہ گئی۔ ایک اداسی، ایک احساسِ کرب، ایک اذیت ناک درد کی لہر ہے جو ان لفظوں کے اندر اور اندر رواں دواں ہے۔ وہ انسان کی ذات ہو کہ باہمی رشتے اور روابط یا علمی سیاست ساری شیرازہ بندیاں تہس نہس ہیں۔ بہت زیادہ باخبری اور بہت زیادہ علم اور بہت زیادہ ترقی نے بھی ہمیں بے حد تنہا اور انتہائی بے بس مخلوق میں بدل کر رکھ دیا ہے۔ آپ کی تحریروں نے اسی تناظر سے جلا پائی ہے۔

(مکتوب مورخہ: ۱۰ر فروری ۲۰۱۲ء)

○

پروین شیر

محترمہ نجمہ محمود صاحبہ

CD ''جنگل کی آواز'' اور ''ریگستان میں جھیل'' آپ نے مجھے یہ خزانہ عطا کیا جس کے لیے بے حد ممنون ہوں، ابھی عجلت میں صرف اس کے ملنے کی خبر کر رہی ہوں۔ از حد شکریہ کے ساتھ۔ میرے لیے کوئی بھی تخلیق عظیم اس لیے ہوتی ہے کہ جس میں ہزاروں دلوں کی دھڑکنیں سنائی دیں۔ آپ کی دل چھو لینے والی تخلیقات ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ کچھ نظمیں تو میرے دل کی آواز ہے۔

یہ CD آپ کے لیے — شاید پسند آئے۔ آپ سے فون پر باتیں ہوں گی۔ CD سن کر محسوس ہوا کاش الفاظ میں اس کا اظہار کر سکتی۔

خلوص

پروین شیر

○

مسرور جہاں

پیاری نجمہ — آداب!

آپ نے یاد رکھا اس کے لیے شکریہ ادا کرنا ایک رسمی سی بات ہوگی۔ آپ کی کتاب ''جنگل کی آواز'' آپ کے خلوص کی مظہر ہے۔ نجمہ بہن ایک شکایت بھی ہے کہ آپ لکھنؤ آئیں اور مجھ سے ملے بغیر ہی چلی گئیں۔ اگر آپ عائشہ صدیقی سے میرا فون نمبر لے کر فون کر لیتیں تو ملاقات کی سبیل نکل آتی۔ پچھلے دنوں بار بار آپ کا خیال آیا۔ رشتہ ٹوٹ جائے...... زندگی بکھر جائے۔ تاہم ایک غیر محسوس سا ربط پیچھا نہیں چھوڑتا۔ کچھ سائے آس پاس نظر آتے ہیں۔ نظر نہ بھی آئیں تو اپنے ہونے کا احساس ضرور دلاتے ہیں۔ آپ کی تحریروں میں جگہ جگہ یہ سائے نظر آتے ہیں۔ محسوس ہوتے ہیں۔ بہت خوبصورت افسانے ہیں۔ خصوصاً ان افسانوں کی فضا بہت متاثر کرتی ہے۔ فطرت کی تمام تر خوبصورتی لفظ لفظ اور سطر سطر میں نظر آتی ہے۔ سبزہ، پھل، پھول، بارش، کہسار، جھرنے، پیڑ، پودے ہماری روح سے بے حد قریب ہیں۔ یہ سب ہماری زندگی کا حصہ

ہیں۔بس دیکھنے والی نگاہ——اور محسوس کرنے والے دل کی شرط ہے۔

نجمہ بہن! جو زندگی آپ نے گزاری ہے اس کے روز و شب کی تصویریں صفحۂ قرطاس پر مرتسم ہیں۔قاری انھیں نظر انداز کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا۔اور یہ خوبی کم تحریروں میں پائی جاتی ہے۔ خدا کرے آپ کا قلم اسی طرح رواں دواں رہے۔(آمین ثم آمین)

بہت ایمانداری سے کہہ سکتی ہوں کہ آپ بہت بہادر ہیں بہت حوصلہ مند ہیں۔

اپنی کتاب ''کہاں ہو تم!ارسال کر رہی ہوں، گر قبول افتد...... ''جنگل کی آواز صدا بہ صحرا نہ ثابت ہو اس دعا کے ساتھ رخصت ہوتی ہوں۔

والسلام: آپ کی اپنی مسرور جہاں

(۲۰۱۲ء)

○

پروفیسر علی احمد فاطمی

نجمہ آپا، آداب!

آپ کی کتاب ''جنگل کی آواز'' ملی۔اس میں سے کچھ چیزیں پڑھی ہوئی ہیں۔پھر بھی اس کتاب کو سنجیدگی سے پڑھوں گا اور جو بھی بری بھلی رائے قائم ہو سکی تو لکھوں گا بھی۔

آپ نے کئی طرح کی چیزیں یکجا کر دی ہیں۔''جنگل کی آواز'' ایک زمانے میں پڑھا تھا اور پسند بھی آیا تھا۔پھر پڑھوں گا۔

آپ کی بکھری ہوئی چیزیں اکٹھا ہو گئی ہیں۔یہ بہت اچھا ہوا۔میری طرف سے مبارکباد قبول کیجئے۔

خدا کرے آپ اچھی ہوں

مخلص: علی احمد فاطمی

○

○

وجود کے درخت کی گھنیری پتیوں کے درمیاں ہوا بھی
فضاؤں کی عمیق وسعتوں کو چیرتی ہوئی صدا بھی

(از: 'ریگستان میں جھیل')

''ریگستان میں جھیل'' (شاعری کا مجموعہ)

(مضامین/تبصرے)

○

تم جو سچ کے امیں

قلم کر دو ہمارے بازوؤں کو
ہمارے ہاتھ میں اک زہر کا پیالہ تھما دو
کہ ہم سقراط کی مانند
میرا اور حبّہ کی طرح
سچ کے امیں ہیں
ہمارا اور ہم جیسوں کا سر
فرعونیت کے سامنے جھکنے نہ پائے
یہ کوشش ہم نہیں تم ہی کرو گے
یوں ہی انسانیت کی لاج رکھو گے
کہ تم سچ کے امیں ہو.....

(از: "ریگستان میں جھیل")

سید حامد

(حرف اول)

''ریگستان میں جھیل''

نجمہ محمود کی نظموں کا مجموعہ ''ریگستان میں جھیل'' مسودہ کی شکل میں میری نظر سے گذرا۔ یہ نظمیں ایک بے چین روح کی غماز ہیں، ایسی روح کی غماز جو حالات اور گردوپیش سے مفاہمت کرنے کی ہر کوشش میں ناکامیاب ہوتی ہے۔ تنہائی اور اجنبیت کا احساس اسے مضطرب رکھتا ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ تنہائی کے احساس سے مغلوب ہو جائے یا اجنبیت اس کے ذوق زندگی کو شکست دے دے۔ انسانوں سے دوری کے لئے وہ نعم البدل ڈھونڈ لیتی ہے نعم البدل عناصر فطرت میں پانی، باد و باراں، ابر و خورشید میں۔ اس کے یہاں فاصلے ہیں، بحر بیکنار ہے، ساحل ہے۔ طوفان اندر بھی اٹھتا ہے اور باہر بھی۔ طوفان سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت ہے۔ مظاہر فطرت کا مشاہدہ اور دروں بینی دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں باہم متصادم ہوئے بغیر۔ اس کے دل میں طرح طرح کے سوالات سر اٹھاتے ہیں۔ حیات و کائنات کی جستجو اسے بے تاب رکھتی ہے۔ ''رازہائے سربستہ'' کو حل کرنے کی کوشش اس کے لئے حاصل زندگی ہے۔

میں اب ان وسعتوں میں ڈوب جاؤں ہے یہی خواہش
کروں معلوم آخر بادلوں میں شورشیں کیوں ہیں
کہ یہ کالی گھٹائیں یوں برستی جھومتی کیوں ہے
کہ گاتی جھومتی ہیں ساری شاخیں کیوں درختوں کی
ہوائیں گنگنا کر کیوں مجھے مسحور کرتی ہیں

اس شعری مجموعے کو پڑھتے ہوئے ہم فکر، احساس اور جذبے کے کبھی نہ ختم ہونے والے سفر

میں شاعر کے رفیق راہ بن جاتے ہیں مشاہدے کا یہ دوام، دروں بینی کی یہ شدت، مظاہر فطرت کے ساتھ یہ انہماک شاعر کو بیتاب اور بے خوف کر دیتے ہیں اور اسے بالآخر اور وہ بھی کچھ لمحات کے لئے سکون ملتا ہے فن کے دامن میں، تخلیق کی شدت میں جو شرح صدر اپنے ساتھ لاتی ہے۔

دل کے اندر یہ راز داری سے
کوئی چپکے سے مجھ سے کہتا ہے
جنم دو اک نئی کہانی کو
شعر کہہ ڈالو کوئی نظم لکھو

التہاب فکر اور جذبات کا طوفان سکون پاتا ہے تخلیق کے دامن میں۔ سارے مجموعے میں قاری خود کو روبرو پاتا ہے ایک بحر ذخار کے جو طوفان کی طرح چڑھتا ہے اور تخلیق کی خون آشام سیڑھیوں سے اتر جاتا ہے۔

''بدلتے ہوئے موسموں کے رنگ'' میں نیم کے درخت سے شاعر کے راز و نیاز کی روداد نرم روی کے ساتھ دھیمے لہجے میں قلمبند ہوتی ہے۔

پت جھڑ کی سائیں سائیں
نیم کے پیڑ کو پر اسرار بناتی رہی
پتیوں کے ساتھ زرد مہین مہین شاخیں
زمین کو ڈھکتی رہیں
نیم کا پیڑ ہلکا ہلکا سا نظر آنے لگا

''ریگستان میں جھیل'' قدرت کے تضادات وتغیرات وتحیرات کی نقش گری کرتی ہے۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں آزاد نظم اپنے ساتھ فکر اور بیان کی آزادیاں ساتھ لاتی ہے لیکن یہ سب کچھ خطرات کے درمیان ہوتا ہے اگر کہیں جذبے کی لے دھیمی ہوگئی یا وہ ہمہ گیر ترنم جو وزن اور قافیہ کی کمی کو محسوس نہیں ہونے دیتا ٹوٹ گیا تو نظم کشش کھو بیٹھتی ہے، سپاٹ ہو جاتی ہے۔ نجمہ محمود کی

بہت سی نظمیں اس بسیط اور رواں ترنم سے متمول ہیں جسے شاعر قدرت سے اخذ کرتا ہے۔ جو قافیہ اور ردیف کی پابندی قبول نہیں کرتا جو بیرونی سہاروں سے بے نیاز ہوتا ہے۔

زیرِ نظر مجموعے میں جو نظمیں شامل ہیں وہ بیشتر آزاد ہیں لیکن کہیں بلینک ورس کی قلمرو میں داخل ہوجاتی ہیں۔ نظموں کی ہیئت سے قطع نظر وہ ایک منفرد دل کی غماز ہیں جو کبھی کبھی یہ احساس دلاتی ہیں کہ جوالامکھی کسی وقت پھٹ پڑے گا۔ ایسی آتش فشاں طبیعت پر باندھ باندھنا کہاں ممکن ہے۔ ایسی تخلیقات کو لفظی آرائش قبول نہیں ہوتی، نہ عروض کی بندشیں لیکن فن بالآخر بندشوں کا طالب ہوتا ہے اور جلد یا دیر یہ تقاضائے تخلیق نجمہ محمود کو اپنی طرف کھینچے گا۔

(مطبوعہ ''ریگستان میں جھیل'' بہ صورت حرفِ اول)

(۲۰۰۴ء)

○

پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی

ریگستان میں جھیل

اس کتاب پر ''حرفِ اوّل'' سید حامد صاحب کا ہے۔ وہ آج کل شدید علیل ہیں، پڑھنے لکھنے سے قطعاً معذور۔ اس لیے ان کا نام دیکھ کر حیرت انگیز مسرت ہوئی لیکن جب نام کے نیچے سنہ ۲۰۰۴ء لکھا ہوا دیکھا تو حسرت و مایوسی واپس آگئی۔ کتاب شاعری ہے یا نثر۔ اگر شاعری ہے تو کیسی شاعری اور اگر نثر ہے تو کیسی نثر؟ شاید نثری نظم کہنا مناسب ہوگا لیکن وہ نثر ہوتی ہے یا نظم یہ ہماری سمجھ میں آج تک نہیں آیا۔ ہمارے لڑکپن میں ادب لطیف کچھ اسی قسم کا ہوتا تھا۔ پروفیسر نجمہ محمود، خلیل جبران سے بہت متاثر ہیں۔ شاید یہ اسلوب انھوں نے ان ہی سے اختیار کیا ہو۔ وہ خلیل جبران کی تحریروں کو شاعری مانتی ہیں لیکن ہم نے انھیں ہمیشہ نثر سمجھ کر پڑھا، پڑھایا اور تحقیق کرائی۔ ہم سے ہماری پہلی سلیکشن کمیٹی میں دریافت کیا گیا تھا کہ آپ عربی کے کس نثر نگار کو سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ہم نے خلیل جبران ہی کا نام لیا تھا۔ سید حامد صاحب نے اسے ''آزاد نظم'' کے زمرے میں رکھا ہے۔ چلیے مان لیتے ہیں کیوں کہ ہم پچھلے ۳۴ برس سے ان کی اکثر باتیں مانتے آئے ہیں۔

ریگستان میں جھیل سے جس شاعر کا عکس ابھرتا ہے اس کی خصوصیات سید حامد صاحب نے حرف اول میں اچھی طرح بیان کردی ہیں۔ ان کے الفاظ میں ''حیات و کائنات کی جستجو اسے بے تاب رکھتی ہے۔'' اسی طرح کی بعض باتیں انھوں نے اور لکھی ہیں لیکن ان سب کا ماحصل ''جستجو'' ہی ہے۔ گویا پروفیسر نجمہ محمود کی فطرت میں جستجو ایک بنیادی عنصر ہے۔ ایک طرف انھیں دروں بینی سے خاص شغف ہے اور دوسری طرف وہ مظاہر فطرت سے گہری دلچسپی رکھتی ہیں۔ ان کی شاعری میں فکر، احساس اور جذبے کی آمیزش ہے۔ فکر اور جذبے کے ساتھ تخیل کی بلند پروازی اور اظہارِ خیال پر قدرت بڑی شاعری کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غم گینی اور تنہائی پسندی

کو بھی ان کے مزاج میں بہت دخل ہے۔ وہ اس بھری پوری دنیا میں اپنے کو اجنبی محسوس کرتی ہیں۔ دیکھئے ان اشعار میں کیسا اضطراب ہے اور یہ اضطراب بلاشبہ تجسس اور اجنبیت کا غماز ہے:

مراد جو ایک موج

مضطرب، رواں دواں

اِدھر، اُدھر......

یہی تنہا روی

سدا سے ساتھ ہے میرے

یہ تنہائی ہی ساتھی ہے

یہی پہچان ہے میری

ان کی نظم ''حسن کہاں ہے'' صرف چار مصرعوں کی نظم ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ حسن شناس نگاہ کے لیے نہ تاج محل کی ضرورت ہے اور نہ محبوب کے خوبصورت چہرے کی۔

مچھلیوں کو پانی پر تیرتا دیکھ کر

مجھے محسوس ہوا کہ حسن کیا چیز ہے

وہ سحر آگیں نگاہیں ذہن کے

پردوں پر ہنوز مقید ہیں

آپ نے ملاحظہ فرمایا شاعر نے حسن کہاں دیکھا۔ اور محبت کیا ہے؟

محبت کیا ہے

دو روحوں کا

انجانے میں چپکے سے قریب آنا

(محبت ہے روحوں کی گفت وشنید)

''تصویر کے دو رُخ'' اچھی نظم ہے لیکن نسبتاً طویل ہے۔ ایک رُخ وہ ہے جب انسان واقعی جیتا ہے اور دوسرا رخ وہ ہے جب وہ بس جیتا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب سامنے رکھی تھی۔ ایک صاحب تشریف فرما تھے۔ دریافت کیا ریگستان

میں جھیل کیا نام ہوا؟ ہم جواب ٹال گئے۔ چند صفحے پلٹے تو جواب موجود تھا:

سنا کرتے تھے اب تک / ریگزاروں میں کہیں بھی دور تک / پانی نہیں ملتا۔

شاعر کا ذوق سفر اسے ریگزاروں میں لے گیا، سورج کی تپش، ذرّوں کی چیخ، پاؤں میں چھالے پڑ گئے، پانی دور دور تک نظر نہیں آرہا تھا، زندگی وبالِ جان بنی ہوئی تھی کہ:

اچانک حیرتوں میں ڈوب کر ہم نے یہ دیکھا / اک بڑی جادو بھری جھیل ہے / جس میں کہ تا حد نظر / قوس قزح کے رنگ بھرے ہیں۔

یہ ہے شاعر کا تخیل جس تک آپ کی ہماری رسائی کہاں؟ اور یہ تو اس نظم کا ظاہری مفہوم اور لغوی معنی ہیں لیکن اس کا ایک اور مفہوم بھی ہے جس تک اہل دل ہی پہنچ سکتے ہیں۔

پروفیسر نجمہ محمود کی نظمیں بہ یک وقت بیانیہ اور رمزیہ اظہارِ خیال سے مملو ہیں۔ مچھلیوں کی آنکھیں، ریگستان میں جھیل۔ ''ندی'' نسبتاً طویل نظم ہے۔ اس میں ندی کی طغیانی، کچھ جانے انجانے لوگوں کا اس کے کنارے کھڑا رہنا، افسردہ لگنا۔ وہ کون لوگ تھے کیسے لوگ تھے۔ شاعر کے الفاظ میں:

ایسا لگتا تھا

ان کے اندر کا دھواں

باہر آنے کو تڑپتا ہو

اور پھر یوں بھی ہوا

ہاتھ کچھ آگے بڑھے

روکنے کے لیے ان بے قرار موجوں کو

لیکن نتیجہ؟ کوئی اس کے اک دھارے کو بھی روک نہ پایا۔ طوفانِ بلاخیز کا مقابلہ کون کر سکا ہے اور کون اسے روک سکا ہے۔ چاہے کتنے ہی جانے انجانے، اپنے مستقبل سے خوف زدہ اس کی کوشش کریں۔ ایسی ہی آپ کو کئی نظمیں ملیں گیں۔

بعض نظمیں ایسی بھی ہیں جو بے ساختہ قاری کو اپنا ماضی یاد دلا دیتی ہیں (بشرطے کہ اس کے پاس ماضی ہو)۔ ایسی ہی ایک خوبصورت نظم ہے ''پونم کا چاند'':

رات بھر چاندیوں آسمان میں تیرا کیا

جیسے پانی پہ کشتی
اس کو تکتے رہے
اس کو آواز دیتے رہے

یاد ماضی کو ابھارنے کے علاوہ یہ نظمیں فطرت کے حسن سے بھی باخبر بلکہ لطف اندوز کرتی ہیں۔ایسی نظمیں متعدد ہیں (اور انھیں نقل کرنا دشوار ہے) جیسے: رات اور طوفان، بدلتے ہوئے موسموں کا رنگ، آسمانوں کے بدلتے ہوئے رنگ، سدا بہار درخت، شجر سایہ دار، پانی کی دیواریں۔ یہ اور ان جیسی دوسری نظمیں صرف نشاطِ روح کا سروسامان ہی نہیں کرتی ہیں، اپنی افادیت سے بھی آگاہی بخشتی ہیں۔

بعض نظمیں ایسی بھی ہیں جو متنازعہ فیہ کہی جاسکتی ہیں: محبت کیا ہے؟ محض دو روحوں کا ملاپ یا اس میں جسمانی قرب کو بھی اہمیت حاصل ہوتی؟

محبت کیا ہے؟
دو روحوں کا
انجانے میں چپکے سے قریب آنا

(محبت ہے روحوں کی گفت وشنید)

اصغر گونڈوی اسے مان سکتے تھے لیکن حسرت موہانی کبھی نہ مانتے اور اس معاملے میں ہم حسرت کے پیرو ہیں، اصغر کے نہیں۔

کتاب صوری اور معنوی دونوں لحاظ سے خوبصورت ہے۔

(مطبوعہ ''ریگستان میں جھیل'' ۲۰۰۴ء)

○

شمس الرحمٰن فاروقی

ریگستان میں جھیل

نجمہ محمود کئی حیثیتوں سے مشہور اور قابل لحاظ ہیں۔ انھوں نے سید حامد پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔ انھوں نے ورجینیا وولف (Virginia Woolf) پر نہایت عمدہ اور تخلیقی اپج سے بھرپور تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ انھوں نے افسانے لکھے ہیں، شعر کہے ہیں۔ ان کا یہ مجموعۂ کلام کئی اعتبار سے توجہ کا متقاضی ہے۔ نظموں کی خالق شدید طور پر تنہائی اور اجنبیت کے تجربے سے گذرتی رہی ہے۔ روح کا یہ کرب کم وبیش ہر نظم میں نمایاں ہے۔ تیسری بات یہ کہ اس مجموعے کی نثری نظموں پر بھی موزوں ہونے کا دھوکا ہوتا ہے۔ آہنگ کی یہ نفاست کم دیکھنے میں آئی ہے۔ صرف دو غزلیں ہیں، لیکن ان پر عنوان ڈال دیا گیا ہے کیونکہ دونوں میں مصرعے برابر نہیں ہیں۔ پھر بھی دونوں ہی غزلیں / نظمیں مجھے بہت اچھی لگیں۔ ایک دو شعر آپ بھی سنیں۔

وجود کے درخت کی گھنیری پتیوں کے درمیاں ہوا بھی
فضاؤں کی عمیق وسعتوں کو چیرتی ہوئی صدا بھی

دونوں مصرعے برابر نہیں ہیں اس لئے آپ اس کو غزل بھی کہہ سکتے ہیں، ہر چند کہ غزل پن نمایاں ہے۔ دوسری غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

اندر آتش فشاں نہاں تھا مگر
سو گئے رات نہ ہونے پائی

یہاں دونوں مصرعے مختلف بحروں میں ہیں لیکن پھر بھی انھیں غزل کا شعر کہنے کا جی چاہتا ہے۔ نجمہ محمود کے تخلیقی شعور میں کہیں غزل انگڑائیاں لے رہی ہے۔

(مطبوعہ 'شب خون')

○

وحید اختر

مدر گاڈیس'' (طویل نثری نظم)

نجمہ نے شاعری بھی کی ہے۔ غزل تو شاید کبھی نہیں لکھی، لیکن پابند مقفیٰ نظم (راز سر بستہ — وہی رومانیت جو داخلی تجربے میں خارجی ماحول کو ضم کر لیتی ہے) آزاد پابندِ بحر نظم اور نثری نظمیں (مدر گاڈیس وغیرہ) ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے — ان کی شعری تخلیقات میں ان کی شخصیت کی رومان پسندی کا بھرپور اظہار ہے۔ عورت کے حقوق اور آزادی سے لے کر مردوں کی آزادی تک ہر رویہ نجمہ کی رومان پسندی سے متعین ہوتا ہے۔ ''مدر گاڈیس'' جو ان کی سب سے اچھی اور بھرپور نظم ہے اپنے موضوع کے لحاظ سے اردو کے ادبی سرمایہ میں بالکل نئی اور منفرد ہے۔ سامی مذاہب کا خدا جنس سے بالاتر ہے لیکن اُس کے اوصاف، جلال و جمال کو جس طرح مذہبی اصطلاحات میں بیان کیا جاتا ہے اس کی بنا پر وہ صنف قوی کے اپنے تصور کا اظلال (Projction) نظر آتا ہے۔ نجمہ کی رومانیت انھیں اُس دورِ اولیں میں لے جاتی ہے جب عالم میں صرف ایک مذہب تھا اور اس کی ایک ہی دیوی تھی (دیوی ماں) جو محبت اور تخلیق، جلال و جمال کا مظہر تھی۔ نجمہ اس دیوی کو پھر وہ جگہ دلانا چاہتی ہیں جو مرد خداؤں (Male-gods) نے اس سے چھین لی ہے۔ یہ کسی مذہبی عقیدے کا انکار یا اقرار نہیں، شاعرہ کے وجودی تجربے کا اظہار ہے۔ یہ اظہار معتبر ہے اس لیے اچھا اور سچا ہے۔

میں نجمہ سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ وہ مرد خدا کو معزول کر کے دیوی ماں کو اس کی جگہ بٹھا دیں تو کیا پھر مردوں کو آزادی کی نئی تحریک چلانی پڑے گی؟ اور پھر یہ کہ اس تحریک کی وہ خود سب سے زیادہ تائید نہیں کریں گی؟

بحث میں نجمہ مجھ سے یہ نہ منوا سکیں کہ نثری نظم بھی شاعری ہے لیکن اب وہ کہیں گی کہ اگر

مدرگا ڈیس مکمل نظم ہے جب کہ یہ نثری اظہار ہے تو آپ نثری نظم کو شاعری کیوں نہیں مانتے۔ ان کی اس منطق کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔

نجمہ کی یہی منطق ان کی نثری اور شعری تخلیقات کے وسیلے سے آپ کو بھی قایل کر سکتی ہے۔ ان میں وہی سچائی، بے لاگی اور بے خوفی، ضد اور رومانیت ہے جو ان کے مزاج میں ہے۔ آزادی آج کا سب سے بڑا 'ڈائلما' ہے اور اس 'ڈائیلما'' نے نجمہ سے یہ سب لکھوایا۔ مرد سے عورت کی آزادی، عورت سے مرد کی آزادی، مذہب کی تعصبات سے آزادی، معاشرے کی امتیازات سے آزادی اور ذاتی اظہار کی منطق سے آزادی۔ آزادی کے کئی مفاہیم ہیں، کئی سطحیں ہیں، نجمہ کو آزادی کے ان تمام مفاہیم کو سمیٹنا پڑے گا تب ہی ان کا ادبی اظہار اپنا بھر پور اظہار کر سکے گا۔ ان کے انشائیے، خاکے، افسانے پابند اور آزاد اور نثری نظمیں اسی تلاش آزادی کے نقوش ہیں۔ ان کی قید شکنی نے ان کو کسی ایک صنف کا پابند نہیں بنایا۔ یہ محض جدت نہیں آزادی کے اثبات کا ہی ایک طریقہ ہے، ادبی اظہار کسی صنف ادب یا ہیئت کا پابند نہیں۔

(۱۸/جولائی ۱۹۸۲ء)

○

مہرافروز

نجمہ محمود: بندشوں کی جمالیاتی آزادی

میرے واٹس ایپ کے اسکرین پر سرکتے کچھ اوراق۔ میری ادھر سے اُدھر لہراتی نظریں بار بار ایک شئے پر اٹک رہی ہیں۔ وہ ہیں صفحات پر رکھی گئی مہین انگلیاں جو اپنے کسی حسین وجود کا، حصہ ہونے کا احساس دلا رہی ہیں۔ اور یہ جتا رہی ہیں ان صفحات پر بکھرے موتیوں کو میں نے اس صفحہ قرطاس پر اتارا، جس کا جنم داتا، ایک دیوی کا وجود ہے، جس نے خود کو بنایا، منقش کیا، مصفا کیا، چٹان بنی حالات کی لہروں کا مقابلہ کیا، پانی کی ہر دیوار پر اپنی کشتی لے کر چڑھی کہ شاید وہ آسمان مل جائے جس کے لئے اس نے اپنے اس وجود کو نکھارا اور سنوارا تھا۔ اسے حق کا ساتھ ملے، مگر کشتی کا مایوس کن واپسی کا سفر تنہا ہی رہا۔ مگر ہر بار ان کی آسمانوں کو چھونے کی سعی ان کو بلند حوصلے عطا کرتی رہی اور یہ تنہا سفر اب بھی جاری ہے۔ اسی احساس کے ساتھ میں نے ان کا شعری مجموعہ ''ریگستان میں جھیل'' پڑھا جس کا عکس انھوں نے مجھے بھیجا تھا۔

نجمہ محمود ملیح آباد لکھنؤ کی پیدائش ہیں۔ اپنے والد جناب محمود حسن خان اور رضیہ بیگم کی لاڈلی بیٹی اور مقبول حسن خان صاحب کی ہمشیرۂ خاص ہیں۔

ان کی ابتدائی تعلیم اپنے والدین اور بھائی کے زیر سایہ، گھر پر ہی ہوئی، اور انھوں نے بطور باہری طالبہ میٹرک کا امتحان دیا، اور نمایاں کامیابی حاصل کرلی۔ بھائی انگریزی پڑھاتے تھے، جس سے انگریزی شاعری اور ادب کی طرف ان کا میلان بڑھتا گیا۔ پھر انھوں نے کرامت حسین مسلم گرلز کالج میں داخلہ لیا، جہاں انھوں نے انگریزی ادب اور اردو ادب پڑھا۔ آپ رضیہ سجاد ظہیر، ریحانہ باجی اور مس حنان کی تلامذہ رہیں اور ان سے اردو اور فارسی سیکھی۔ اس کے ساتھ آواز بلند کرنا، ہمتِ اظہار اور سلیقۂ اظہار بھی پایا۔

آپ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور پی

ایچ ڈی بھی وہیں سے کی۔ پی ایچ ڈی کا عنوان تھا Virginia Woolf's Concept of Perfect Man...... an Exploration' In Comparative Literature.

یہ تحقیقی مقالہ اپنے آپ میں ایک بہت بڑی تخلیق ہے، جہاں نجمہ محمود نے ،تصوف کی مشرقی روایات کی سطح پر، جس میں مولانا روم سے لے کر علامہ اقبال تک کا تصور خودی اور انسان کامل موجود ہے، اس پر ورجینا وولف کی تخلیقات ،نظریات اوران کے انسان کامل کے تصور کو پرکھنے اور اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو ورجینا وولف کو سمجھنے کا ایک الگ زاویۂ نگاہ ہے۔اس کے بعد وہ پروفیسر بنیں اور 2001 میں اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوئیں۔ (قبل از وقت رٹائرمنٹ لیا)

اس سے پہلے ہی آپ نے تدریس کے پیشے کو اپنا رکھا تھا۔ بحیثیت لکچرار بی ایم۔جی گرلز کالج میں انگریزی پڑھاتی تھیں۔ پھر بہ حیثیت لیکچرار جنوری ۱۹۶۸ء ویمنس کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں آگئیں، وہیں ریڈر بنیں اور پروفیسر کی حیثیت سے سبکدوش ہوگئیں۔

ایک کامیاب پیشہ ورانہ سفر کی تکمیل کے ساتھ آپ نے اپنا ادبی سفر جاری رکھا۔اپنی ذاتی زندگی میں تین بچوں کی پرورش، تعلیم وتربیت کی اور انھیں ایک کامیاب انسان بنانے میں اپنا سارا کچھ لگا دیا۔وہ بیک وقت بہت اچھی ماں، شفیق، مجی استاد، اور ایک ہمہ گیر سوچ رکھنے والی ادیبہ اور شاعرہ ہیں۔انھوں نے تنقید وتحقیق کے میدان میں بھی اپنے گھوڑے دوڑائے۔عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں ورجینیا وولف پر مقالہ پیش کیا بہ عنوان ''عالی فکر میں فیمنزم......

خودی کا محرک وہ حرکت ہے، جو ایک نقطہ کو اپنی دائروی سطح سے اپنے مرکز کی طرف متحرک رکھتی ہے۔جہاں پر ضم ہو کر خودی اپنی تکمیل پاتی ہے۔اس رمزِ کائنات کو نہ صرف نجمہ آپا نے سمجھا، جانا، پرکھا، عمل کے اثرات اور نتائج دیکھے، بلکہ اپنی زندگی اسی یقین کے تحت جی کر یہ ثابت کیا کہ ایک انسان کس طرح اپنی عزت نفس اور وقار کو برقرار رکھتے ہوئے حالات سے نبرد آزما ہو سکتا ہے اور کس طرح خود کو اس سے نکال سکتا ہے۔

نجمہ محمود نے جو ذہنی اولادیں میدان ادب کو سونپی وہ یہ ہیں

Virginia Woolf's Concept of Perfect Man An Exploration in Comparative Literature From the Circle to the Centre.

۳۔ پانی اور چٹان افسانوی مجموعہ (۲۰۰۱) ۴۔سید حامد کہ گم اس میں ہیں آفاق (۲۰۰۳)

سید حامد کہ گم اس میں ہیں آفاق ۴۶۰ صفحات کی کتاب ہے اور ایک تحقیقی تصنیف ہے جو بہت زیادہ مقبول ہوئی ہے۔ بڑے بڑے ادیبوں، دانشوروں اور علما نے اس کی تعریفیں کی ہیں۔ جس کی توقع خود مصنف کو بھی نہیں تھی۔

۴۔ جنگل کی آواز، ادبی تخلیقات کا مجموعہ (۲۰۱۱)

۵۔ جنگل کی آواز ایک مختصر ترین ناول (مطبوعہ بزم سہارا، دہلی، تشکیل کراچی)

۶۔ ریگستان میں جھیل شعری مجموعہ (۲۰۱۴)

۷۔ بے زنجیر جستجو، مضامین کا مجموعہ

۸۔ شعور کی رو والا مقالہ ورجینیا وولف پر تحقیق کے زیر اثر لکھا گیا اور اردو میں شعور کی رو کی موجود تشریح سے اختلاف کرتے ہوئے نیا بیانیہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جو ایک محقق اور ادیب کا تخلیقی اظہار ہے۔

۹۔ خلیل جبران کی شاعری میں رومانی عناصر ایک تحقیقی مقالہ۔

۱۰۔ اصناف سخن کی مستند روایات میں اضافے کے امکانات۔ تحقیقی مقالہ

۱۱۔ احمد ندیم قاسمی عالمی سمینار اور مشاعرے میں شرکت۔ ۱۹۸۸ء

ان ہی کی زبانی، ایک ناول ''سازِ فطرت کے آہنگ'' نام سے لکھ رہی ہیں۔ ''ریگستان میں جھیل'' ان کا واحد شعری مجموعہ ہے، جسے انھوں نے اپنے بیٹے فریدوں شہریار کے اصرار پر شایع کروایا ہے اور انتساب بھی انہی کے نام کر دیا ہے۔ فریدوں ممبئی فلم انڈسٹری سے جڑے ابھرتے فلم جرنلسٹ ہیں جن سے ہماری بہت ساری توقعات وابستہ ہیں۔

''ریگستان میں جھیل'' جس کا فلیپ وحید اختر کا لکھا ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے نجمہ آپا کی کسی نظم یا تخلیق پر تبصرہ لکھتے ہوئے انھوں نے یہ لکھا ہو۔ جس میں نجمہ آپا کی شہرہ آفاق نظم ''مدرگا ڈیس'' کا ذکر بڑی تفصیل سے ہے، اس کا پس منظر بھی انھوں نے لکھنے کی کوشش کی ہے، ساتھ میں یہ اعتراض بھی ہے کہ ''پابند اور آزاد نظم لکھنے کی بحث میں نجمہ مجھے ہرا نہ سکیں۔''

آزاد نظم کا قافلہ اب اتنی دور آچکا ہے کہ پابندی والوں کو اسے تسلیم کیے بنا چارہ بھی نہیں ہے۔ ''ریگستان میں جھیل'' کی طرح آزاد نثری نظموں کا قافلہ اب دور سے دکھائی دے رہا ہے،

جس کی عالم گیر شناخت بن چکی ہے۔

آگے چل کر وحید اختر لکھتے ہیں ''آزادی آج کا سب سے بڑا ڈائیلما ہے اور اسی ڈائیلما نے نجمہ سے یہ سب لکھوایا ہے......'' ان کے انشائیے، خاکے، افسانے، پابند، آزاد، نثری نظمیں اسی تلاش آزادی کے نقوش ہیں۔ ان کی قید شکنی نے اُن کو کسی ایک صنف کا پابند نہیں بنایا۔ یہ محض جدّت نہیں، آزادی کے اثبات کا ایک طریقہ ہے۔ ادبی اظہار کسی صنف ادب یا ہیئت کا پابند نہیں۔' آزادی ڈائیلما نہیں حقیقت ہے، مگر ہر جنس و جان کی آزادی مسخر ہے۔ جسے نجمہ آپا نے بہت واضح انداز میں اپنے ایک عنوان میں بتا دیا'' دائرے سے مرکز کی طرف' ہماری تسخیر دائروی محیط ہے۔ جب کہ ہماری آزادی، ہمارا وہ سفر ہے، جو مرکز کی سمت ہو۔ اب نقطے کی آزادی، کہ وہ دائروی سفر کرے یا خط مستقیم میں۔

اسی کتاب کے پیش لفظ میں سابقہ وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جناب سید حامد نے لکھا ہے 'فن بندشوں کا طالب ہوتا ہے، جلد یا بہ دیر یہ تقاضائے تخلیق نجمہ محمود کو اپنی طرف کھینچے گا۔ یہ الفاظ بھی شاید ان کی نثری نظموں کی طرف ہی واضح اشارہ ہیں۔

نثری نظم جب قافیہ اور ردیف کی بندش سے آزاد ہو جاتی ہے، تو ایک خیال یا احساس کی پابند ہو جاتی ہے جو اپنے پیکر الفاظ پر اتنی گرفت رکھتا ہے کہ اس کے آزاد ہونے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔

(ارشد عبدالحمید) نجمہ آپا نے شاید دس سال کی عمر میں اپنا پہلا پابند شعر لکھا

چاند کے گرد حسین ہالہ ہے
اور ستارے بھی ہیں کتنے روشن

انھوں نے غزلیں بھی کہیں اور پابند نظمیں بھی، مگر شاید اظہار کا تجسس اس جکڑن میں مطمئن نہ ہو سکا اور انھوں نے اپنے پر کھول دئے۔ اس کی بہت بڑی وجہ، ان کا انگریزی ادب کی طالبہ ہونا، استاد ہونا، اور کثرتِ مطالعہ بھی ہے۔ انگریزی ادب میں جہاں پابند نظمیں، گیت اور لے کاری ہے وہیں بلینک ورس اور فری ورس بھی ہے سانیٹ جیسی شئے بھی موجود ہے۔ جب کہ اردو ادب میں آزاد اور نثری نظموں کو اپنی جگہ بنانے کے لئے نصف صدی لگی۔ اور لکھنے والے مرد اور اس سے زیادہ عورتیں موردالزام رہیں کہ انھوں نے بے راہ روی اختیار کر لی۔ فہمیدہ ریاض کی

طرح نجمہ آپا نے نثری نظم اور آزاد نظم پر محنتیں کیں اور اس کی بالیدگی کو اپنے خیال وتصور کا دامن دیا اور خون جگر سے اس کی پرورش بھی کی۔ مشاعروں میں انھوں نے اپنی نثری نظم کو اپنی غزلوں پر فوقیت دی۔ ان کی کچھ مشہور نظمیں یہ ہیں۔

مدر گاڈیس، شجر سایہ دار، ریگستان میں جھیل، گہرائیوں کا خوف، ایک قصہ کہنہ کی تجدید، راز سربستہ، نئے انسان کا جنم، تم جو سچ کے امین، فن اور فن کار، بے زنجیر جستجو، بدلتے ہوئے موسموں کے رنگ، پانی کی دیواریں، وجود کا درخت، وغیرہ۔

ان کی آزاد نظموں کو پڑھنے سے پہلے کچھ اشعار اور غزلیں دیکھ لیں کہ وہ پابند شاعری کہنے پر قادر ہیں۔ ایک شعر:

منظر بہت عجیب تھا ہم کھو کے رہ گئے
دوری پہ آبشار تھا ہم رو کے رہ گئے

○

روبرو تھے وہ ہمارے لیکن
ان سے ایک بات نہ ہونے پائی
دل میں طوفان تلاطم تھا
پھر بھی برسات نہ ہونے پائی
یہ ہماری گھٹن معاذ اللہ
شرح حالات نہ ہونے پائی
اندر آتش فشاں نہاں تھا مگر
سو گئے رات نہ ہونے پائی
اندروں میں تھا سمایا کوئی
پہ ملاقات نہ ہونے پائی

○

میرے اندر ہوائیں چلتی ہیں
جیسی دھیمی پھوار گرتی ہے
مجھ میں دریا ہیں موجزن ہر سو
لہریں اٹھتی ہیں ڈوب جاتی ہیں

کتنا آہنگ ہے اس کلام میں، کتنی ملائمت نرمی وحلاوت ہے۔ یہ شاعرہ کا خوبصورت، نرم، ملائم گداز احساس ہے جو شعر میں ڈھل رہا ہے۔ بقول نجمہ محمود 'شاعری کسی خاص لمحہ کو گرفت میں لانے کا نام ہے۔' ' شاعری انسان کا مکمل کلام ہے، مکمل ترین گفتگو ہے، اور شاعری کو علم کی روح بھی کہا گیا ہے۔

شاعری قافیہ پیمائیوں اور ردیف نبھانے کا ہی نام نہیں ہے۔ اسی لئے ۱۹۸۸ء میں جب وہ ابوظہبی، احمد ندیم قاسمی عالمی سمینار اور مشاعرے کے لئے گئیں اور وہاں انھوں نے اپنی شہرۂ آفاق نظمیں پڑھیں تو بہت پذیرائی ملی۔ علی گڑھ کے ایک خواتین مشاعرے میں جب اپنی نظم ''مدر گاڈیس'' پڑھی، تو وہاں عینی آپا یعنی قرۃ العین حیدر موجود تھیں۔ انھوں نے یہ نظم سنی اور پھر دوسرے دن نجمہ آپا کے گھر آگئیں اور فرمائش کی کہ دوبارہ نظم سناؤ۔ نجمہ آپا کے لئے وہ لمحہ اعزازی تھا۔

ہندو مائیتھالوجی کے مطابق کائنات کو تخلیق کرنے والی ایک دیوی تھی، جس کا حوالہ رگ وید میں موجود ہے۔ اس کا نام اُدِتی ہے، جس نے اپنی محبت سے یہ فطرت اور قدرت بنائی۔ جس میں حسن، خوبصورتی، امن، محبت اور خلوص تھا۔ دھرتی کے باشندے اسی کو پوجتے کہ وہ اصل شکتی تھی۔ پھر خدا پیدا ہوا۔ لوگوں نے آئسس، اُدِتی کی مورتی توڑ ڈالی اور تباہی کے خدا کی پرستش شروع کردی، جو آج تک جاری ہے۔ عالم انسانوں کی قتل وغارت گری سے بھرا پڑا ہے خون، قتل عام، ہاہاکار ہر طرف جاری ہے۔ شاعرہ اسی دیوی کو پکارتی ہے کہ وہ اپنی شکتی سے اس تباہ کاریوں کو روکے، پھر سے خود کو بنائے اور پھر فطرت کو بنادے تاکہ کائنات کا امن، محبت، اور خلوص لوٹ آئے۔

لفظ فیمیزم، فیمین سے اختراع ہے، جس کے معنی قحط اور کمزوری کے ہیں۔ انگریزی ادب کی پروردہ نجمہ آپا 'فیمزم' کے اصل مقصد کو سمجھ چکی تھیں۔ اس لئے دیگر شاعرات اور ادیباؤں کی طرح انھوں نے فیمزم تحریک کی اندھی تقلید نہیں کی، نہ مردوں کی مخالفت کی جو کہ فیمینسٹ رائٹرس کا خاصہ تھا۔ انھوں نے عورت کو محبت، فطرت، ملائمت، وقوت کا استعارہ بنالیا اور مدر گاڈیس کو

استعارہ بنا کر وہ بات کہہ ڈالی جو ساری فیمینسٹ مصنفائیں اور شاعرات نہیں کہہ سکیں۔ مدر گارڈیس کے کچھ حصے دیکھ لیں۔

پہلے تعارف:

''آج سے ہزاروں سال قبل سارے عالم میں صرف ایک ہی مذہب تھا، جس کو مذہب انسانیت کہہ لیں۔ تب فقط ایک دیوی کی پرستش ہوتی تھی۔ پرستش جو کہ انسان کی فطرت ہے۔ Male God کا تصور بہت بعد میں آیا۔ اس مدر گوڈیس کو جو خالق کائنات تھی۔ کئی نام دئے گئے تھے۔ ان میں سے ایک نام اُدِتی تھا جو اسے رگ وید کے زمانے میں دیا گیا۔ مدر گوڈیس جس کی ذات محبت کا بحرِ بے کنار تھی۔ جمال وجلال سے آراستہ..... زندگی کی خوبصورت قدریں جس پر ختم..... اُدِتی کی پرستش دھیرے دھیرے ممنوع قرار پائی اور جس کا زوال ہماری المناک تباہی کا سبب بنا۔

نظم ''مدر گوڈیس'' کا کچھ حصہ پیش خدمت ہے۔

مدر گوڈیس کہاں ہو تم؟
دور افق کے پار ایستادہ
تمہارے پر جلال اور حسین مجسمے پر پتھر برستے ہیں۔
اور تمھارے پرستاروں کی نگاہوں سے لہو ٹپکتا ہے!
تمہاری پرستش پر پابندی لگ چکی ہے۔!!
سمتیں کہر آلود ہیں
اور لوگ بینائی سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔
تمھاری آنکھیں اپنے زوال پر خونچکاں۔
تم جو کبھی سارے عالم پر جاری وساری تھیں!!
مدر گوڈیس، دیوی ماں!
تمھاری مورت تو ریزہ ریزہ ضرور ہوئی
لیکن اس کا جلال وجمال

اس کا خوف ودہشت بدستور رہا
اور آج بھی ہے!
تمھاری پرستش کرنے والے، تم سے عشق کرنے والے
آج بھی اپنی اس دنیا میں
جلاوطن ہیں، اجنبی ہیں، تنہا ہیں
مدرگوڈیس، ماں دیوی، آئسس
تم کہاں ہو، کدھر ہو تم؟
ہم کو تمھاری تلاش یوں ہے
کہ انصاف تمھارا دوسرا نام تھا
سچائی تمھارا ایمان
جرأت اور ہمت تم میں مجسم
تمھارا عہد بڑا پرامن بہت پرسکون تھا
انسان یوں تنہا نہ تھا، جیسے کہ آج ہے
رشتے بہت مضبوط، استوار تھے
خون بہتا نہ تھا رگوں میں دوڑتا پھرتا تھا
موت سے خوفزدہ نہ ہوکر
اسے خوش آمدید کہا جاتا تھا!
مدرگوڈیس، آدتی، آئسس

نجمہ آپا کی اپنے ماحول اور گھٹن سے نکلنے کی خواہش کا مظہر ان کی نظم ''رہائی کی بے سود خواہش'' ہے۔

....

میرے کمرے کی کھڑکی کے باہر ہوا چیختی ہے
بڑا شور ہے، سیٹیاں بج رہی ہیں۔
چمک دھوپ کی بند کھڑکی کے اندر چلی آرہی ہے

ہوائیں فضائیں بہے جارہی ہیں۔
مگر ایک بے نام بستی
مہیب اور پر شور سناٹوں سے جاں بہ لب ہے۔
کھڑکیاں کھول دو
یہ اونچی بہت اونچی دیواریں ڈھا دو
مجھے پنکھ دے کر ہوا میں اڑا دو
مجھے وادیوں، کوہساروں چمن زاروں کی خوشبوؤں میں سما جانے دو
مجھے اس سمندر کی گہرائیوں میں اتر جانے دو۔

شاعرہ اپنے اطراف کی بندشوں سے گھٹن میں ہے، وہ ان سے آزادی چاہتی ہے یہ واضح ہے مگر آزادی کے بعد اسے وادیوں، کوہساروں اور فطرت کی رنگینیوں میں کھوجانا ہے۔ حالات سے فرار کے بعد وہ جہاں جانا چاہتی ہیں وہ ان کی اصل دنیا سے الگ ہیں۔ یہ استعارہ ہے، امن، سکون، سچائی اور حق کا جہاں ان کو شدید ذاتی مخالفتوں اور اہانتوں کا سامنا کرنا پڑا، جسے انھوں نے انتہائی دلگیر انداز میں پیش کیا ہے، کہ پھرتا ہے فلک برسوں، تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں اور ان انسانوں کی جس طرح ناقدری ہوتی ہے، اس کا ذمہ دار کون ہے؟ جو بھی ہے بڑا ظالم ہے!۔ اس نظم کی سب سے اچھی چیز جو لگی وہ یہ ہے کہ نجمہ آپا نے اپنے کسی بھی مخالف کے لیے کوئی بھی اہانت والا، غیر معیاری لفظ اختیار نہیں کیا۔ اپنے قلم اور اظہار کو جس طرح انھوں نے باوقار رکھا ہے وہ انہی کا خاصہ ہے۔

''اگر یہ دنیا تمھاری ہوتی''، نظم ان کا اپنے آپ سے خطاب ہے جس میں ان کی نارسائی کا دکھ بڑی شدتوں سے بول رہا ہے۔ یہ حق بولنے والوں کے بازو کاٹنے کا نوحہ ہے، جو ۱۹۸۰ء میں لکھا گیا ہے۔ یہ کچھ اشعار ایسے ہیں جہاں نجمہ محمود کا عرفان بول رہا ہے۔ ان کی پیاسی روح کو کس کی تلاش ہے:

کہ جس کو زندگی کہتے ہیں وہ کیا چیز ہے آخر
میں اس انجان رستے پر پھروں گی کب تلک یونہی
میں ہر نقش قدم سے کب تلک آخر یہی پوچھوں

مجھے بس اتنا بتلا دے کوئی میں کون ہوں کیا ہوں

مجھے بس اتنا سمجھا دے کوئی میں کون ہوں کیا ہوں

ماورائیت کا سفر شروع ہونے سے پہلے انسان کی خود کی تلاش اس کو سرگرداں رکھتی ہے اور ایسی شعریت وقوع پذیر ہوتی ہے۔ان کا اگلا سفر ''خود کی پہچان'' دیکھ لیں۔

فن جسے معجزہ ہی کہہ لیجیے

سینچا خون جگر سے جائے جسے

ہے لگن سے ہی اصل فن کی نمود

وہ لگن جس سے روز جلتے تھے

دہر کی ظلمتوں میں کتنے چراغ

سب کو ملتا تھا زندگی کا سراغ

دل کے اندر یہ رازداری سے

کوئی چپکے سے مجھ سے کچھ کہتا ہے

یہ چراغ اب تمھیں جلانا ہے

دہر کو روشنی دکھانا ہے''

یہ ان کی عرفانیت کے سفر کی اگلی کڑی تھی جہاں ان کو اپنا عمل اور منزل نظر آ گئی۔

نئے انسان کا جنم

سمندر سے ذرا کچھ دور خشکی پر

کوئی بت آج پھر ٹوٹا

کسی کی روح کی چیخیں سنائی دے رہی ہیں۔

کوئی چپکے سے جیسے کہہ رہا ہو

کہ اس بت کو

اُسی اونچے بہت اونچے سے منبر پر بٹھا آؤ

مگر سب بے سبب ہے

کہ بت کے ٹوٹنے سے

اک نیا انسان اس دنیا میں آیا ہے۔

مناؤ جشن اس انسان کے اس دنیا میں آنے کا

دعا مانگو کہ وہ خود سے بہت اوپر

بہت اوپر کو اٹھ جائے

کہ وہ خود نا خدا بن جائے

اپنی بھٹکی کشتی کا!!

یہ نظم بظاہر تو بہت معمولی ناصحانہ نظم لگتی ہے۔ شاید اصل میں ایک صدی کا رونا ہے۔ ایک تہذیب کے خاتمہ کا بین ہے ایک نظریۂ زندگی کا۔ ایک آفاقی نظام کی ٹوٹ پھوٹ کا جس پر ہزاروں سال کی تہذیب بہت شان سے کھڑی تھی۔ جہاں انسان اپنی اقدار کی وجہ سے بلند اور بہت بلند تھا۔ مگر صارفیت، گلوبلائیزیشن، تجارتی منڈی کے زور آور طوفان نے سمندر انسانیت کو اتنا بے قابو کر دیا کہ ریت پر کھڑا اس کا وجود پارہ پارہ ہو گیا۔ مگر یہ وجود ختم نہیں ہوا، بلکہ ٹوٹتی اقدار نے خود کو سمیٹنے کے حوصلے جوڑ لئے اور ایک نئے انسان، نئی فکر نے جنم لیا، مگر یہ انسان اتنا کمزور ہے کہ ابھی سمندر کے بپھرنے سے بھٹکی کشتی کو دوبارہ ڈال نہیں سکتا۔ اس لئے شاعرہ یہ دعا مانگتی ہے کہ وہ خود سے اوپر، بہت اوپر اٹھ جائے، کہ وہ ناخدا بن جائے، اپنی بھٹکی کشتی کا!!

بے ساختہ اقبال کا شعر ''خودی کو کر بلند اتنا'' کی تشریح یاد آتی ہے۔

نجمہ آپا کہتی ہیں ان کے خاندان میں کوئی دور دور تک بھی شاعر نہیں تھا۔ ان کے کسی چچازاد کے ہم زلف جوش صاحب تھے جن کو انھوں نے بچپن میں کلام سناتے ہوئے سنا تھا۔ مگر ان کی امی کلام اقبال کو با آواز بلند پڑھا کرتی تھیں۔ نجمہ آپا کا بچپن لاشعوری طور پر شعریت کی تحریک پاتا رہا، اقبال کا نظریہ خودی، اور جوش کا مناظر فطرت سے عشق ان کے شعوری بلوغت کا حصہ بنتا گیا، جو ان کے کلام میں ہمیں جا بجا نظر آتا ہے۔ نجمہ آپا کے اندر ان کے اپنے خاندانی ہونے کا، روایتی ہونے کا، وقار جا بجا بولتا ہے۔ ان کی بہت اہم چیز ان کی مثبت سوچ ہے جو ان کو کہیں تھکنے نہیں دیتی، نہ روکتی ہے نہ مایوس ہونے دیتی ہے۔ وہ بکھرتے بکھرتے بھی خود کو سمیٹنے اور اپنے

ساتھ دوسروں کو سمیٹ لینے کے حوصلے رکھتی ہیں۔ پھر سے اٹھتی ہیں اور نکھر آتی ہیں۔ یہ اثبات جا بجا ان کے کلام میں بولتا نظر آتا ہے۔

نجمہ محمود ایک عورت ہیں، اوپر سے سخت اور اندر سے نرم، اکثر ان کی تنہائیوں کا احساس جھلکتا نظر آتا ہے۔ ایک نظم دیکھیں کتنی پرتوں میں چھپی ایک عورت کے احساسات کو کس باوقار انداز میں نجمہ محمود نے عیاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ بظاہر یہ نظم فطرت، خوبصورت قدرت کے موسموں کا ایک منظر نامہ نظر آتی ہے۔ مگر علامت کی گہرائیاں کھول لیں تو برف زا ایک تنہا کھڑی عورت کے اندر جلتی آگ کے شعلوں کی تپش ہم واضح طور پر محسوس کر سکتے ہیں۔ ایک صدی میں پیدا ہوئی عورت جس کے شعور نے روایتی اقدار کے تحت روشنی حاصل کی۔ تحقیق کی راہوں کی مسافر بنی۔ نئی صدی میں داخل ہوتے وقت کو بکھرتی قدروں میں خود کو سنبھال کر قدم رکھا کہ اس کے شعور اور روایتوں کا وقار مجروح نہ ہو۔ ادب میں نئے حیلوں کی آمد کے باوجود خود کی شناخت کو اتنا الگ رکھا کہ دور سے بھی بلند قامتی کی نشاندہی ہو سکے۔ ایسی عورت کی جب شخصیت کی اندرونی پرتیں کھلتی ہیں، تب بھی کیا وہ اپنے اسی وقار کو برقرار رکھ پاتی ہیں؟ آیئے ذرا دیکھ لیں۔

برف یونہی گرے
برف یونہی گرے
چوٹیوں کو پہاڑوں کی ڈھکتی رہے
کوہساروں میں چاندی پگھلتی رہے
آگ جلتی رہے
مینہ برستا رہے
آرزوؤں کے بے چین سے قافلے
یونہی آہستگی سے سرکتے رہیں
ہم یونہی خواب کی وادیوں سے گزرتے رہیں
ہم یونہی ہر طرف
وادیوں، کوہساروں میں تحلیل ہوتے رہے

درختوں کی شاخوں پہ اس طرح ہی
صاف شفاف موتی دمکتے رہیں
رقص شاخوں کا پیہم ہی جاری رہے
برف کی آگ بس یونہی جلتی رہے۔
برف یونہی گرے!!

جسم، بدن، کی ضرورتیں اور شریعتیں اپنی جگہ مگر روح کا وجود ایک اہم سچ، روح کی بقا اور صفائی، زندگی کا اصل غرور اور تمکنت ہے۔ جو اس پل صراط پر بہ آسانی گزر گیا، اس کی تمازت اور کامیابی کا کیا کہنا۔ تعلیمات بدھ میں ایک جگہ ایک سوال دیکھا۔

جنموں پر یقین کریں یا نہ کریں؟
جواب تھا۔
انسان کا نہ کل تھا نہ کل ہے۔
انسان کا سچ بس آج ہے
اس آج میں انسان کی روح کا دھندلا ہونا اس کی موت ہے
اسی آج میں اس کی روح کے آئینے کا مصفا ہونا اس کا دوسرا جنم ہے
انسان کا بس آج ہی آج ہے
نہ کل تھا نہ کل ہوگا۔

نجمہ محمود کی مثبت سوچیں، وقار واحترام، روح پر ان کا یقین، خودی کا سفر، روح کی اپنی شناخت اور شخصیت کی پہچان بنانے کے لئے، بدن وذہن کے دکھ، زخمی احساسات، مثبت سوچیں، تخلیقی جذبے، حالات وواقعات حیات کا ردِّ عمل ہی ان کی وہ کتھا اور کہانی ہے جس کو انھوں نے اپنی نظموں، شعریت، اور نثر نما شاعری میں پیش کیا ہے۔

(مطبوعہ تریاق)

○

سرقریشی منظور

نجمہ محمود کا ادبی وجدان

پروفیسر نجمہ محمود! (جتنا میں سمجھ پایا)

محترمہ مہر افروز کے تفصیلی اور مکمل مضمون بہ عنوان ''نجمہ محمود بندشوں کی جمالیاتی آزادی'' کے بعد پروفیسر نجمہ محمود کے بارے میں مزید لکھنے کو کچھ رہ نہیں گیا۔ تہی دست لکھے گا کیا اور لکھے گا تو طوالت و تکرار کے سوا کیا لکھے گا؟

پروفیسر نجمہ محمود ہمہ جہت شخصیت ہیں ان کے ادبی وجدان کی گود میں کئی زمانے سوتے اور کئی عہد جاگتے ہیں۔ تاریخ ان سے پوچھتی ہے کچھ رہ تو نہیں گیا؟ ان کا سفر ہی اتنا طویل، اتنا دلگداز اور اتنا دلفریب ہے کہ پُر آشوب لمحوں کا کرب بھی محسوس ہوتا ہے اور امید اپنے آنچل سے اشارے کرتی بھی دکھائی دیتی ہے۔ ان کا سفر لارڈ بدھا کا سفر ہے جو شہزادہ بھی ہے اور بن باس کا راہی بھی۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کلاس رومز میں ان کے لکچرز کی بازگشت ہے تو احمد ندیم قاسمی کے ساتھ ابوظہبی اور دبئی کے مشاعروں میں انھیں دعوتِ کلام کی استدعا سنائی دیتی ہے۔ اقبال انھیں بالِ جبرئیل اپنے دستخط کے ساتھ پیش کرتے ہیں تو سمندر پار ورجینیا وولف بازو پھیلائے ان سے بغل گیر ہونا چاہتی ہیں۔ سرسید روانگی سے پہلے یونیورسٹی پر آخری نگاہ ڈالتے ہوئے مطمئن ہیں کہ ان کے خواب ثمر آور ثابت ہوئے۔

انگریزی ادب ہو یا اردو ادب دونوں زبانوں میں کمال رکھتی ہیں۔ مشرق و مغرب کے دونوں اُفق ان کی فکر خیز قلم رَو میں شامل ہیں۔ جذبات و احساسات کا اظہار نثر میں ہو یا وجدان و الہام کا نزول آزاد نظم میں، زوال پذیر تہذیب کے دکھ ہوں یا فیمنزم کی حشر خیز تحاریک، پروفیسر نجمہ محمود کے ہاتھ تلوار سے خالی ہیں۔ پیڈسٹل پر ایستادہ پروفیسر نجمہ محمود انصاف پسند ایسا متوازن مجسمہ ہیں جن کی آنکھوں پر علم کا نگہبان رومال اور ہاتھ میں محبت کی کتاب ہے۔ ان کے ذاتی دکھ

درد اور نا آسودہ پریشان لمحے آگہی کے اس نورانی سیلاب میں بہت دور کہیں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے قونیہ سے بوقت رخصت مولانا روم نے اپنا ہاتھ پروفیسر نجمہ محمود کے سر پر رکھ کر یہ مشہور جملہ کہا ہوگا۔

''نیکی اور بدی کے تصورات سے ماورا ایک میدان ہے۔ میں تمہیں وہاں ملوں گا''

"Out beyond Ideas
of wrongdoing and rightdoing,
there is a field.
I will meet you there."

-Rumi

(بھکر، پاکستان جولائی ۲۰۲۰ء)

O

○

منظر بہت عجیب تھا ہم کھو کے رہ گئے
دوری پہ آبشار تھا ہم رو کے رہ گئے

(از: شعری مجموعہ ''ریگستان میں جھیل'')

بے زنجیر جستجو

(تحقیقی، تنقیدی، تخلیقی مضامین اور مقالے)

○

''مطرب بزم دلبراں، شاعر شہر نگاراں رنگیں نوا، اسرار الحق مجازؔ ... اچانک اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اُردو میں ایک کیٹس پیدا ہوا تھا، ایک شیلی نے جنم لیا تھا جسے نامساعد حالات کے سمندر نے نگل لیا۔ اس کی طبیعت جب ماحول کی تلخیوں کی تاب نہ لاسکی تو اس کے ذہن و دل کے تار ٹوٹ گئے۔ جام، ساز اور شمشیر کے پردے میں زندگی اور انسان سے پیار کرنے والا مجاز اس دنیا سے چلا گیا۔ زندگی اسے بلاتی رہی، ساز دیتی رہی لیکن اسے موت کی آواز پسند آئی''۔

(اقتباس از: ''مجاز ایک ساز ایک آہنگ'' مشمولہ ''بے زنجیر جستجو'')

محمد ایوب واقف

بے زنجیر جستجو: ایک مطالعہ

کبھی کبھی دنیائے علم و ادب میں کوئی ایسی تصنیف اشاعت پذیر ہو جاتی ہے جس کے مطالعہ سے ذہن و دل بے حد متاثر ہو جاتے ہیں اور قاری اس فیض بخش کتاب کی ورق گردانی کے شرف سے بار بار مشرف ہونے کا خیال دل میں لاتا ہے۔ مجھے اس بات کے انکشاف میں کوئی پس و پیش اور تامل نہیں ہو رہا ہے کہ پروفیسر نجمہ محمود صاحبہ کا نو بہ تازہ ترین مجموعہ ''بے زنجیر جستجو'' بلاشبہ کتابوں کے اسی ذیل میں آتی ہے۔ میں یہ کہتے ہوئے بیحد ندامت و شرمساری محسوس کر رہا ہوں کہ ایسی لائق و فائق اور امتیازی اور ترجیحی خصوص کی حامل ادیبہ کے نوکِ خامہ سے تخلیق ہونے والی دائمی قدروں کی حامل اور رازہائے سربستہ کو وا کرنے والی تحریروں سے میں زیادہ استفادہ نہیں کر سکا مجھے اس بات کا افسوس و قلق ہے۔

میں جناب ڈاکٹر ظہیر انصاری صاحب کی اس عنایت خاص کا بے حد ممنون ہوں کہ بر بنائے خلوص و محبت انھوں نے محترمہ نجمہ محمود کے اس لافانی مضامین کے مجموعہ ''بے زنجیر جستجو'' کو مطالعے کی غرض سے مجھے دیا۔ اور ساتھ ہی یہ فرمائش بھی کی کہ میں اس بھاری بھرکم اور معنی و مطلب کے اعتبار سے کافی اہم، معلوماتی اور مدلل کتاب پر تحریر نو کی اگلی اشاعت کے لئے تین چار صفحات پر مشتمل تبصرہ کر دوں۔ چنانچہ اب میں ان کی فرمائش کے عین مطابق یہ تبصرہ سپردِ قلم کر رہا ہوں۔ خدا کرے کہ نجمہ محمود صاحبہ کو میری یہ ناچیز تحریر پسند آجائے۔ دراصل یہ کتاب کسی مختصر تبصرہ کی متحمل نہیں بلکہ یہ تو کسی طویل و بسیط مقالہ کی متقاضی ہے اور سردست میں ایسے کسی تفصیلی مضمون کے حق میں نہیں لیکن آئندہ موقع ملنے پر میں یہ کام انشاء اللہ ضرور کروں گا، میرے لئے یہ کام میرا پسندیدہ عمل ہوگا۔

تبصرہ نگاری اور مضمون نگاری یا مقالہ نویسی میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ رسائل اور اخبارات میں نئی کتب پر جو تبصرے ہوتے ہیں عاطور پر رسائل کے محدود صفحات کے پیش نظر انھیں مختصر اور کبھی کبھی مختصر ترین سطور میں پیش کیا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اس امر کا خاص خیال رکھا

جاتا ہے کہ کتاب کے مشمولات کا کم الفاظ میں سہی لیکن کتاب میں شامل تمام نگارشات کے بارے میں فی نفسہٖ معلومات بیک نظر واضح ہو جائیں۔ اس لئے سب سے پہلے تو میں اس کتاب میں شامل تمام نگارشات کے عنوانات کو شامل تبصرہ کر لینا چاہتا ہوں تاکہ تبصرے پر نگاہ ڈالنے والے قاری تحریرات کی بوقلمونی اور ان کی کشادگی اور ان کے پھیلاؤ کا اندازہ کر سکیں، تو لیجئے مضامین کے عنوانات کو ملاحظہ فرمائیں۔ عنوانات اس طرح ہیں۔ (۱) مجاز: ایک ساز ایک آہنگ (۲) ٹیگور ایک شاعر ایک مغنی (۳) میں مادری زبان میں کیوں لکھتی ہوں (۴) نثری نظم آزادیٔ روح کی ضامن (۵) گھر کے ماحول میں بچوں کی حیثیت (۶) رضیہ آپا: شخصیت کے چند نقوش (۷) ماقبل تاریخ کے زمانوں میں عورت کا مرتبہ (۸) تحقیق: الہام ایک لمحۂ انکشاف (۹) پروفیسر (ڈاکٹر) حمیدہ سعید الظفر (۱۰) ثریا حامد: ایک خاکہ (۱۱) تخلیقی پیراگراف کا فن (۱۲) ویدوں میں عورت کا مقام (۱۳) سید حامد نگارخانۂ رقصاں کی روشنی میں (۱۴) خرد نے پیڑ کے پتوں میں تیری معرفت ڈھونڈی (۱۵) رہگزار اس کے اشارے پہ خیابان بنے (۱۶) خلیل جبران کی شاعری میں رومانی عناصر (۱۷) اصلاح معاشرہ کی لازمی جہت (۱۸) تہذیب کی دیوار منہدم (۱۹) نجم الحسن رضوی: اردو ادب کا اہم نام (۲۰) احمد فراز: آزادیٔ روح کا شاعر (۲۱) پیاروں کا پردیس، پر ایک نظر (۲۲) افشاں ملک: ایک منفرد افسانہ نگار (۲۳) سید حامد: زندہ رود (۲۴) عالمی فکر میں فیمنزم، ورجینیا وولف، اقبال اور مشرقی صوفیاء کے حوالے سے (۲۵) شعور کی رو۔ تکنیک یا تصور خودی...... (۲۶) اصنافِ سخن کی مستند روایات میں اضافے کے امکانات (۲۷) علی گڑھ، لمحوں کی بازیافت (۲۸) وہ افسانے لکھے ہی نہیں گئے جن میں الوہیت Divinity ہوتی (۲۹) مکتوب بنام تحریر نو، جنوری ۲۰۱۰ء ۳۰ مکتوب اور ۳۱ مکتوب۔

مضامین کے عنوانات پر آپ ایک نگاہ ڈالیں تو آپ کو اس بات کا اندازہ آسانی سے ہو جائیگا کہ ان میں کتنی ہمہ گیری، کتنی رنگارنگی اور کتنے ادبی، تنقیدی اور تحقیقی شعور کا جامع اظہار ہے۔ عام طور سے مضامین کے مجموعوں میں شخصیت نگاری کی بھرمار ہوتی ہے لیکن ''بے زنجیر جستجو'' میں مصنفہ نے ابدی اور سماجی مسائل پر بھی کافی وشافی مواد پیش کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ چیز مصنفہ کی علمی وادبی جہات کے عمیق مطالعہ کو واضح و مترشح کرتی ہے۔ شخصیت نگاری کی جہاں تک

بات ہے تو اس باب میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ جن شخصیتوں پر انھوں نے اظہار خیال کیا ہے ان میں کسی طرح کا تعصب کارفرما نہیں ہے بلکہ غیر جانب دارانہ سوچ کا پورا دخل ہے۔ ان کی ایسی تحریروں سے ان شخصیتوں کے بارے میں حقائق ابھر کر سامنے آجاتے ہیں کیونکہ ان میں کسی طرح کی لیپا پوتی نہیں کی گئی ہے۔ دوسری ایک بہت بڑی خوبی جو اس مجموعے کے سارے ہی مضامین سے عیاں ہے وہ زبان و بیان کا ایسا جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔

پیش لفظ میں کہا گیا ہے کہ اس مجموعے کے مضامین مختلف النوع نوعیت کے حامل ہیں۔ ان میں تحقیقی، تنقیدی، تاریخی، تخلیقی اور اصلاحی نقاط کا وفور ملتا ہے لیکن میرے خیال سے اس مجموعے کے مضامین میں ایک خوبی اور بھی ہے اور وہ یہ کہ اس کے بیشتر مضامین میں ان اوصاف جمیلہ کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ رموز نکات کی بھی بہتر ڈھنگ سے مرقع کشی کی گئی ہے۔ اس خوبی سے کتاب کے مضامین کی قدر و قیمت بڑھ گئی ہے۔ جب میں ان کی کتاب کے مشمولات کا مطالعہ کر رہا تھا مجھے لگا کہ اس میں ان کی بلند نظری، وسیع المشربی اور فکر بلیغ کا جو بے پناہ خزانہ موجود ہے وہ خزانہ ان کے انگریزی ادب کے عمیق مطالعہ کا رہین منت ہے۔ محترمہ نجمہ محمود صاحبہ کا ارشاد ہے کہ ۱۹۹۵ء تک انھوں نے اپنے انگریزی ادب کے مطالعہ کو اس حد تک وسیع کر لیا تھا کہ اسی سال کے اندر انھوں نے اپنا تحقیقی مقالہ ''ورجینیا وولف کی تحریروں میں انسانِ کامل کا تصور لکھ ڈالا۔ ظاہر ہے اس طرح کا موضوع کچھ آسان نہیں ہوتا اس کے لئے برسہا برس تک سر کھپانا پڑتا ہے۔ یہ مشکل کام انھوں نے شب و روز کی محنتوں اور مشقتوں سے ہی انجام دیا ہوگا۔

چونکہ یہ مقالہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی سے ڈاکٹریٹ کے لئے لکھا تھا اس لئے انھیں اس گرانقدر مقالے کے اختتام پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی۔ جب اس مقالے کی کامیاب تکمیل کے بعد انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل گئی تو یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کی طرف اور ان کے دوست واحباب نے بھی انھیں اس کتاب کی اشاعت کا مشورہ دیا جسے انھوں نے قبول کرتے ہوئے ۱۹۹۸ء میں اسے کتابی شکل میں شائع کر دیا۔ جب یہ کتاب شائع ہوئی تو اس کی پذیرائی قومی اور بین الاقوامی سطح پر خوب خوب ہوئی۔ اس کا خوشگوار نتیجہ یہ سامنے آیا کہ یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں انھیں پروفیسر کے معتبر عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ ان کی یہ کتاب (۴۳۶)

صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ پیپر بیک کے ساتھ چھپی ہوئی یہ کتاب ہر اعتبار سے اچھے اور برگزیدہ ثمرات کی حامل ہے۔ چونکہ اس کتاب کے صفحات پر اکتیس مضامین ان کی سوچ کا مکمل احاطہ کرتے ہیں اس لئے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ان مضامین کو سپرد قلم کرنے میں کافی وقت درکار ہوا ہوگا۔ پیش لفظ میں ایک جگہ لکھا گیا ہے کہ اس کتاب کا سب سے پہلا مضمون ''مجاز ایک ساز ایک آہنگ'' زمانۂ طالب علمی کی یادگار ہے جسے انھوں نے ۱۹۶۳ء میں سپرد قلم کیا تھا اور آخری مضمون ''شعور کی رو۔ تکنیک یا تصور خودی......'' ہے جسے انھوں نے اب تک کا آخری مضمون کہا ہے۔

جب بات کچھ اس طرح کی ہو تو مبصر کی یہ جاننے کی خواہش ہوتی ہے کہ چونکہ دونوں مضامین کے درمیان کافی طویل فاصلہ ہے۔ ایک کا تعلق کم عمری سے ہے اور دوسرے کا سن رسیدگی سے تو پھر دونوں تحریروں میں کیا فرق ہوا ہے۔ اکثر ایسا دیکھا جاتا ہے کہ ابتدائی مضمون یا مضامین میں عام طور سے کم مائیگی کا جواز قائم ہوتا ہے اور جو تحریریں بعد کی ہیں ان میں پختہ شعور کی چھاپ ہوا کرتی ہے۔ جب میں نے اس سلسلے میں نجمہ محمود صاحبہ کی تحریروں کو جانچنے کا یا پتہ لگانے کا کام کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ دونوں تحریروں میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے۔ بس اتنا ہے کہ ایک کا تعلق مجاز کی شخصیت پر ہے اور دوسرے کی حیثیت گہرے اور گمبھیر علمی و ادبی مسئلے کی ترجمانی کی ہے۔ دونوں کے درمیان سوچ کی سطح میں بدلاؤ کا آنا لازمی ہے بس یہی فرق ہے۔ غرضیکہ یہ کتاب از ابتدا تا انتہا بیش بہا تحریروں کی حامل ہے۔ مختلف النوع موضوعات پر اطمینان بخش معلومات حاصل کرنے کا شوق ہو تو اسکا مطالعہ بیحد ضروری ہے۔

(مطبوعہ ''تحریر نو'')

○

فیروز دہلوی

بے زنجیر جستجو: ایک جائزہ

اس مبصر کو ان خواتین پر رشک آتا ہے جو گھریلو ذمہ داریوں، بچوں کی تعلیم و تربیت اور اپنے فرائض منصبی کی ادائگی کے ساتھ ساتھ علمی، ادبی اور تخلیقی کام بھی بہ حسن و خوبی انجام دیتی ہیں۔ خدا جانے دن کے چوبیس گھنٹے یا ہفتہ بھر کے سات دن کا اوقات نامہ (Time-table) کس طرح مرتب کرتی ہیں کہ وقت پیچھے رہ جاتا ہے اور یہ آگے بڑھ جاتی ہیں۔

نجمہ محمود کا شمار بھی ایسی ہی خواتین میں ہوتا ہے ان کی نگارشات جرائد و کتب کی زینت بنتی ہیں۔ نظم و نثر میں ان کی متعدد کتابیں (دیکھئے اردو بک ریویو، صفحہ ۶۶ جولائی تا ستمبر ۲۰۱۶) شائع ہو چکی ہیں۔ وہ ایک عرصہ تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی سے وابستہ رہیں اور بحیثیت پروفیسر اپنے فرائض منصبی سے سبکدوش ہوئیں۔ انگریزی کی معروف ادیبہ ورجینیا وولف پر انگریزی میں تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ نجمہ صاحبہ نے ورجینیا وولف کا بالاستعاب مطالعہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ”آج کے دور کے بہت سے مسائل ورجینیا وولف کی تحریروں کو سمجھ کر حل کیے جاسکتے ہیں۔ ان کے افکار سے استفادہ کیا جاسکتا ہے..... آج سب سے بڑا مسئلہ انسانی رشتوں کی ریزش کا ہے، قتل و غارت گری کا ہے، دہشت گردی کا ہے۔ اس مسئلہ کو اس نے اعلیٰ متوازن، ہم آہنگ ذہن سے مزین انسان کے تصور کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ اقبال کے انسانِ کامل کے متوازی.......“

زیر تبصرہ کتاب کے تعلق سے نجمہ صاحبہ رقم طراز ہیں ”اس مجموعہ کا عنوان ”بے زنجیر جستجو“ روایت سے انحراف ہے۔ یہ خوبصورت ترکیب میں نے سید حامد صاحب کے ایک مضمون سے اخذ کی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ آج کل ادیبوں میں ”بے زنجیر جستجو“ کی کمی ہے، تحقیق کے بیکراں جذبے کی کمی ہے، حق کو سامنے لانے کی کوشش کی کمی ہے، خونِ جگر کا فقدان ہے۔ اس مجموعہ کے مضامین (یا نگارشات) مختلف النوع ہیں۔ تحقیقی، تنقیدی، تاریخی، تخلیقی، اصلاحی، فقہی لیکن نوعیت سب کی تحقیقی ہی ہے کہ ان میں حق کی جستجو ہے، سچ کی تلاش ہے....... نقاد، تخلیق کار، مؤرخ، مصلح، فقیہ اور محقق سب کی راہ، راہِ حق ہی ہوتی ہے، تحقیقی ہی ہوتی ہے۔“

اس کتاب میں پیش لفظ کے علاوہ ۲۸ مضامین ہیں اور ۳ مکتوب بنام مدیر ''تحریر نو'' بھی آخری صفحات میں شامل اشاعت ہیں۔ کتاب کا پہلا مضمون ''مجاز ایک ساز ایک آہنگ'' اور دوسرا مضمون ''ٹیگور ایک شاعر ایک مغنّی'' نجمہ نے اس وقت تحریر کیے تھے جب وہ کرامت حسین مسلم کالج لکھنؤ میں بی اے سال اول (۱۹۶۳ء) کی طالبہ تھیں اور یہ مضمون کالج کی ادبی بزم کہکشاں میں پیش کیے گئے تھے۔ بعدازاں سجاد ظہیر نے دونوں مضامین ''حیات'' میں شائع کیے۔ اس وقت کرامت حسین کالج رضیہ سجاد ظہیر اردو کی استاد تھیں۔ انھوں نے نجمہ محمود کی سرپرستی کی اور تاحیات یہ تعلق برقرار رہا۔ ''رضیہ آپا: شخصیت کے چند نقوش'' میں ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ نجمہ صاحبہ کو ایک ادبی شخصیت بنانے میں موصوفہ نے کیا رول ادا کیا۔

نجمہ صاحبہ، سید حامد کی ذات اور ان کے فکر وفن (نظم ونثر) سے متاثر نظر آتی ہیں اس لیے کتاب میں سید حامد صاحب پر چار مضمون ایسے ہیں جسمیں ان کی ذات وصفات کے ساتھ ان کی تحریروں پر تنقید وتبصرہ بھی کیا ہے۔ حامد صاحب کی اہلیہ ثریا پر ایک خاکہ بھی کتاب کی زینت بنا ہے۔ یہ مضمون ۱۹۸۵ء میں لکھا گیا۔ ثریا صاحبہ کے خاندانی پس منظر بیان کرنے کے بعد نجمہ لکھتی ہیں: ''سچائی، ایمانداری، نیکی اور خلوص ان کی شخصیت کا اہم جزو ہیں۔ مذہب سے وابستگی نے ہی ان میں خدمت خلق کو بیدار کیا۔ قوم کی خدمت کا جذبہ شوہر کے زیر اثر شدید ہوا۔'' ثریا صاحبہ نے جو ملی اور فلاحی کام انجام دیے ان کا سلسلہ دراز ہے۔ چھ صفحات پر مشتمل یہ مضمون ثریا حامد کی ذات اور فلاحی کاموں کا اس طرح احاطہ کرتا ہے کہ مختصر ہونے کے باوجود ثریا حامد کے بہت سے شخصی پہلو نمایاں ہوجاتے ہیں۔

کتاب میں اہم مضمون ہے ''میں اپنی مادری زبان میں کیوں لکھتی ہوں؟'' نجمہ محمود اس تعلق سے لکھتی ہیں کہ ''اکثر مجھ سے پوچھا گیا کہ میں اپنی مادری زبان یعنی اردو میں کیوں لکھتی ہوں، انگریزی کی استاد ہونے کے ناطے صرف انگریزی میں ہی کیوں نہیں لکھتی...... '' اس کے جواب میں موصوفہ انگریزی زبان وادب پر تبصرہ کرتے ہوئے بیان کرتی ہیں: ''قابل رحم ہیں وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ کوئی انگریزی جیسی برتر زبان میں کیوں نہیں لکھتا۔ دراصل لوگ ذرا دبی زبان سے کہنا چاہتے ہیں کہ دراصل شاید آپ انگریزی میں لکھنے کے اہل نہیں...... یہ کہنے میں مجھے ذرا تامل، ذلت یا شرم محسوس نہیں ہوتی کہ بلاشبہ میں انگریزی سے زیادہ اردو سے واقف ہوں۔ اسی زبان میں محسوس کرتی ہوں، اسی میں

سوچتی ہوں اور محسوس کرتے اور سوچتے وقت جس زبان کے الفاظ میرے چہار سو بکھرے رہتے ہیں وہ اردو ہے جسے میں نے اپنی ماں کی گود میں سیکھا تھا جو میری رگ و پے میں سرایت کی ہوئی ہے...... میں اپنا اظہار ذات اسی زبان میں کر سکتی ہوں اور کرتی رہوں گی۔'' (نجمہ محمود کے اس جذبے کو سلام)

''بے زنجیر جستجو'' میں تین مضمون خواتین سے متعلق ہیں۔ ماقبل تاریخ کے زمانوں میں عورت کا مرتبہ، ویدوں میں عورت کا مقام۔ ان عنوانات سے ظاہر ہے کہ ان میں عورت کے مقام و مرتبہ سے متعلق تحقیق اور بحث ہے۔ تیسرا مضمون بعنوان ''اصلاح معاشرہ کی لازمی جہت'' مسلم معاشرہ میں بیوہ، مطلقہ یا خلع یافتہ عورتوں کے عقد ثانی سے متعلق فقہی اور مبسوط تحریر ہے۔ نجمہ محمود خود ایک عورت ہیں اور انھوں نے عورتوں کے اس دکھ درد کو بخوبی سمجھا کہ ہمارے معاشرہ (مسلم معاشرہ) میں عقد ثانی سے گریز کیا جاتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ عقد ثانی عورت کے لیے نہ بے حیائی ہے نہ یہ خلاف شرع ہے، عمر کی اس میں کوئی قید نہیں اور نہ ہی ہونا چاہیے کہ عورت کا ساتھ کوئی بھی (سوائے شوہر کے) نہیں دے سکتا نہ ہی کسی کو دینا چاہیے (کہ اس سے پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں)۔'' ان مضامین کے علاوہ نثری نظم آزادی روح کی ضامن، تحقیق: الہام ایک لمحہ انکشاف، پروفیسر (ڈاکٹر) حمیدہ سعید الظفر، تخلیقی پیراگراف کا فن، خلیل جبران کی شاعری میں رومانی عناصر، نجم الحسن رضوی: اردو ادب کا ایک اہم نام، احمد فراز: آزادی روح کا شاعر، پیاروں کا پردیس پر ایک نظر (شہناز کنول کا سفرنامہ)۔ افشاں ملک ایک منفرد افسانہ نگار، عالمی فکر میں فیمنزم، شعور کی رو، اصناف سخن کی مستند روایات میں اضافے کے امکانات اور وہ افسانے لکھے ہی نہیں گئے جن میں الوہیت ہوتی۔ Diversity ہوتی میں ادبی مباحث اور تبصرے ہیں۔ بے زنجیر جستجو کے مضامین نجمہ محمود کی ذہانت، ذکاوت فکر اور وسیع مطالعہ کی دین ہیں جو سنجیدگی سے مطالعے کی دعوت دیتے ہیں۔ انھیں ایک بار پڑھنا وقت کا زیاں نہیں۔ پڑھیے اور دیکھیے کہ مسرت سے بصیرت تک کا سفر طے کرنے میں دیر نہیں لگے گی!!

(مطبوعہ: اردو بک ریویو)

○

○

''وہ افسانے لکھے ہی نہیں گئے جن میں اُلوہیت ہوتی Divinity ہوتی''—

''کامل انسان کا تصور عالمی ادب کا اہم ترین موضوع ہے''

(از: وہ افسانے لکھے ہی نہیں گئے جن میں اُلوہیت ہوتی'')

(مشمولہ ''بے زنجیر جستجو'')

سیّد حامد: نگارخانۂ رقصاں کی روشنی میں

(تحقیقی وتنقیدی مقالہ)

مکاتیب

○

''سیّد حامد کی تنقید، تنقید برائے تنقید نہیں بلکہ ضرورت کے تحت تخلیق کی گئی تنقید ہے۔ مہدی افادی کے بارے میں کہا گیا تھا کہ سطحی کثافتوں کی تہ میں چھپے حسن تک ان کی نظر جا پہنچتی تھی اسی طرح سیّد حامد کا جمالیاتی ذوق بھی بہت گہرا ہے۔ جھاڑیوں کے اندرون میں پوشیدہ پھولوں پر جس کی نظر پڑے ان کے حسن کو جو پرکھے اور قدر کرے وہ صاحب نظر اور صاحب ادراک ہی تو ہوا''

(از: ''سیّد حامد نگار خانہ رقصاں کی روشنی میں''
مشمولہ ''بے زنجیر جستجو'')

امتیاز ساغر

سید حامد نگار خانۂ رقصاں کی روشنی میں ایک ایسا مقالہ ہے جو سید حامد کی شخصیت میں نہاں جوہر قابل کو صفحۂ قرطاس کی زینت بناتا نظر آتا ہے۔ آپ کی ناقدانہ بصیرت نے اس کتاب میں فکر و نظر، شعور و آگہی اور ادب عالیہ کے جن چراغوں کو روشن کیا ہے وہ آنے والے شب و روز میں ادب دوستوں کے لیے مشعل راہ کی صورت ہیں۔ میری جانب سے اس خوبصورت مقالے پر مبارکباد قبول فرمائیں۔

(۱۸/ جون ۱۹۸۸ء)

○

حکیم عبدالحمید

آپ کا ادبی تحفہ مجھے مل گیا تھا۔ آج اسے دیکھنے کا موقعہ مل گیا۔ تو یہ بات واضح طور پر سامنے آئی کہ جب میں نہ ادیب ہوں نہ شاعر، نہ ناقد تو میں آپ کے اس ادبی کارنامے کی داد کیونکر دے سکتا ہوں۔ باوجود اس کے میں نے اس کتاب کو دلچسپی سے پڑھا کہ مکرم سید حامد صاحب آپ کے ممدوح ہیں اور میرے کرم فرما دوست۔ آپ نے جو محنت اور جستجو اس تالیف کے لیے کی ہے وہ اس کے ایک ایک صفحہ سے ظاہر ہے دعا ہے کہ ایسی ادبی خدمات کے لیے آپ صحت و سلامتی سے رہیں۔

خیر کا طالب عبدالحمید، دہلی

(۱۶/ جنوری ۱۹۸۹ء)

○

سید محمد

کتاب پڑھ کر بہت محظوظ ہوا۔ آپ نے اپنے وسیع مطالعۂ ادب کی بنا پر جو محاسن ظاہر کیے ہیں ان تک بوجہ کم علمی نہ پہنچ سکا تھا اتنا ضرور جانتا ہوں کہ لکھنے والے کے کردار کی عکاسی اس کی تحریر میں ملتی ہے۔ حامد اللہ کے فضل سے بلند کردار انسان ہیں اور ہم سب بھائی بہنوں کو اس پر فخر ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے زور قلم میں افزائش کرے۔ آمین۔

(سید محمد صاحب، سید حامد صاحب کے سب سے بڑے بھائی تھے جو اب مرحوم ہوئے)

(۱۶/ اپریل ۱۹۸۸ء)

○

”گاندھی جی کا خون بہا تو دنیا نے دیکھا مولانا آزاد کا خون بہا تو کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ جیتے جی قتل ہو گئے“

(از: مکتوب بہ نام مدیر ”تحریر نو“، ممبئی)

شعور کی رو- تکنیک یا تصورِ خودی و تصور انسان کامل، ورجینیا وولف، اقبال اور مشرقی صوفیاء کے حوالے سے

(تنقیدی و تحقیقی مقالہ)

(مکتوب)

○

اردو میں شعور کی رَو کی اصطلاح سرِیلزم کے زیرِ تحت آئی ولیم جیمس کو
سمجھ کر نہیں۔ انگریزی میں دونوں کو گڈ مڈ کیا گیا۔ ڈوروتھی رچرڈسن
اس سلسلے میں کنفیوزڈ تھیں اور ممتاز شیریں تصوف سے شاید نفور تھیں
(''یوں کہ ان کی فکر دائروی نہیں تھی'')

اقتباس از: ''شعور کی رَو تکنک یا تصورِ خودی'')

عبدالاحد ساز

تبصرہ

امید ہے اچھے ہوں گے۔ چند روز قبل اپنے کچھ خصوصاً محفوظ کیے ہوئے رسائل کھنگال رہا تھا کہ 'تحریرِ نو' کا وہ شمارہ نکل آیا جو تم نے اس کی اشاعت کے پانچ سال مکمل ہونے کے موقع پر شائع کیا تھا۔ (بابت فروری ۲۰۱۳ء) یہ شمارہ ادبی برادری کی مرکوزِ توجہ میں رہا۔ مشمولات کو دوبارہ دیکھتے ہوئے پروفیسر نجمہ محمود (علی گڑھ) کے مقالے ''شعور کی رو۔ تکنیک یا تصورِ خودی'' پر نظر ٹھہر گئی۔ پڑھا تو پہلے بھی تھا لیکن اس قدر غور اور انہماک کے ساتھ نہیں پڑھ سکا تھا۔ اب جو نظریں جما کر پڑھا تو اندازہ ہوا کہ یہ انتہائی ذہنی استحضار اور وابستگی کے ساتھ لکھا گیا پُر مغز اور نکتہ آفریں مقالہ ہے۔

نجمہ صاحبہ نے بڑے مدلل انداز میں شعور کی رو کو تکنیک سے نہیں بلکہ تصورِ خودی سے مکمل طور پر عبارت کیا ہے۔ اس ضمن میں ورجینیا وولف اور علامہ اقبال، ویدو اُپنشد، عطار و رومی، ابن عربی اور دیگر صوفیاء کے سیاق رقم کیے ہیں۔ قرآن، انجیل، دیگر صحائف اور ہندو فلسفے تک رسائی کی ہے۔

'شعور کی رو' کیا ہے اور اس کے پیچیدہ پہلو اور زاویے کیا ہیں۔ ایک ادنیٰ قاری کی حیثیت سے کہوں تو میری رسائی فہم سے بالاتر ہی رہے ہیں۔ اس سلسلے میں میں نے کچھ ناقدین کے معروضات ہی پڑھے تھے۔ ورجینیا وولف کو بھی میں نے براہِ راست یا بالترجمہ نہیں پڑھا ہے۔ اس رو سے مجھے نجمہ محمود کا مضمون مجھے بہت سرشار کن معلوم ہوا۔ بہت چشم کشا اور کئی مغالطے دور کرنے والا مضمون ہے۔ مثلاً یہ کہ قرۃ العین حیدر نے خود اس کی نفی کی ہے کہ اُن کے ناول میں شعور کی رو مروّجہ اصطلاح میں استعمال ہوئی ہے۔ محترمہ ممتاز شیریں، شمیم حنفی اور وہاب اشرفی صاحبان کے متنازعہ بیانات اور چند انگریزی مفکرین کے اقتباسات بھی محفوظ کر لیے جانے کے لائق ہیں۔

اقبال کے شعر ''ہمہ آفاق کہ گیرم......'' سے مترشح مصنفہ کے ان جملوں کا تو جواب ہی نہیں

''ان ہی انکشافی لمحوں میں اقبال کا تصور خودی (Concept of Consciousness) اور ورجینیا وولف کے شعور کا سمندر میں حیرت انگیز مماثلت نظر آئی ان روشن لمحوں میں میری جستجو کی منزل جگمگا رہی تھی اور میں نویں آسمان پر تھی۔ایک عارفانہ لمحے سے دوچار''۔

میرے خیال میں نجمہ محمود کا یہ مقالہ مذکورہ موضوع سے متصل ایک نئی جہت کے اضافے، ایک دریافت کا حکم رکھتا ہے، جس پر اہل نقد ونظر کا کشادہ ذہن، اعترافی ردّعمل لازمی ہے۔

○

حجاب امتیاز علی کے طرز میں طرحی افسانے

گل مہر کے سائے تلے، املتاس کی چھاؤں میں، چنار کے سائے تلے

(تبصرے)

○

''موبائل کی گھنٹی بجی۔ پرنور کا فون تھا میں نے اس سے کہا۔ منتظر ہوں صحن گلستاں میں چہل قدمی کر رہی ہوں اور ذہنی طور سے نہ جانے کہاں کہاں کی سیر کر رہی ہوں۔ سمندر، کوہسار، ہمالیہ، کوہ شیباز، دریائے شاکاک — ہمالیہ کے گلیشئر گوبل وارمنگ کی وجہ سے پگھل رہے ہیں اے معبود اپنی اس خوبصورت دنیا کو بربادی سے بچالے۔''

(از: ''املتاس کی چھاؤں میں..... ''حجاب کی طرز میں طرحی افسانہ)۔

ڈاکٹر مشتاق صدف

شاید اہل زبان وادب کو یہ نہیں معلوم کہ نجمہ محمود نے حجاب کی طرز پر کہانیاں لکھ کر نہ صرف ایک عمدہ تجربہ کیا بلکہ معاصر افسانوی منظرنامہ کو جو کشادگی بخشی اس سے قبل اس کے متعلق کسی نے سوچا بھی نہیں تھا۔ انھوں نے افسانے کی نثر کو محدود معنوی فضا سے نکال کر نئے لکھنے والوں کے لیے جونئی راہ ہموار کی وہ افراط وتفریط سے پاک تھی۔ ان کی زبان اشاریت اور رمزیت سے مملو ہے اور یہ وہ طاقت ہے جو نجمہ محمود کے تخلیقی امکانات کو روشن کرتی ہے۔ ان کے یہاں زبان میں دلآویزی بھی ہے، موضوعات میں تنوع بھی، تہذیب واقدار کی شکستگی اور عورت کا اضطراب بھی ہے وہ ان عورتوں سے محبت کرتی ہیں جن کو ہمارا معاشرہ راندۂ درگاہ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ ان کے تخلیقی ذہن پر سماجی ریاکاری کا ناپاک ہاتھ ہتھوڑے مارتا رہتا ہے۔ لہٰذا وہ سماج کے مکروہ چہرے کو بے نقاب کرنا چاہتی ہیں اس اعتبار سے ان کی باطنی تڑپ اور ناآسودگی کو ایک مخصوص سیاق وسباق میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

○

خان جمیل (مراسلہ)

ماہنامہ شاعر میں شائع ''گل مہر کے سائے تلے'' اور ''املتاس کی چھاؤں میں'' کیے بعد دیگرے دو افسانے نظر سے گذرے جنھیں آپ نے بھی حجاب امتیاز علی کے رنگ میں لکھے طرحی افسانوں کا نام دیا ہے۔ آپ اگر ایسا نہ بھی کرتیں تو ان خود مکتفی افسانوں کی صحت پر کوئی اثر نہ پڑتا۔ میں نے تو انھیں آپ کی تحریروں کی خلاقی کے ہی آئینے میں دیکھنے سمجھنے کی کاوش کی ہے۔

خاکسار نے آپ کی ان تخلیقات کے ماسوا سید حامد کی شخصیت شناسی پر آپ کی ضخیم کتاب ''سید حامد کہ گم اس میں ہیں آفاق'' اور دیگر کئی تخلیقات بھی دیکھی ہیں۔ پہلی ہی نظر میں آپ کی تحریروں کے دیگر عناصر کے باوصف جس ایک امر نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ہے آپ کا بیانیہ جو کچھ روایتی اور پرشکوہ ہوتے ہوئے بھی عصر حاضر کے اسلوب سے ہم آہنگ ہے، جو وارفتگی ومحویت ونغمگی کی ایک ایسی خوابناک دنیا میں کھینچ لے جاتا ہے جہاں چہار سمت مسرت وانبساط کی

روشنی بہہ رہی ہے اور جو قاری کے رگ و پے میں اترنے لگی ہے۔

فنونِ لطیفہ کے ضمن میں ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ اس کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ وہ فرد کو جو ذات اور کائنات کے مسلسل تصادم میں گھرا ہوا ہے اسے وہ اپنے دامن کی ٹھنڈی ہوا دے اور پل بھر سکون کی سانس لینے میں معاونت کرے۔

راقم الحراف کی توجہ آپ کے بیانیہ کے باطن میں موجزن ہمہ اوست، وحدت الوجود کے صوفیانہ تصور کی ایک واضح اور روشن لہر کی جانب بھی گئی جو رہ رہ کر چمک چمک اٹھتی ہے اور خیال و شعور کو سرشاری کے احساس سے بھر دیتی ہے!

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

(غالب ۲۰۰۶)

○

مقصود الٰہی شیخ (مراسلہ)

تازہ ''شاعر'' بابت ستمبر ۲۰۰۵ء میں آپ کی 'حجاب امتیاز علی تاج' کے رنگ میں رنگی کہانی پڑھی۔ آپ نے کمال ہنر مندی سے ان کے اسلوب کی کامیاب پیروی اور تقلید کی ہے جب کہ حجاب کی کہانیوں کو پڑھے ہوئے مدت ہوگئی ہے مگر وہی تاثر جوں کا توں ہے۔

آپ کی زیرِ نظر کہانی میں جب خوشنودی (باشعور بوا) نے بوکھلا کر عراق پر حملے کی خبر دی تو اس کے پس منظر میں ایشیائی بادل کا بڑے زور سے گرجنا (برسنا نہیں) اور جنوبی آسمان کی بجلی (گرتی نہیں) کی علامتی کارفرمائی سے کہانی کارکا تأثر ''پھر بھی جینے کو کیوں دل چاہتا ہے'' بڑا مربوط دکھائی دیتا ہے۔(۲۰۰۵)

○

نجم الحسن رضوی

(حلقۂ ارباب ذوق دبئی کے جلسہ میں پیش کردہ افسانے ''گل مہر کے سائے تلے'' پر سامعین کی رائے)

حجاب امتیاز علی ہماری ان اولین افسانہ نگاروں میں ہیں جنھوں نے اردو افسانے کو ایک خاص انداز دیا، اردو افسانے کو پروان چڑھایا، اسے ایک خاص زبان دی ..... ''فرانسیسی دریچے''، ''ایشیائی بادل'' وغیرہ۔ انھوں نے رومان کا حقیقت سے امتزاج کیا۔ نجمہ صاحبہ نے آج کے حقائق سے اسے متصل کر دیا''۔

(دبئی میں 'حلقۂ ارباب ذوق' کی نشست میں پیش کی گئی)

○

شکیل احمد

''مرکزی خیال اچھا ہے''۔ آغا پیر۔ ''قلم کے بجائے برش اٹھا لیتیں تو اچھا تھا۔ حجاب کے رنگ میں ہونے کے باوجود نجمہ صاحبہ کا اپنا انداز ہے آپ اس سے Inspire ہوتے ہیں۔ برش، مصوری''

○

عبدالرحمٰن

لہجہ معتبر ہے۔ نہایت خوبصورت، زبان سلیس اور شیریں ہے۔

○

اعجاز شاہین

افسانہ نگاروں کی اس کھیپ نے جو تکنک برتی تھی اس تکنک کا استعمال کرتے ہوئے مصنفہ نے عصری حسیت کو پیش کیا ہے۔ مکالموں کا لطف آ گیا ہے۔

دیگر رائیں (نام یاد نہیں رہے) 'نسائی پہلو سے نہایت عمدہ'؛ ''علامتیں، منظر نگاری قابل تحسین ہے مکالموں کا لطف ہے سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سلاست ہے اردو فارسی کو تسلسل سے استعمال کیا ہے کہیں جھول نہیں علامتی بھی ہے ایک پیغام بھی ہے''۔

پروفیسر صغریٰ مہدی

جولائی ۲۰۰۷ء کی شروع کی تاریخیں تھیں ۔عینی آپا سے کئی دن سے ملاقات کا ارادہ کر رہی تھی کہ ان کا فون آیا کہ وہ خود آرہی ہیں ۔ وہ آئیں سانس پھولی ہوئی تھی جو کافی دیر میں قابو میں آئی پھر وہ اپنے کاموں کا ذکر کرنے لگیں آخر اتنے ضرورت مند لوگ ہیں مگر ان کاموں کے لئے کیوں نہیں ملتے (ان دنوں ان کے کام سمٹ نہیں پارہے تھے اور ان کی مرضی کے لوگ نہیں مل پارہے تھے) یہ بکھراؤ کیوں ہے وہ اس حد تک پریشان تھیں کہ کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا تو مجھے خیال آیا کہ ان چیزوں میں سے کچھ تلاش کروں جو میں ان کو سنانے کے لئے جمع کرتی تھی اس میں ''قومی آواز'' میں اسی دن شائع ہوئی کہانی ''گل مہر کے سائے تلے'' نظر آئی ۔ میں نے ان سے کہا ''آج آپ کو ایک ایسی چیز سناؤں کہ آپ کا موڈ صحیح ہو جائے گا۔'' ''بولیں'' میرا موڈ اس وقت کسی چیز سے ٹھیک نہ ہوگا میں نے کہا'' سنئے نجمہ محمود کی کہانی ہے حجاب کے طرز میں جسے انھوں نے طرحی افسانہ کہا ہے۔'' ان کے چہرے پر بیساختہ مسکراہٹ آگئی ۔ بولیں پڑھو۔ چند لمحوں میں میں نے دیکھا ان کا موڈ بدل چکا ہے پھر تو ہر پیراگراف پر انھوں نے یوں داد دی جیسے شاعر کو اچھے شعر پر دی جاتی ہے۔اور جب کہانی ختم ہوئی تو بولیں'' یہ لڑکی اچھے افسانے لکھتی ہے اور مجھے بہت خوشی ہوئی کہ لوگوں نے حجاب کے طرز تحریر کو مذاق کا موضوع تو بنایا مگر اسے appreciate نہیں کیا۔'' پھر انھوں نے عنوان پوچھا میں نے عنوان بتایا اتنے میں ڈرائیور آ گیا۔ میں نے ان کو سہارا دے کر کار میں بٹھایا بغیر یہ سوچے ہوئے کہ آخری بار میرے گھر آئی ہیں (اسپتال میں داخلے سے ایک ہفتہ پہلے) پھر گاڑی گیٹ سے نکلی ۔عینی آپا نے کار سے سر نکالا'' خدا حافظ'' کہا۔ سر اندر کیا پھر سر باہر نکالا اور کہا۔

''صغریٰ اس کہانی کو حفاظت سے رکھ لینا۔ میں اس پر کچھ لکھوں گی ۔''——

○

سید حامد

''جنگل کی آواز''

(افسانہ پیکر ناول)

''جنگل کی آواز'' میں جز وکل پر حاوی ہے۔ ناول نگار نے اسے ''مختصر ترین ناول'' سے موسوم کیا ہے۔ حالاں کہ یہ ایک بڑے ناول کا پہلا باب ہے۔ اس کا تعارف کرتا ہے، اس کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔ یہ غماز ہے تکوین کائنات کے اس رمز کا کہ قطرہ کو دریا اور ذرّہ کو خورشید سے جدا نہیں کر سکتے...... یہ افسانہ پیکر ناول لکھ کر نجمہ صاحبہ نے اپنا نام عالمی ادب سے وابستہ ان خلاق اور حقیقت بیں مفکرین، مصنفین اور شعرا کی فہرست میں درج کرادیا ہے جو زندگی کو بے حسی اور بے دلی سے برتنے کے بجائے اس کے ظالم فشار کو اپنی نس نس میں محسوس کرتے رہے ہیں۔ اور جنھوں نے اس کے خلاف جنگل کی آواز میں آواز ملا کر احتجاج پر کمر ہمت باندھی ہے۔ راقم سطور کو گزشتہ چند سالوں میں ان کی نگارشات کو دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ ان کے مختصر ترین ناول کا مطالعہ کرتے ہوئے اسے محسوس ہوا کہ اس اثنا میں زبان و بیان پر قدرت اور فکر کی بالیدگی اور فنی شعور کے ارتقاء اور عالمی مسائل کے ادراک اور انجذاب میں انھوں نے بہت سی منزلیں طے کر لی ہیں۔

○

پروین شیر

''آوازوں کے گھنے جنگل میں بھٹکتے ہوئے یکا یک مجھے ایک بے حد منفرد اور دل میں اتر جانے والی آواز سنائی دی ــــ یہ آواز مجھے اس جہاں سے دور ایک سحر انگیز دنیا میں لے گئی ــــ اس آواز کو سن کر ایک حیرت انگیز خوشی کا احساس ہوا کہ کوئی اور بھی ہے جس کے لیے مشہور جرمن فلسفی اور شاعر Friedric Nietzsche کا یہ کہنا سچ ثابت ہوا ــــ

"Those who danced were thought to be insane by those who could not hear the music."

نجمہ محمود کی ''جنگل کی آواز'' پڑھ کر یقین ہو گیا کہ فطری جمالیات کی لہروں پر رقصاں نغموں سے سحر زدہ ہونے کے لیے سماعت کو ایک اور پہلو کی ضرورت ہوتی ہے جو عام سماعتوں سے الگ ہے۔ حس لطیف نہ ہو تو وہ انسان ایک روبوٹ ہی تو ہے، بارش کی نرم ٹھنڈی پھواریں لوگوں کے جسم بھگوتی ہیں لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جن کی روح بھی بھیگ جاتی ہے۔ نجمہ محمود نے پھولوں، چڑیوں، تتلیوں، بادل، آبشار اور ستاروں کی کرنوں کو صرف دیکھا اور سنا ہی نہیں اپنی روح میں تحلیل کیا ہے جیسے شکر اور پانی ایک دوسرے میں سما جاتے ہیں، ایک نئی صورت میں ڈھل جاتے ہیں۔

میرے لیے کسی تخلیق کی معراج یہی ہے کہ وہ بے چین کر دے۔ ''جنگل کی آواز'' نے مجھے یوں بے چین کیا جیسے یہ میری آواز ہو۔ مثال کے طور پر — ''اُن پُر کیف و عارفانہ لمحات میں تنہا ہوتے ہوئے بھی میں تنہا نہ تھی، کیوں کہ اپنے وجود کو خود میں سرایت اور جذب محسوس کر رہی تھی۔''

(جنگل کی آواز)

''اسے محسوس ہوا جیسے وہ اور اس کا ناقابل تقسیم وجود جنگل کی اس وسیع و عریض طلسمی کائنات کا حصہ بن گیا ہو اور فضاؤں میں اس کے وجود کی خوشبو سمائی ہوئی ہو۔''

(جنگل کی آواز)

نجمہ محمود کے ایک مختصر ترین ناول ''صنوبر کے سائے تلے'' سے یہ اقتباس —

''چاند صنوبر کے درخت کے پاس روشن تھا، چاندنی اس کے پتوں کے درمیان سے چھَن چھَن کر گھاس پر نقش و نگار بنا رہی تھی۔ میں نے سوچا چاند پُر اسرار ہے، بھید ہیں اس میں — عشق کا سرچشمہ، بالکل میرے وجود کی طرح پُر اسرار — چاند کی آبی روشنی میں گل مُہر، املتاس، چنار اور صنوبر کے درخت (یہ درخت جو میرے ساتھی ہیں، جن کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر میں نے کہانیاں لکھی ہیں) — کیاریوں میں بیلا، چمیلی، گلاب، موتیا، موگرا خندہ زن تھے۔ نظر کے دائرے میں کچھ دور پر سمندر...... سمندر جو دور ہوتے ہوئے بھی نزدیک لگ رہا تھا۔ کہ وجود بھی تو ایک سمندر ہے۔''

''جنگل کی آواز'' جمالیاتی احساسات کی شدت سے بھرپور ہے۔ یہ ایسے خوابناک جہاں میں ہمیں لے جاتی ہے جس کی سرشاریوں کا اظہار مشکل ہے جس سے میں ابھی گذر رہی ہوں— جنگل کی آواز میں کھو کر مجھے چلی کے عظیم شاعر کا یہ کہنا یاد آ گیا:

"Lost in the forest, I broke off a twig and lifted its whisper to my thirsty lips, may be it was the voice of the rain crying or a torn heart. (Pablo Neruda)"

○

ڈاکٹر شہناز شورو (کنیڈا)

محترمہ نجمہ محمود کا ناول ''جنگل کی آواز'' جسے کچھ نقاد ایک طویل ناول کا اولیں باب بھی قرار دیتے ہیں، انگلستان کے روماتوی ادبی دور کی یاد دلاتا ہے جب انسان خود سے بچھڑنے کے لئے تیار نہیں تھا، صنعتی ترقی کے منفی اثرات اس کے طرز زندگی اور معاشرت پر تباہ کن اثرات مرتب کر رہے تھے۔ اسے ماحول کی آلودگی کے ساتھ ساتھ انسانی احساسات اور جذبات کے مشینی ہونے کا غم ستا رہا تھا اور ایسے میں انیسویں صدی کے فرانسیسی مفکر روسو کی پکار— "Go Back to Nature" پورے یورپ کی آواز بن گئی تھی۔ برصغیر پاک و ہند کے جن ادیبوں اور شاعروں نے انسان کو پیٹ، جنس اور جسم کے تکون سے بالاتر ہو کر سمجھنے کی کوشش کی ہے ان میں ایک نام محترمہ نجمہ محمود کا بھی ہے۔ نجمہ صاحبہ نے نہ صرف انسان اور اس کی سائیکی بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھا کر انسانی روح بلکہ اس پوری کائنات کی روح کی آواز کو سننے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے جو بلاشبہ لائق تحسین ہے۔ ''جنگل کی آواز'' کو آپ طویل افسانہ کہیں یا لانگ شارٹ اسٹوری یا ناول اس سے اس کی اثر پذیری پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انگریزی ادب کا بھرپور مطالعہ اور ورجینا وولف پر ان کا تحقیقی مقالہ نجمہ محمود کی بصیرت کا ثبوت ہے۔ اس ناول کی ہر سطر اس بات کی غماز ہے کہ اسے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخصیت نے لکھا ہے۔

○

ڈاکٹر شہناز شورو (کنیڈا)

''کیٹس نے کہا تھا"The Poetry of Earth is never dead"اور جنگل کی آواز کی مصنفہ کہتی ہیں ''جنگل کی آواز سنو، کائنات تم سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔''

نجمہ محمود اردو اور انگریزی کی نامور ادیبہ اور قابل احترام محقق ہیں۔ان کا ''افسانہ پیکر ناول'' (جو ان کے غیر مطبوعہ ضخیم ناول ''سازِ فطرت کے آہنگ'' کا پہلا باب ہے) نہ صرف برصغیر پاک و ہند کے انسانوں، بلکہ پورے عالم انسانی کو وہ پیغام دے رہا ہے جس کا پرچار ازل سے نیک روحیں کرتی رہی ہیں یعنی ایک ہمہ گیر پرامن انسانی سماج کی تشکیل جو اس کائنات کی روح کو شاداب و پرسکون رکھے۔ منتشر ذہنوں اور پرتشدد ماحول نے زندگی کا حسن ماند کر دیا ہے۔ نجمہ صاحبہ کہتی ہیں کہ کیا اسی وحشت، بربریت کو دیکھنے اور شور وغل کو سننے کے لیے انسان کو تخلیق کیا گیا ہے؟ یقیناً نہیں تو پھر اس وحشت کی تشکیل میں ہماری کوتاہیوں کا دخل ہے اور یہی سبب ہے کہ نغمگی، نفاست، حسن، کوملتا، سادگی، امن وآشتی اور محبت کے حسین نغمے ہم سے بچھڑتے جارہے ہیں۔ قدرت کے پیغام اور روح کی موسیقیت کو سننے کے لیے زندگی کو از سر نو پڑھنے کی ضرورت ہے—

آیئے ''جنگل کی آواز'' پڑھیں۔

○

سرقریشی منظور:

''جنگل کی آواز'' (افسانہ پیکر ناول جو مصنفہ کے غیر مطبوعہ ضخیم سوانحی ناول کا پہلا باب ہے۔اس ناول کا عنوان ہے ''سازِ فطرت کے آہنگ'')

''جنگل کی آواز (افسانہ پیکر ناول) کا جہاں تک پہلا باب سنا ہے اس کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ صوت ونور سے روشن ایک منفرد کہانی ہے مآخذ اولیٰ کی طرف رجوع ہے، ذات گم شدہ کی تلاش ہے، مادرِ فطرت کی پکار ہے۔ روسو نے بھی یہی کہا تھا ''تمہاری تہذیب جسے تم چاند سمجھ بیٹھے ہو تمہاری 'روح' کا جہنم زار ہے، پیش تر اس کے کہ راکھ بن کر منتشر ہو جاؤ میری سنو اور واپس فطرت کی گود میں لوٹ جاؤ'' 'My cry is go back to Nature'۔

بہت عظیم فن پارہ ہے دوسری بار سنا تو بھی اتنا ہی موثر جتنا پہلی بار سننے پر محسوس ہوا تھا۔اور فیس بک پر کمنٹ بھی دیئے تھے۔

آپ کے پاس مطالعہ کا سمندر ہے اور ہونٹوں پر جادو کی بانسری ہے، جو تاریخ، سماج، گمان، دھیان، خسارے جیسے متنوع موضوعات کو وجدان کے سُروں میں ڈھال کر امر سنگیت بنا دیتی ہے۔ سمندر ہے، ساحل ہے، کشتی ہے، بادبان کھلے ہیں۔ ہے کوئی جو جنگل کی آواز کا مسافر بننا چاہے؟

بڑے ادیب ناقدین کے محتاج ہوتے ہیں نہ ہی ناقدین کی پرواہ کرتے ہیں۔ان کا ادب نئے معیار قائم کرتا ہے اور وہ خود معیار کا پیمانہ ہوتے ہیں۔ناقدین حال کی گرامر کے قیدی، کوتاہ قامت اور دائروں کے اسیر ہوتے ہیں جب کہ بڑا ادیب جدید رجحان اور آفاقی وژن کے ساتھ مستقبل کے دروازے پر دستک دے رہا ہوتا ہے۔

○

وحید قمر

پروفیسر نجمہ محمود صاحبہ کے ادبی شاہکار ''جنگل کی آواز'' سے جب میں پہلی بار روشناس ہوا تو ایک خوش کن احساس ہوا کہ ایک نہایت اعلیٰ ادبی فن پارہ پڑھنے کو ملا اور اک ذرا قلق بھی ہوا کہ اب تک پروفیسر صاحبہ کے نام اور کام سے بے خبر تھا۔''جنگل کی آواز'' (''افسانہ پیکر ناول'') نے اس قدر متاثر کیا کہ دل میں نجمہ محمود صاحبہ کے چند دیگر افسانے بھی گوگل پر تلاش کر کے پڑھے سچ کہوں تو ان کے تخلیق کیے ادب میں مجھے اردو کے ممتاز ادیبوں کی جھلک نظر آئی۔ایک ایسے اعلیٰ پائے کا ادب جو ذہن وقلب میں اک خوشی کی کیفیت پیدا کردے اور جو روح کو سرشار کردے۔ میں پروفیسر نجمہ محمود کو قرۃ العین حیدر کی صف کی ادیبہ گردانتا ہوں اور اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ ان کے عہد میں موجود ہوں۔

○

پروفیسر ابوالکلام قاسمی

یہ ناول نما آپ بیتی بلاشبہ اپنے انداز تحریر اور پیش کش کے اعتبار سے ایک منفرد اور مختلف فن پارہ ہے۔ناول اردو میں ایک ایسی صنف ہے جس میں آپ بیتی سے لے کر جگ بیتی تک کی

شمولیت کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ پروفیسر نجمہ محمود نے ''جنگل کی آواز'' کو ہر چند کہ ناول کا نام دیا ہے، مگر اس کی تفصیلات خود نوشت سوانح کے بیش تر عناصر کو اپنے دائرۂ کار میں شامل کر لیتی ہیں۔ نجمہ محمود چونکہ ایک مشاق افسانہ نگار بھی ہیں، اس لیے کسی قدر افسانوی طرز اظہار ان کی تمام تحریروں میں جھلکتا ہے۔ جہاں تک سوال ناول کا ہے تو اس پر فکشن کا حصہ ہونے کے باعث دوسرے حصے پر افسانے کا گمان گذرنا بالکل فطری بات ہے۔

گذشتہ دو دہائیوں میں اردو میں تمام نثری اور شعری اصناف میں آپ بیتی کو نسبتاً زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اگر نجمہ محمود صاحبہ نے جنگل کی آواز کی بعد کی قسطوں میں فکشن کے مقابلے میں فیکٹ (Fact) سے زیادہ قریب رہ کر اپنی آپ بیتی کو اپنی ذاتی اور شخصی شناخت سے آشنا کر دیا تو بلاشبہ ''جنگل کی آواز'' اپنے زمانے کی نمائندہ ترین تخلیقات میں شمار کیے جانے کے قابل ہو سکے گی۔

راقم الحروف کو بے حد خوشی ہے کہ ''جنگل کی آواز'' کے وسیلے سے مصنفہ کی غیر معمولی تخلیقی فطانت اس کے سامنے آئی اور شخصی شناسائی نے ادبی عقیدت کا روپ اختیار کر لیا۔

(یہ رائے اس فن پارے کی شائع شدہ پیش کش پر ہے)

ابوالکلام قاسمی، علی گڑھ
یکم نومبر ۲۰۰۹ء

○

مرزا خلیل احمد بیگ

''جنگل کی آواز کی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی اور قدر شناسی ہونی چاہیے۔ یہ نجمہ محمود جیسی سینئر ادیبہ کی قابل قدر کاوش ہے جس میں کئی اصناف نثر کو تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ مصنفہ کا اسلوب بھی عام ادبی اسلوب سے مختلف ہے اور دامن دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔

○

اسما حسن

جنگل کی آواز'' بہت خوبصورت تخلیق ہے سچ پوچھیں تو میں آپ کے انداز بیان کی گرویدہ سی

ہوگئی ہوں۔ میچورٹی کا یہ لیول دورِ حاضر میں بہت کم دیکھا ہے۔ ''جنگل کی آواز'' کی کئی سمتیں ہیں ایک مفسر اور شرح لکھنے والے کی طرح آپ نے بہت سے قصوں کو اس کہانی میں سمو دیا ہے۔ میرے پاس الفاظ کم ہیں اور واقعی یہ رسمی جملے نہیں ہیں بہت دنوں بعد کسی کہانی نے ایک خاص کیفیت میں جکڑے رکھا۔ فورم پر آپ کے کئے گئے تجزیات یاد ہیں جو چند جملوں پر مشتمل ہوا کرتے تھے مگر آپ کی اس پوسٹ نے مجھے ایک الگ ذات سے ملوایا جو ایک اعلیٰ پائے کی تخلیق کار ہے۔ امید ہے ہم سب آپ سے کچھ سیکھ سکیں گے۔

○

خان حفیظ

پروفیسر نجمہ محمود کا مختصر ترین ناول 'جنگل کی آواز' دل کی گہرائیوں میں اتر کر اپنا دائمی اثر چھوڑتا ہے۔

(مطبوعہ ماہنامہ بزم سہارا، دہلی)

○

نور العین ساحرہ:

انڈسٹریلزم نے انسانوں کو فطرت سے کوسوں دور کر دیا ہے ان کے پاس اتنا وقت ہی نہیں بچا کہ وہ قدرت کی نیرنگیوں سے لطف اندوز ہو سکیں ہر وقت دماغ پر ڈھیروں بوجھ اور مختلف ذمہ داریوں کا احساس انسان کو ذہنی طور پر الجھا کر معذور بنا دینے کے درپے ہے۔ ایسے ہی کسی ایک لمحے میں sufism پر مبنی نجمہ محمود صاحبہ کے ناول ''جنگل کی آواز'' جیسے خوبصورت اور تخلیقی فن پارہ کا پہلا حصہ مع تعارف سننے کو ملا تو خود کو ایک مسحور کن وارفتگی کا شکار پایا۔ افسانوی مبادیات میں ایک انوکھا سا طلسمی منظر نامہ جو ختم ہونے کے بعد بھی دیر تک اچانک پیش آجانے والے کسی روحانی اور رومانی تجربے کی طرح احساس کی زیریں تہوں میں سرمستی گھولنے کا سبب بنتا رہا۔ ایسی ڈکشن سنتے ہوئے مظاہر فطرت سے پر ایک انجانی، انوکھی دنیا سے گذرنے کا موقع ملا جہاں داخلی شکست و ریخت کا شکار ایک نسوانی کردار اپنی تلاش میں سرگرداں جنگلوں کے پر پیچ راستوں پر بھٹکتا پھر رہا

ہے جسے پراسرار نئی دنیاؤں کو فتح کرنے کا جنون بھی ہے مگر اپنی راہ میں حائل غیر اخلاقی اذیت ناک رویّوں کی بدصورتی کا احساس بھی—

وجودی کرب میں ڈوبا یہ کردار اپنی ذات کی تلاش میں گم (من عرف نفسہ فقط عرف ربہ) کی عملی شکل دکھائی دیتا ہے۔ اس پورے قصے کو بیان کرنے کے لیے ناول کے پہلے Nature imagery کا خوبصورت استعمال انتہائی عمدگی سے کیا گیا ہے۔ بلا شبہ عورت مظاہر فطرت کا عظیم حصہ ہے۔ اس کی سرشت میں positivity اور creativity کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے، مضبوط، بہادر، خوبصورت، مہربان اور مستقل مزاجی سے جینے کا ڈھنگ سکھانے کے علاوہ زندگی کے تمام نشیب وفراز سے بہ احسن گذر جانے والی— کبھی اپنی منفی روایات سے بغاوت اور کہیں صدیوں پرانی مثبت اقدار کو سینے سے لگائے پشت در پشت منتقل کر کے نئی دنیاؤں کی بنیاد رکھنے والی— اپنے اردگرد کے ماحول کے ساتھ اس کا باہمی ربط اور تعلق کس قدر گہرا ہے۔ یہ بتانے کو کسی دلیل کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اسی تعلق کا اظہار فن پارے میں جا بجا ملتا ہے۔ متن کی تانیثی قرأت ناول کے پہلے حصے کو Eco.feminism کے قریب بھی لے جاتی ہے۔ اسے سنتے ہوئے بار بار ایسا بھی لگتا رہا کہ جیسے یہ کوئی Meditation Therapy ہو یا پھر Very powerful and Relaxing Detta or Theta Brain Waves ہوں جو دماغ کو بہت پرسکون کر کے سلانے کا کام کرتی ہیں۔ کہیں یہ بھی محسوس ہوا جیسے ایلیٹ اپنی نظم ویسٹ لینڈ کے آخری حصوں میں پلٹنے کا مشورہ دیتا ہے اور یہ پلٹنا اپنی زمین، اپنی ثقافت اور مذہب کے اسی رجحان کی طرف اشارہ ہے جو صوفی ازم کے بہت قریب ہے۔

میں نجمہ آپا کی شکر گذار ہوں انھوں نے مجھے یہ سننے اور لطف اٹھانے کا موقع دیا۔ میری یہ ادنیٰ سی رائے اس ناول کے صرف پہلے باب پر ہے۔ اس سے زیادہ جاننے کا ابھی موقع نہیں ملا۔ ایک بات کی خاص طور پر تعریف کرنا چاہوں گی کہ آپا نے یہ ناول لکھتے ہوئے جہاں جہاں سے بھی inspiration لیا، خلیل جبران، شیکسپیئر، ورڈز ورتھ، جمیلہ ہاشمی اور سید حامد وغیرہ ان کا خصوصی طور پر ذکر کیا کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔

○

صوفیہ انجم تاج

اُف حسین ہی نہیں بے حد حسین ۔ میرا ایک اسٹوڈیو ہے اس کے کشادہ دریچوں سے جھیل اور جنگل نظر آتا ہے۔ میں نے اسٹوڈیو میں ہی بیٹھ کر ''جنگل کی آواز'' کا ٹیپ سنا۔ آپ کے خیالات کی بلند پروازی مجھے بھی نہ جانے کہاں کہاں لے گئی ایسا لگا کہ جیسے یہ سب آپ نے نہیں میں نے لکھا ہے۔ بے حد شکریہ۔ آپ امریکہ آیئے تو میرے گھر ضرور آیئے گا۔

○

تسنیم عابدی

''فطرت سے محبت اور معرفت ذات، شعور وآگہی کے وہ مراحل ہیں جو ایک متلاشی حق کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ کبھی فطرت کا رنگ چڑھ جاتا ہے کبھی معرفتِ ذات کا پیرہن شعور کے موسموں کے چھینٹے اڑاتا ہے۔ نجمہ آیا ایک مجذوب یا سالک ان رنگوں میں نہاتا ہے— آپ کے قلم کا کمال یہ ہے کہ قاری بھی پڑھتے پڑھتے ان مناظر کا حصہ بن جاتا ہے۔ وجود میں آباد جنگل کیسی بے ترتیبی سے پھیلتا چلا جاتا ہے—

اسی لیے تو جب تلاش کا مرحلہ آجائے تو پھر سرا ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔

سچ کہا آپ نے اس نام نہاد ترقی یافتہ دور میں انسان روحانی دیوالیہ پن کا شکار ہو چکا ہے جنگل کی آواز سحر خیز ہے تصوف کی وادیوں تک لے جاتی ہے— آپ سلامت رہیں اور اسی شفقت سے مجھے تبریک بھیجتی رہیں۔''

○

نگار عظیم

''جنگل کی آواز'' ایک بہترین تخلیق جو آپ کی پر اثر آواز میں سنی، خوبصورت پس منظر، بہترین ساؤنڈ...... ایک دم کلاسک...... واہ...... اگر آپ ناول کا ارادہ کر رہی ہیں تو دل، دنیا، انسان اور وجود پر تاریخی علامتوں کے ذریعہ یہ نئی دنیا کا بہترین سفر ہوگا۔ زبان وبیان آپ کے فن کا بہترین نمونہ ہے۔ اب آپ کی آواز میں سنا۔ بہت خوب ماشاء اللہ۔

○

انجم قدوائی

''واہ نجمہ آپا کیسی خواب جیسی تحریر ہے، بانسری کی مسحور کن کیفیت، اور پرندوں اور جانوروں کی آوازیں — ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی خواب دیکھ رہی ہوں..... آپ کی آواز ماشاء اللہ ..... سلامت رہیں..... بہت کچھ لکھنا چاہ رہی ہوں شاید کسی روز لکھوں بھی مگر آج اسی سحر میں رہنے دیجئے۔

○

غزالہ صدیقی

"I was transported into a different world_Jangale Ki Aawaz_ La-Jawab."

○

شہناز رحمٰن

(اقتباسات از تحقیقی مقالہ ''اردو فکشن میں عالمی مسائل کا اظہار'')

..... سونامی کی تباہیوں کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ Mangrove forest کی جھاڑیاں جو سمندری ساحلوں پر پانی کو روکنے کے لیے قدرتی ڈھال بنتی تھیں، وہ انسانی ہوس کی نذر ہو گئیں۔ ڈاکٹر نجمہ محمود کے افسانے ''جنگل کی آواز'' میں اس مسئلہ کے خلاف احتجاجی آواز اٹھائی گئی ہے۔ مذکورہ متن میں استعمال کردہ لفظیات کے جمالیاتی پہلوؤں، تہہ در تہہ معنوی امکانات اور فنی محاسن کے علاوہ اگر عالمی تناظر میں دیکھا جائے تو اس متن کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ اپنے اس افسانے کے ذریعہ مصنفہ نے تقریباً تمام عالمی مسائل کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔ میکانکی انداز میں انھوں نے مسائل کی فہرست سازی نہیں کی ہے بلکہ ایسا منظر تشکیل دیا ہے جس کی تہہ میں ان مسائل کے اسباب وعلل بھی پوشیدہ ہیں۔ اس سے دلچسپ یہ کہ افسانے کا پورا ماحول قدرتی مناظر سے اس طرح مزین کیا گیا ہے کہ راوی کے ساتھ قاری پر سحر آگیں کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ صاف اور تازہ ہوا جس طرح مختلف بیماریوں کا علاج ہے اسی طرح روح کی سرشاری اور ذات کے عرفان کا ذریعہ بھی۔ فلیٹ اور

بلند وبالا عمارت کی محبوس گلیوں کی طرح انسانی ذہن جس قدر تنگ ہوتا جارہا ہے اس کا رمزیہ اظہار بھی اس افسانے میں موجود ہے۔

اپنے افسانہ پیکر ناول جنگل کی آواز میں نجمہ محمود کہتی ہیں:

''یہ صحیح معنوں میں آزاد زندگی ہے۔ پہاڑی چشمہ کی طرح آزاد۔ آزاد نفرتوں سے، منافقتوں، احسان فراموشیوں، خودغرضیوں اور مصلحت پسندیوں سے، آزاد مجبوریوں سے، دھوکے اور فریب سے، یہاں مخلص اور معصوم انسانوں کو استعمال نہیں جاتا، نہ ہی ان کا استحصال کیا جاتا ہے۔ اچھے اور نیک، انسان یہاں پھول کی طرح کھلتے اور کھلتے ہیں خوشبوؤں سے جنگل کی یہ کائنات مہکتی ہے۔

اس نے سرگوشی میں سوال کیا۔ ''جنگل جب اتنا زندگی بخش ہے تو درختوں کو لہولہان کیوں کیا جارہا ہے؟ فطری ماحول کی تباہ کاریاں اور انجیلی نے کہا تھا ''پتہ پتہ پر خدا کا نام ہے۔'' کیا ہمیں جنگلوں کی ضرورت اس لیے نہیں کہ ہم انسان بن سکیں ریزہ ریزہ ہونے کے بجائے مکمل انسان؟''

اس افسانے کے ذریعہ مصنفہ نے یہ باور کرایا ہے کہ شجر، حجر، معدنیات، ہوا، پانی، حیوانات، چرند پرند اور خود انسان اس احوال کا حصہ ہے۔ ان تمام مخلوقات کا فطری انداز میں ہونے اور اپنے مدار میں رو بہ عمل رہنے سے کائنات کا توازن بہتر رہ سکتا ہے۔ لیکن بڑھتی ہوئی آبادی سائنسی انکشافات کے غلط استعمال اور قدرتی مشیت میں انسانی ہوس کی دراندازی نے سارا نظام حیات بدل کر رکھ دیا۔ اسی وجہ سے راوی کی خواہش ہے کہ انسانوں کو جنگل کی سمت بلالیا جائے۔ کیوں کہ جنگل کے پرسکون اور فسوں خیز ماحول میں بھی راوی کی یادوں سے وہ مناظر محو نہیں ہوتے جن کے سبب پورا عالم تباہی کے دہانے پہ آگیا ہے۔ اس سلسلے کی چند سطریں ملاحظہ ہوں:

''دنیا شعلے اگل رہی ہے — معصوم انسانوں کو جنگل کی طرف بلالو — اس دہشت ناک دنیا کے درندے ان متنفسوں پر گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ خطا جن کی فقط یہ ہے کہ انھوں نے اپنی ذات کو بچانے کی سعی کی ہے۔ ایک دوسرا سیلاب عنقریب آنے والا ہے اور کشتی تیار ہے نسل انساں کے تحفظ کے لیے — ہم

آہنگی سے خائف، عشق سے متنفر، برباد شدہ دنیا، ہماری جلاوطنی کا سبب جو بنی۔ درندہ صفت انسان نما شیطانوں کو سردار کوئی نہ چڑھا سکا جب کہ ہم جیسوں کو دارورسن کی آزمائش سے گزرنا ـــ زہر حیات پینا پڑا۔ خون کی ندیاں بہتی رہیں، دجلہ کا پانی سرخ ہوتا رہا، بارود کی بو سے فضائیں مسموم ہوتی رہیں، عزتیں نیلام ہوتی رہیں، معصوموں کی آہیں بلند ہوتی رہیں اور وہ دنیا محض تماشائی بنی رہی۔''

نجمہ محمود نے وقت اور مقام کے تعین کے بغیر ان تمام مسائل کی طرف اشارہ کر دیا ہے جو برسہابرس سے انسان کو درپیش رہے ہیں اور اس وقت بھی اخبار کی سرخیوں میں ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس افسانے سے ہریالی، زرخیزی، آبشار، جھرنے اور دوسرے قدرتی نعمتوں کے ساتھ پانی کے حیات بخش ہونے کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔ پانی کا مسئلہ صرف ہندوستان ہی نہیں ایشیاء، افریقہ یوروپ سمیت پوری دنیا میں ناقابل تصور حد تک سنگین ہو چکا ہے۔ بے شمار علاقے آلودہ پانی پینے پہ مجبور ہیں۔ جس کی وجہ سے مہلک بیماریاں پھیل رہی ہیں۔ تیسری عالمی جنگ کی پیشین گوئی پانی کی وجہ سے ہو رہی ہے۔ زیرزمین پانی کی صوت حال یہ ہے کہ ٹیوب ویل لگوانے کے لیے ہزار ہزار فٹ کھدائی کے بعد پینے کے قابل پانی دستیاب ہو رہا ہے۔ جھیلیں اور تالاب سوکھ رہے ہیں اور جو باقی ہیں ان کا پانی اتنا گدلا اور آلودہ ہو چکا ہے کہ جانور بھی نہ پی سکیں۔ اردو افسانے میں اس مسئلہ پر کثرت سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔

○

تزئین زاہدہ
(ہیوسٹن، امریکہ)

''من دتو ایک ہوئے معجزہ ایسا دیکھا''

''جنگل کی آواز''۔ (افسانہ پیکر ناول)

ادب عالیہ کے لیے شرطِ اولیں ہے کہ ادیب کے پاس کوئی اچھوتا خیال ہو یا کسی خیال کے اظہار کا کوئی اچھوتا انداز ہو۔ محترمہ نجمہ محمود صاحبہ کا ناول ان دونوں تقاضوں پر پورا اترتا ہے۔ اردو زبان میں تجرباتی ادب بتدریج ناپید ہو رہا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ

ادبی تجربہ کرنے کے لیے جس علمی پس منظر کی ضرورت ہوتی ہے وہ عہدِ حاضر کے اردو ادیب کو کم کم ہی میسر ہے۔ جن لوگوں نے اردو ادب کو ادبی دنیا کے نقشے پر مقام دیا، وہ لوگ تھے جن کا مطالعہ کم از کم دو تین زبانوں کے ادب پر محیط تھا۔ پچاس سال قبل کا ادیب نہ صرف اپنے عہد کے ادب پاروں سے متعارف تھا بلکہ اس مکتبۂ عشق کے تمام نئے پرانے اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ کر چکا تھا۔ نتیجتاً ہمارے پاس اردو ادب کا وہ زرّیں باب ہے جس پر اردو زبان کی عمارت کھڑی ہے۔ اردو ادب کو قصۂ پارینہ ہونے سے بچانے کے لیے اس میں fresh blood کی اور تجرباتی تخلیقات کی ضرورت ہے۔ نجمہ محمود صاحبہ کا ناول ''جنگل کی آواز'' اس کی بہترین مثال ہے۔ نجمہ محمود کے یہاں ہمیں روایت کی پاسداری بھی ملتی ہے اور اس سے بغاوت بھی۔ ایک طرف وہ عالمی ادب سے مثالیں دے کر اپنا نظریہ بیان کرتی ہیں اور دوسری طرف مختصر ترین پیرائے میں عہدِ حاضر کے انسان کو درپیش روحانی اور جسمانی چیلنجز کا اس خوبی سے تذکرہ کرتی ہیں گویا جنگل میں ایک جھرنا بہ رہا ہو۔ ان میں تجربہ کرنے اور chance لینے کا حوصلہ ہے۔ تبھی انھوں نے اردو میں موجود اس myth کو توڑ دیا کہ ایک عظیم ناول کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک ضخیم ناول ہو۔

کردار نگاری میں ادیبہ نے غیر معمولی جرأتِ رندانہ سے کام لیا ہے۔ جس مکالمے کے لیے قاری کم از کم دو کرداروں کے ظہور پذیر ہونے کا منتظر تھا وہ ایک ہی کردار کے ظاہر اور باطن کی آواز سے بخوبی ادا ہو گیا۔ ایک کردار ظاہر اور دوسرا اس کا باطن، دنیا و مافیہا کے ہر موضوع پر وہ سب کہہ گئے جس کے لیے کسی اور ادیب کو کرداروں کی ایک فوج درکار ہوتی۔ ایک کامیاب مکالمے کے لیے جو conflict تخلیق کرنا پڑتا ہے وہ نجمہ محمود نے کمال کامیابی سے ایک ہی کردار کے اندر اور باہر کی آواز سے پیدا کر دیا۔

ناول کے پہلے تہائی حصے تک تو قاری، سفید گھوڑے پر سوار کسی شہزادے کا منتظر ہوتا ہے اور پھر اسے اندازہ ہو جاتا ہے بقول شاعر۔

''اب پیمبر نہیں آئیں گے ہمیں آئیں گے''

منظر کشی اس قدر مفصل اور vivid ہے کہ ناول کے انجام تک پہنچ کر قاری بخوبی جان جاتا ہے کہ ''جنگل'' جو بظاہر اس کہانی کی setting ہے، دراصل ایک اہم کردار ہے۔ لکھتی ہیں:

''کیا ہمیں جنگلوں کی ضرورت اس لیے نہیں کہ ہم انسان بن سکیں۔''

''لمحے جو ہماری تشکیل کرتے ہیں چپکے چپکے سے ہمارے اوپر سے گزرتے ہیں''۔

''میرے وجود! دنیا کے سارے مجبور اور معصوم انسانوں کو.... جنگل کی طرف بلالو۔''

''جنگل جب اتنا زندگی بخش ہو تو درختوں کو لہولہان کیوں کیا جارہا ہے۔''

''جنگل کی آواز'' ہمارے عہد کا ایک نمائندہ ناول اس لیے ہے کہ اس میں مختصر ترین پیرائے میں ہمارے ہر درد کا مداوا نہ سہی مرہم ضرور مل جاتا ہے۔

(ڈرامہ نگار)

teezeeprod@gmail.com

یہ افسانہ پیکر ناول میری آواز میں یوٹیوب پر سنا جا سکتا ہے

Type: Jungle ki Awaz by Najma Mahmood

○

غار (افسانہ)

(تبصرے)

○

آفتابِ نو

اندھیرا چھٹ رہا ہے
دور آسمانوں میں
اُفق کے پاس
اُگ رہا ہے آفتابِ نو
(کہیں یہ کوئی خواب تو نہیں؟)

(از: شعری مجموعہ ''ریگستان میں جھیل'')

پروفیسر ڈاکٹر محمد ثناء اللہ ندوی

ایک ماہر فنکار کا حساس ذہن راز حیات کی سربستگی سے اس طرح پردے اٹھاتا ہے کہ تخلیق کا گمان گذرتا ہے۔ ایسی ہی تخلیق ہمیں جمالیاتی حظ فراہم کرتی ہے۔ اس جمالیاتی حظ کو ارسطو نے کتھاسس کہا تھا۔ ایک فنکار جب اپنے گردوپیش کے مناظر کی ترنگوں کو اپنے وجود کے نہاں خانوں میں محسوس کرتا ہے تو اس کا تخلیقی ذہن ان ترنگوں کی تفہیم النفس کے علاوہ آفاق اور تاریخ کے حوالے سے کرتا ہے۔ اس تفہیم کو اگر زبان کے قالب میں ڈھال دیا جائے تو جادوئی رنگوں میں تاریخی اور انسانی آہنگ ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتا ہے جس سے باذوق قاری محظوظ ہی نہیں مستفید بھی ہوتا ہے۔

پروفیسر نجمہ محمود ایک حساس اور تخلیقی سرچشمہ سے معمور دانش ور ہیں ان کی دانش وری جب تخلیقی آہنگ میں اپنے آپ کو ڈھالتی ہے تو الفاظ اور جملوں کے سانچے میں انفس و آفاق کی آگہی ڈھل جاتی ہے یہ آگہی زمان، مکان، زبان اور مذہب کی حد بندیوں سے دور ایک خالص انسانی اور صوفیانہ یا غنوصی وسیع المشربی کی ترجمان ہے۔ جو حقیقت کو مختلف ناموں سے یاد کرتی ہے جیسے ایزیس (ISIS) اور ہرنیہ گربھ اور ''لوغوس'' (LOGOS) کرشنا یا تاریخ اسلام اور تصوف کے حوالے سے نور محمدی تک پروفیسر نجمہ محمود توحید ابراہیمی کے، نور محمدی کے الٰہیاتی اور دینیاتی تفاعلات سے بہ خوبی واقف ہیں جن کو تاریخ کے نادان ہاتھوں نے مختلف اقانیم میں انتہائی بھونڈے انداز سے بانٹ دیا تھا۔ اسی لئے نور محمدی کی کرنوں کا رقص بے خودی ہر ذرہ، ہر سبزہ اور ہر 'غار' میں نظر آتا ہے اس طرح ''غار'' ایک فکر انگیز چیز بن جاتی ہے۔ افسانہ نگار نے شب و روز کی زمینی سچائیوں کو بطور خاص ہندوستان کے فرقہ وارانہ سیاسی پس منظر کے حوالے سے اس طرح اجاگر کیا ہے کہ ایک حساس ذہن زخمی تو ضرور ہو جاتا ہے مگر افسانہ نگار کا حال بقول خلیل جبران اس عظیم انسان کی طرح ہے جس کے دو دل ہوتے ہیں ایک سے لہو ٹپکتا ہے دوسرا صبر کرتا ہے۔''

پروفیسر نجمہ محمود نے ہندوستان کے پس منظر میں الفاظ کا ایسا رمزیاتی استعمال کیا ہے کہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ گنگا، جمنی، سرسوتی، جیسی قدرتی ندیوں کے ساتھ میرٹھ، ملیانہ، بھاگلپور، بمبئی اور گجرات جیسی کشت و خون کی ندیوں کو تمثیلی جگہ دینا ان کی ہی فنکاری کا حصہ ہے۔

مشمولہ جنگل کی آواز (ادبی تخلیقات کا مجموعہ)

ڈاکٹر کوثر جمال

پروفیسر نجمہ محمود کا افسانہ ''غار'' ایک سرسری قرأت کے بجائے بہت گہرائی سے معنوی اور فنی طور پر پڑھنے / سمجھے جانے کا متقاضی ہے۔ ایک دو ''کمنٹس'' کے علاوہ ابھی اس افسانے کی پرت در پرت تفہیم کا دَر وا نہیں ہوا۔ یہ افسانہ صرف غار حرا یا پیغمبر اسلام کی مدحت پر مبنی تحریر نہیں ہے اس کا معنوی پھیلاؤ بہت زیادہ ہے۔ افسانے میں صبح، سبزہ، غار، اندھیرا یہ سارے الفاظ علامتی حسن لئے ہوئے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ فطرت اور اس کے قوانین کہیں زیادہ قدیم ہیں۔ فطرت ماں زندگی کا منبع اور مرکز ہے۔ نجمہ صاحبہ اپنی فکری توانائی فطرت سے حاصل کرتی ہیں۔ اور اس کے بعد ان کی ساری انسانی حیات فکر اور جذبہ کی ایک ہی لڑی میں پروئی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہاں افکار کی تقسیم نہیں وحدت کا منظر ہے...... سب خوش رہیں، سب صحت مند رہیں، ہر شخص محسوس کرے کہ اچھائی کیا ہے، کوئی دکھی نہ رہے''۔ رگ وید سے لے کر غارِ حرا اور مغربی مفکرین کے افکار، یہاں سب وحدت بناتے ہیں۔ افسانے کی تہ میں ایک لہر زندگی کی پامالی کے گہرے دکھ کی ہے اور دوسری تہہ قدیم تہذیبوں سے پھوٹی اس روشنی کی بھی ہے جسے موہوم امید کے طور پر لیا جاسکتا ہے..... ہوسکتا ہے کہ بعض احباب ''غار'' کو روایتی فریم سے باہر نکلا ہوا محسوس کریں، ہوسکتا ہے کہ اسے انشایئے سے زیادہ قریب قرار دیا جائے لیکن ان باتوں سے افسانے کی زبان و بیان اور معنوی حسن پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ پورا افسانہ ایک صبح کی نشست میں خیالات کی رَو پر بہتا ہوا، افکار کو پھیلاتا اور سمیٹتا ہوا وحدت تاثر کو کوئی گزند نہ پہنچائے بغیر اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ نجمہ آپا کے لئے بہت محبت۔

(یہ تبصرہ فیس بک پر بہ تاریخ ۲۲ر ستمبر ۲۰۱۹ء)

○

رضوانہ سید علی (فیس بک)

''خرد نے پیڑ کے پتوں میں تیری معرفت ڈھونڈی'' واہ اس تحریر کا ایک ایک لفظ محبت اور امن کی چاشنی میں ڈوبا ہوا اور اسے جس قدر گھونٹ گھونٹ کوئی اپنے اندر انڈیلے گا وہ گویا امرت رس سے فیض یاب ہوگا۔

رگ وید کیا کہتی ہے اور ہندو کیا کر رہا ہے۔

قرآن پاک کی تعلیم کیا ہے اور مسلمان کہاں جا رہے ہیں۔

زبور، انجیل کی روشنی کب کی معدوم ہو چکی اور رہ گئیں خون کی ندیاں اور دکھ کے سیلاب۔

قدیم زمانوں سے انسان کو برابر آگہی ملتی رہی لیکن خود اپنی وحشت کے سبب وہ بار بار جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبتا رہا اور آج جب سائنس اور ٹکنالوجی عروج پر ہے تب اندر کا اندھیرا اور وحشت کچھ زیادہ ہی ابل رہی ہے۔

نجمہ صاحبہ! آپ پر رب کی برکتیں اور خیر نازل ہو۔ اس تحریر نے تو میرا دل خوش کر دیا۔

○

یعقوب تصور

''ایک انتہائی خوبصورت تحریر، ماشاءاللہ فن افسانہ نگاری کا منفرد نمونہ۔ بہت بہت مبارک

○

ناصر صدیقی

کلاسک افسانہ۔ قرۃ العین کی یاد آ گئی۔

○

نگہت سلیم

ایک مترنم تحریر۔ جھرنے کی طرح بہتے لفظ لیکن یہ جھرنا آنسوؤں سے تخلیق ہوا ہے اور انسانیت پر نوحہ کناں ہے۔ ادیان علم انسان کی توقیر کا درس دیتے ہیں لیکن انہیں ماننے والے ان کی صحیح تشریح اور عمل سے غفلت کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں۔ افسانے کے بین السطور یہی سب کچھ ہے۔ ایک بار پھر اعلیٰ ڈکشن لکھنے اور خیالات کی جولانی پر مبارک باد

○

آصف اظہار علی

بہت اعلیٰ تحریر آنسوؤں سے لکھی گئی دل کی گہرائیوں میں اترتی ہوئی بہت کچھ کہتی ہوئی اور

ذہن انسانی کو سوچ کی وادیوں میں دور تک لے جاتی ہوئی یہ تحریر صرف اور صرف نجمہ آپا کی ہی ہوسکتی ہے۔ قابل تحسین ہیں آپ ہم جیسے تو آپ کو چھو بھی نہیں سکتے۔

○

حسن عالم

بہت عمدہ افسانہ، دل کو چھو گیا۔ بہترین منظر نگاری، عمدہ انداز بیان، کلاسیکی رنگ

○

ادیبہ بھٹی

''غار حرا میں ایک رات''۔ مستنصر حسین تارڑ صاحب کا اور پھر ''غار'' دونوں تحریریں پڑھ کر ایک بات دل کو لگی کہ قرآن بار بار جب تدبر اور تفکر کی نصیحت کرتا ہے تو ان کے لئے غار ایک سمبل ہے خود آگہی سے لے کر خدا شناسی کا۔

○

رضوانہ سید علی

غاروں کی گہرائیوں اور اتھاہ خاموشیوں نے انسانوں پر فکر و شعور کے نئے در کھولنے میں اہم کردار ادا کیا ہے، میرا خیال ہے ناقدین کو اس افسانے پر ضرور توجہ دینا چاہئے۔

○

ڈاکٹر سیدہ نرجس فاطمہ

نجمہ آپا کا افسانہ ''غار'' پھر ایک بار پڑھا۔ اس سے قبل فیس بک پر منعقد افسانہ میلے کے دوران بھی اسے دیکھا تھا لیکن شاہکار ادبی کارنامے یوں سمجھ میں نہیں آتے کیوں کہ ان میں پرتیں ہوتی ہیں، کشادگی ہوتی ہے، اور کبھی کبھی پوری تخلیق استعارہ ہوتی ہے، اس نوع کی تخلیقات از خود کھلتی ہیں اور کبھی قاری اپنے افہام کے مطابق ان میں غرق ہو جاتا ہے اور جہان معنی کی جستجو کرتا ہے۔ نجمہ آپا کا افسانہ اسی قبیل کا ہے۔ آپ اس کا جتنا مطالعہ کریں گے، گہرائی اور گیرائی میں اتریں گے اتنا ہی لطف آئے گا۔ یہ افسانہ آپ کے شعور کو بیدار کرتا ہے، روح کو غذا فراہم کرتا ہے

اور قلب کو جمالیاتی، اقداری مسرت بخشتا ہے۔

افسانے کا عنوان ''غار'' تہذیب کے ارتقاء کی علامت ہے۔ میں وحید قمر صاحب کی رائے سے متفق ہوں کہ جو ''غار'' کو تہذیب کے حوالے سے سمجھتے ہیں۔ ارل ٹوائن بی نے بھی ''غار'' کو تہذیب کی ابتدا کا مسکن بتایا ہے۔ نجمہ آپا کے افسانے میں بھی ''غار'' بڑی اہمیت کا حامل ہے وہ تہذیبی ارتقاء کی پہلی منزل ہے۔ افسانے کی ہیروئن بار بار شعوری اور لاشعوری طور پر ''غار'' کے حوالے سے مختلف منازل کو یاد کرتی ہے۔ ''غار'' جائے پناہ تھا۔ انسان کی پہلی رہائش تھا، اور عبادت و ریاضت کے لیے سکون کا مقام بھی تھا۔ کہانی کی واحد کردارا سے رگ ویدی دیوتاؤں کا مسکن اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت و ریاضت کے مقام کی حیثیت سے، جہاں اُن پر بہت سے رازہائے سربستہ منکشف ہوئے، یاد کرتی ہے۔

کہانی بنیادی اعتبار سے انٹروسپکشن یا خود بینی پر محیط ہے، کہانی کی خاتون کردار الصبح اپنے گھر کے لان میں بیٹھ کر تازہ ہوا کا لطف لیتی ہے۔ خوشگوار پیڑ پودے اور دوسرے فطری مناظر اسے ماضی میں لے جاتے ہیں جہاں وہ مختلف تہذیبوں کے عروج وزوال کا احساس کرتی ہے۔ اس کا تاریخی شعور فلم کے مانند اس کے سامنے پورا منظر نامہ پیش کر دیتا ہے۔ رگ وید کا زمانہ جہاں ہمالیہ کی بلندیوں پر، گپھاؤں اور غاروں میں رشی منیوں کا واس دکھائی دیتا ہے۔ اپنشدوں اور رامائن کا زمانہ جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی پیشین گوئی کی گئی ہے اُسے یاد آتا ہے۔ پھر اُس کا شعور قرآن کے نزول اور اس کی رحمتوں کی تصویر کشی کرتا ہے اس مختصر افسانے میں فلیش بیک تکنک استعمال کی گئی ہے جو سیاق کے اعتبار سے نہایت موزوں ہے۔

افسانے کا ماحول سحر انگیز ہے کیوں کہ یہ شعور کا سفر ہے۔ اس قسم کا ماحول ایملی برانٹی کے ناول Wuthering Heights اور ورجینا وولف کے ناول Mrs. Dalloway اور To the Lighthouse وغیرہ میں ملتا ہے۔ نجمہ آپا انگریزی ادب پڑھتی اور پڑھاتی رہی ہیں۔ اس لئے وہ اس سے بہ خوبی واقف ہیں اور اس کا اثر قبول کرنا ناگزیر ہے۔ اردو میں اس ماحول کو پیش کرنے کا تجربہ شاید بہت کم ہے۔ نجمہ آپا اس میں کامیاب ہیں۔

افسانہ ہیئت کے اعتبار سے رومانی ہے کیوں کہ اس میں ماضی کی بازگشت اکثر سنائی دیتی

ہے۔ نیز یہ کہ افسانہ کی خاتون سکون کی خاطر فرار بھی اختیار کرتی ہے لیکن پھر اپنی زندگی کی طرف واپس آتی ہے۔ افسانے میں فطری مناظر کے ذریعے بہت سے 'انٹروسپکشن' یا (خود بینی) ہوتے ہیں۔ یہ بھی رومانیت ہے۔ وہ آزادی کے وقت ملک کے بٹوارے اور اس کے نتیجے میں قتل وغارت گری کا منظر بھی دیکھتی ہے۔ یہ سب گزرا وقت ہے جس نے یادوں پر کبھی نہ مٹنے والے نقوش چھوڑے ہیں، جو لاشعور وشعور کے درمیان سفر کرتے رہتے ہیں۔ ''غار'' کہانی ہی اس لئے ہے کہ اس کا تعلق ماضی سے ہے۔ اس کہانی میں صرف ایک ہی کردار ہے اور اس کی بھی صرف ذہنی حالت بیان کی گئی ہے، یہ انسانی ارتقاء کی کہانی ہے، اس کے شعور ولاشعور کے خوابوں کی کہانی ہے اس کے تحصیلات اور تباہیوں کی کہانی ہے۔ یہ سب تہذیب کے عناصر ہیں، زندگی انہیں سے عبارت ہے۔ افسانے کی زبان ولفظیات، پیکریت اور دیگر صنعتیں شستہ، شائستہ اور برمحل ہیں۔ یہ مختصر افسانہ کامیاب ہے اس کے لئے میں نجمہ آپا کو مبارک باد پیش کرتی ہوں۔

''عالمی افسانہ فورم'' (فیس بک پر شائع شدہ)

○

وحید قمر

آپ کے افسانے ''غار'' کا مطالعہ کیا۔ یہ بہت ہی اعلیٰ تحریر ہے جب میں نے یہ افسانہ پہلی بار پڑھا تو محسوس ہوا کہ یہ تحریر ایک بار نہیں دو تین بار پڑھی جانے کے قابل ہے۔ بادی النظر میں یوں لگتا ہے کہ یہ اسلام کے بارے میں ہے لیکن جب اس کا گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیا تو پتا چلا کہ اس کا موضوع آفاقی ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ افسانہ ''غار'' انسان کی جو اس کائنات میں ازلی وابدی تنہائی ہے اور اس کی فطرت میں جو اپنے خالق کو تلاش کرنے کی ایک پیاس رکھ دی گئی ہے اس پیاس اور تلاش پر مشتمل ہے۔ یہ ہر انسان کی کہانی ہے جو خالق کو تلاش کرنے کے لئے نکلتا ہے۔ کئی حوالوں سے اس پر بات ہوسکتی ہے جتنا میری زندگی کا تجربہ اور تاریخ، فلسفہ، مذاہب عالم اور ادب کا مطالعہ ہے اس پر ہی میں چیزوں کو دیکھتا اور پرکھتا ہوں اور اپنی بری بھلی رائے دے دیتا ہوں خاص طور پر تنقید میرا شعبہ کبھی نہیں رہا، ورنہ ہر پہلو سے اس پر بات کی جاسکتی ہے۔ میری

رائے میں آپ کا یہ افسانہ اردو ادب کے چند اعلیٰ پائے کے افسانوں کے ساتھ رکھا جاسکتا ہے۔
(''عالمی افسانہ فورم'' پر شائع شدہ)

○

ذکیہ صدیقی

بہترین افسانہ۔ خوبصورت منظر کشی۔ سب اس میں سمودیا گیا ہے۔ آپ کے لئے دعائیں۔

○

غزال ضیغم

بے حد خوبصورت افسانہ۔ رگ وید کے اشلوک سے لے کر سورۂ رحمٰن..... قاری کو سانس لینے کا بھی موقع نہیں ملتا، اور رگ رگ میں درد اُتر جاتا ہے۔ سلامت رہیں۔

○

ثمینہ سیّد

بہت خوبصورت افسانہ اور نثری لوازمات کا مکمل اہتمام۔ بہت داد۔

○

سیّد کامی شاہ

پرت در پرت کھلتا ہوا، فکر ونظر کے دریچے وا کرتا ہوا بہت عمدہ افسانہ۔

○

میکائیل انور

عمدہ اور دلکش افسانہ۔

○

اقبال حسن آزاد

ایک گہرا فلسفیانہ افسانہ جس کا اسلوب نہایت دلکش اور رواں ہے۔

○

انصار محمود

نجمہ صاحبہ کی تحریر پڑھ کر بڑے ادیب یاد آجاتے ہیں۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ افسانہ فورم پر اتنی بڑی ادیبہ موجود ہیں۔

○

لہر لہر سمندر (افسانہ)

(تبصرے)

○

''اس کا تجسس فضاؤں میں جادو جگا رہا تھا۔ فطرت ہمیشہ اسے حیران اور مسرور کرتی تھی۔ وہ ڈوب رہی تھی ان مظاہر قدرت میں کہ ان کے ذریعہ وجود مطلق خود کو عیاں کرتا ہے''۔

(از: لہر لہر سمندر'')

ڈاکٹر ریاض توحیدی کاشمیری

افسانہ ''لہر لہر سمندر'' کی پر سوز کہانی پڑھ کر درج ذیل کوٹیشن یاد آئی۔

"Looking beauty in the world is the first step of purifying the mind."

دراصل یہ افسانہ دانشورانہ فراست کا عمدہ نمونہ فراہم کر رہا ہے اس لئے قرأت کے دوران نہ صرف جمالیاتی حظ محسوس ہو رہا ہے بلکہ ایک کردار کے اُبھرتے ڈوبتے جذبات واحساسات کی داخلی لہروں کے اتار چڑھاؤ کا فن کارانہ اظہار بھی نظر آتا ہے۔ بین المتن کی پوشیدہ کہانی ایک فلم کی طرح چل رہی ہے جو کردار کے طویل مشاہدات اور احساسات کا بیانیہ لگ رہا ہے جس میں نفسیاتی یا روحانی طور پر مراقبہ / محوخیال / تدبر کی کیفیت متحرک اور بصیرت افروز افکار کا تخیلی منظرنامہ بھی سامنے آتا ہے۔ منظرنگاری میں نہ صرف جمالیاتی منظر بلکہ ظاہری منظر میں حسن کل کی کاریگری اور خودنمائی بھی آشکار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

> ''اس کا تجسس فضاؤں میں جادو جگا رہا تھا۔ فطرت ہمیشہ اسے حیران اور مسرور کرتی تھی۔ وہ ڈوب رہی تھی ان مظاہر قدرت میں کہ ان کے ذریعہ وجود مطلق خود کو عیاں کرتا ہے''۔

اس کے بعد زندگی کی تلخ وشیریں یادیں (تقسیم کے سانحات) اور حادثات کی وجہ سے پنپنے والی منفی سوچ کے درمیان انسانیت پرور کردار (سیتارام) کی عملی کارکردگی سے متاثر ہو کر مثبت سوچ کی عکاسی سے ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ زندگی کا یہ سمندر مختلف اور متضاد لہروں کے اتار چڑھاؤ کی بدولت ہی اپنا وجود برقرار رکھتا ہے۔

> ''اسے لگا کہ اس کے اندر بھی ایک کائنات ہے۔ زندگی کتنی متضاد ہے جس میں لہروں جیسے زیروبم ہیں۔ جس میں غم بھی ہیں اور خوشیاں بھی۔ اسے یاد آیا ایک دائمی غم جس کا تعلق سرحد سے تھا۔ سرحد جس نے خاندانوں کو تقسیم کر دیا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک پیکر ابھرا۔ معصوم پیاری

سی بچی اس کی انتہائی عزیز بھانجی جو رو رو کر یہاں سے گئی اور کبھی اس
سرزمین کو بھول ہی نہ سکی— ''دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو''

اس پلاٹ کی بات کریں تو یہ بہ ظاہر ٹرین کے سفر کے تجربات ومشاہدات کی کہانی پر استوار ہوا ہے لیکن کردار کے جستہ جستہ افکار سے ظاہر ہے کہ ٹرین کا سفر کرافٹنگ کے طور پر استعمال ہوا ہے جو کہ اصل میں کردار کی وہ کہانی ہے جو ایک ٹرین کی طرح دوڑتی آئی ہے۔اب اس تہ در تہ کہانی کو کھولنا خود قاری کا کام ہے کہ کردار کے داخلی کرب، ذہنی سکون اور تجربات کو کسی طرح سے فنکشنائز کیا گیا ہے۔ بہ قول معروف نقاد رچرڈز کہ نظم ایک سوٹ کیس کی مانند ہوتی ہے جسے شاعر پیک کرتا ہے اور قاری اسے اَن پیک کرتا ہے۔اسی طرح اس افسانے میں کہانی کو بڑی مہارت سے پیک کیا گیا ہے اور یہ قاری کی بصیرت پر منحصر ہے کہ وہ Story Line پر فوکس کر کے کہاں تک اسے کھول سکتا ہے۔ مجھے ذاتی طور پر افسانے کی بُنت، کہانی، ٹریٹمنٹ اور کرافٹنگ کے ساتھ ساتھ مرکزی کردار کی داخلی سونامی اور خارجی خاموشی / سکون کی دلچسپ کرافٹنگ اور پڑھے لکھے لوگوں کے خوفناک چہروں کے برعکس اَن پڑھ کردار سیتارام کی مثالی انسان دوستی اور مہذبانہ روّیے کی منظر کشی بے حد پسند آئی۔

''راستے بھر اسے اس بہادر، شریف اور مخلص انسان کا خیال آتا رہا جو اس کا محافظ ثابت ہوا جس کے کپڑے میلے کچیلے اور بوسیدہ تھے جس کے ہاتھوں میں کتابیں نہیں تھیں لیکن دل صاف تھا، روح زندہ تھی....!''

○

عذرا قیصر نقوی

خوبصورت زبان وبیان۔ آج کل کے وحشت ناک ماحول میں یاد دلانے کے لئے کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ مثبت کہانی خوب

○

شبیہ زہرا حسینی

ماشاء اللہ انداز بیان قابل ستائش

قمر قدیر

ٹرین کا خالی کمپارٹمنٹ اور تنہا سفر میں ایک خاتون کے ساتھ پیش آنے والے واقعات اس خوبی سے پیش کئے گئے ہیں کہ قاری کا ذاتی تجربہ بن جانے میں دیر نہیں لگتی۔ سچ کہوں تو میری سانسیں رکنے لگی تھیں۔ جب کہانی سیدھے قاری سے جڑ جائے تو افسانہ کم اور حقیقت زیادہ بن جاتی ہے، اکیلے سفر میں ذہن کہاں کہاں بھٹکتا ہے، باہر کے مناظر دل کھینچتے ہیں تو کبھی گزرے ایام کی بند شریانوں سے تازہ لہو پھوٹ نکلتا ہے۔ کتابوں والے ہولناک چہرے کٹی انگلی سے ٹپکتا لہو اور ایک تنہا عورت کے لئے تحفظ کا احساس کراتا معصوم مسیحا........
مبارکباد پیش کرنا چاہوں گی کہانی دل میں اترتی چلی گئی۔

○

مہ جبین آصف

نجمہ محمود میری پسندیدہ رائٹر ہیں۔ ان کے افسانوں میں جو سرشاری اور بے خودی کی کیفیت ہوتی ہے وہ قاری کو اپنے ساتھ لہر لہر، کبھی بادلوں کے رنگ، کبھی شفاف پانیوں، کبھی جنگلوں کی گپھاؤں، کبھی ویرانوں کو گلزاروں میں بدل دینے کی سعی رکھتی ہیں۔ بے شک بہت اعلیٰ پائے کی افسانہ نگار کا قلم ہمیں شش جہات کی سیر کراتا ہے۔ مذکورہ افسانہ بھی داخلی باطنی کیفیات سے خارجیت تک کی مراجعت کا سفر ہے اس میں انسانی رویے، نفسیات خودکلامی سب کیفیات نے مدغم ہوکر اک خوبصورت پینٹنگ کا روپ دھار لیا ہے۔ افسانہ فورم کو یہ اعزاز ہے وہ ایسی تخلیقات کو پیش کرنے کا ہنر رکھتا ہے۔

○

اسنیٰ بدر

بہت عمدہ منظر نگاری ہے بہت خوبصورت کہانی ہے۔ بے شمار کریہہ چہروں نے سیتارام جیسے چھپا دیا ہے۔

○

نسیم سید

کس کمال کی جذبات نگاری ہے کہ ہر منظر تصویر ہوتا چلا جاتا ہے۔ سیتارام مرکزی کردار ہے کہانی کا وہ کردار جو گم ہوتا جارہا ہے چمکتی دمکتی زندگی کی چکا چوند میں۔ سیتارام کو اس سے غرض نہیں کہ وہ کس مذہب کی خاتون کی انگلی پر پٹی باندھ رہا ہے یا اس سے ہمدردی کر رہا ہے جسے نکال دیا تھا اسی خاتون نے اپنی بوگی سے۔ ایک سادہ سا دیہاتی انسانیت کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہے، اور کتابیں ہاتھوں میں تھامے تعلیم یافتہ نوجوان زبردستی اس زنانہ ڈبے میں گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں جس میں ایک اکیلی عورت بیٹھی ہے۔ افسانہ ایک آئینہ ہے جس میں بہت کچھ دیکھا جا سکتا ہے۔ بہت خوبصورت منظر نگاری اور ویسا ہی متوازن بیانیہ بہت خوب۔

○

کوثر جمال:

"This piece of writing is a thing of beaty and of course joy for ever."

○

اسماء حسن

میں نے جان بوجھ کر اس افسانے پر اپنی رائے محفوظ رکھی تھی تا کہ بعد میں بار بار پڑھ کر ایک رائے قائم کرسکوں کہ کہیں میں نجمہ صاحبہ کے اسلوب کے بارے میں بائسڈ تو نہیں ہو رہی ہوں۔ کیوں کہ ان کی پہلی تحریر پڑھ کر میں مسحور کر دینے والی کیفیت میں مبتلا ضرور ہوئی تھی۔ اس افسانے پر ملی جلی آراء ہیں کچھ کو اچھا لگا کچھ کو نہیں اچھا لگا۔ دراصل جیسے ہر لکھنے والے کا اسلوب، انداز بیان الگ الگ ہوا کرتا ہے اسی طرح ہر قاری کی فکر اور اپروچ بھی الگ ہوا کرتی ہے اور وہ اسی فکر کے تحت کسی بھی تحریر کی قرأت کرتا ہے، اور وہ تحریر اس سوچ کے مطابق ہے تو وہ سراہے گا اگر نہیں تو رد کر دے گا۔ اس میں ناراضی والی کوئی بات نہیں ہے اگر صاحب تحریر مطمئن ہے تو پھر تنقید جیسی بھی ہو فرق نہیں پڑے گا۔

میں اپنی بات کروں تو میں نجمہ صاحبہ کے اس افسانے کو پڑھ کر بھی اسی کیفیت میں مبتلا ہوئی

جیسی ان کی پہلی تحریر پڑھ کر ہوئی تھی۔ان کی پہلی تحریر مجھے اپنی فکر کے بہت قریب محسوس ہوئی تھی۔ ایسا لگا جیسے میں یہ سب کہنا چاہتی ہوں مگر نہیں کہہ پائی۔ وہ امیجری ہے یا حقیقت کے قریب یہ الگ بات ہے، یہ افسانہ بھی مجھے بہت پسند آیا۔ دیکھیں لکھاری کا جو مطمحِ نظر ہے وہ کسی تک پہونچ پایا یا نہیں، یہ قطعاً ضروری نہیں ہے لیکن اگر پہونچ جائے تو اس سے بڑھ کر خوش آیند پہلو نہیں۔

سب سے پہلے دیکھنا یہ ہے کہ افسانہ نگار نے کس پہلو پر فوکس کیا، یہاں پر لکھاری کا فوکس ''فطرت'' ہے اور اس فطرت میں اس کا بنیادی نکتہ ''سمندر کی لہروں'' پر مرتکز ہے اب وہ کھلیان ہیں یا ہری بھری گھاس یا کوئی بھی خوبصورت منظر جو مدّ وجزر دکھا رہا ہے اسے سمندر کی لہروں کی طرح لگتا ہے۔بس اتنی سی بات ہے کہ سیتارام کردار جس سے آغاز میں راویہ ڈرتی ہے وہ جب اس کی مدد کرتا ہے اور غلط لوگوں سے اسے بچاتا ہے اسے وہ اچھا لگنے لگتا ہے اور اس کا اعتماد بحال ہو جاتا ہے۔ آخر میں سیتارام کے الفاظ اسے انسانیت اور مخلص ہونے کی طرف لے جاتے ہیں۔

''بس اتنا ہی کا پھی ہے۔بہن جی بس بس اتنا ہی کا پھی ہے'' اور کھڑکی کے اس پار کھجور کے درختوں کا بکھرے پانیوں پر پڑتا ہوا عکس جادو جگا رہا تھا۔

اسے محسوس ہوا جیسے وہ ایک لہر ہے اور سمندری کائنات کا ایک حصہ ہے — لہر لہر سمندر!

عورت کی فکر فطرت کے حسین اور دلکش نظاروں میں کھوئی رہتی ہے اور لہروں کو زندگی کی دلکشی سے تعبیر کرتی ہے کہ لوگ بھی تو سمندر کی لہروں کی طرح ہیں۔اسے سیتارام بھی ایک لہر ہی محسوس ہوتا ہے کیوں کہ اسے لہروں سے پیار ہے۔

یہ بہت خوبصورت پہلو ہے اس افسانے کا۔اسی پر پورے افسانے کی عمارت تعمیر کی گئی ہے، جو کم از کم مجھے پسند آئی۔ ایسی سوچ عام لکھاری کے بس کی بات نہیں۔ بہر حال یہ میری سوچ ہے اختلاف رائے سب کا حق ہے۔ مجھے خود فطرت سے عشق ہے اور میں نہ جانے کیا کیا تلاش کرتی رہتی ہوں اس میں اس لئے بھی مجھے اس کا اسلوب بہت پسند آیا۔ میں آپ کو یقیناً پھر پڑھنا پسند کروں گی۔

○

عائشہ پروین

بہت خوبصورت افسانہ ہے۔ ''لہر لہر سمندر'' جس کے متن کا پس منظر انسانیت کی کھوئی ہوئی کوئی کرن جگمگا رہی ہے۔ احساسات کے سمندر میں قدرت کے مظاہر کے ڈوبتے ابھرتے خوبصورت منظر اور جذبات بھٹکے ہوئے معاشرے کو مثبت رویہ پیش کرتی حد سے زیادہ متاثر کن تحریر۔ مصنفہ کو ڈھیروں دعائیں۔

○

امواج الساحل

بہت اچھا افسانہ ہے۔ اس انسانیت سوز عہد میں وہ دیہاتی اس کی حفاظت کر رہا تھا جب کہ بہ ظاہر پڑھے لکھے اسے پریشان کر رہے تھے۔

○

فاطمہ حسن

بہت اچھا افسانہ۔ ادبی تحریر میں جمالیات کی جو ایک سطح ہونی چاہئے وہ اس کہانی کی خوبی ہے۔

○

عظمیٰ جبین

میں نے نجمہ محمود کو بہ طور قاری رائے دیتے ہوئے اب تک بہت بار دیکھا ہے۔ ان کے لہجہ میں بہت ٹھہراؤ اور وزن ہوتا ہے۔ آج پہلی بار انھیں بہ طور ادیبہ کے پڑھا اور بہت لطف آیا۔ اس افسانے نے مجھے ایک جگ بیتی یاد کروادی، واقعی ایسا اکیلا پن کسی کو بھی پیش آسکتا ہے لیکن ایسے سفر کی ہیبت کو کم کرنے والا سیتارام شاید ہی کسی کو نصیب ہو یہ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے، ہم اسے ایک خواہش بھی کہہ سکتے ہیں کہ افسانے کی لیکھک اس بات کی تمنا رکھتی ہیں کہ کیسی ہی اشانتی دنیا میں ہو جائے ایک دیا شانتی کا جلتا رہنا چاہئے۔ عنوان عمدہ اور جس انداز میں اسے افسانے کے تار و پود میں سمویا گیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔

○

جی حسین

افسانہ پڑھتے ہوئے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ میں افسانے کی کہانی کے بجائے افسانہ نگار کی شخصیت کو اس میں دیکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ پھر کچھ ایسی ہی کیفیت اس افسانے کو پڑھتے ہوئے ہوئی۔ اس میں کہانی پن اور افسانہ نگار کہنا کیا چاہتا ہے اس سے توجہ ہٹ گئی، اس کے بجائے راوی (یعنی کہ خود افسانہ نگار) کی ایک نفیس شخصیت ابھرنے لگی — ایک انسان زندگی کی خاص صورت حال میں کیا سوچ سکتا ہے وہ سبھی ممکنہ آدرش پڑھنے کو ملے۔

ہماری فاضل مصنفہ کو ایونٹ میں شرکت کرنے کے لئے مبارکباد اور ڈھیروں دعائیں۔ آج ہندوستان میں بہت زیادہ سیتارام نما انسانوں کی ضرورت ہے۔

○

قریشی منظور

افسانہ (لہر لہر سمندر) تکنکی لوازمات، کرافٹ، بیانیہ، منظر نگاری اسلوب اور لسانی جمالیات اپنے دامن میں بھر کر لایا ہے۔ ٹرین کے سفر کی زندگی کے سفر سے مماثلت مرکزی کردار کے ادراک میں زمینی حقائق کو جاننے، سمجھنے اور ان کا سامنا کرنے کا حوصلہ دیتی ہے۔

یہ تمام لوازمات افسانے کا لباس اور کاسٹیوم ہوتے ہیں جن سے آراستہ ہو کر وہ ادبی اسٹیج پر جلوہ گر ہوتا ہے لیکن لباس کے اندر افسانے کی روح، اس کا تنوع، تازگی اور خیال آفرینی ہوا کرتی ہے۔ تضادات اور کرونا جیسی وباؤں کے حامل اس مجموعے کو جسے ہم فطرت کہتے ہیں، خالق کوئی وجودِ مطلق ہے یا نہیں مجھے معلوم نہیں۔

ایک افسانے میں ندرت خیال — دھمکی دینے والی کتابیں تھامے ہاتھوں کے برعکس سیتارام کے بغیر کتابوں کے زخم پر مرہم لگانے والے ہاتھ تضادات کی اس دنیا میں انسان کی Bright side کا یقین دلا کر ہمارے رشتے امید سے جوڑ دیتے ہیں۔ یہی خیال آفرینی ہے جو زمین سے جڑے تخلیقی ادب کو روایتی رومانی روحانی ادب سے ممتاز کرتی ہے۔ دنیا کو دعاؤں اور عبادتوں سے زیادہ سیتارام کی ضرورت ہے۔

نجمہ محمود صاحبہ کے لئے نیک خواہشات۔

دکھ درد کا احساس مشینوں کے جہاں میں　　　پتھر سے نکلتے ہوئے سبزے کی طرح تھا

○

شمع ظفر

''لہر لہر سمندر'' بہت سادہ اور خوبصورت افسانہ ہے اور تم نے اسی انداز میں لکھا ہے جس میں لکھنا چاہئے تھا۔

○

حسن امام

عمدہ افسانہ ہے۔ کمال کی منظر نگاری۔ انسانیت کسی کی میراث نہیں ہوتی۔ اس مرکزی خیال پر نہایت ہنر مندی سے کہانی بُنی گئی ہے۔ داد اور نیک خواہشات

○

سخاوت حسین

اس افسانے کی سب سے خوبصورت چیز مجھے اس کی متوازن اور موزوں منظر نگاری لگی، احساسات کو خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔

○

غزل قاضی

دل آویز اور مسحور کن اسلوب۔ نجمہ آپی کے لئے دلی داد۔ بہت ہی خوبصورت افسانہ ہے۔

اَوِناش امن

نہایت عمدہ منظر نگاری، رواں بیانیہ، عمدہ اسلوب، کمال کی جزئیات نگاری.......

فرقان سنبھلی

عمدہ افسانہ، کمال کی منظر نگاری، مرکزی خیال پر نہایت ہنرمندی سے کہانی بُنی گئی ہے۔

اقبال مسعود

ایک بہت ہی خوبصورت افسانہ ہے۔ زبان، بیان، مکالمہ، منظر نگاری اور کہانی سب ہی لوازمات موجود ہیں۔ اس پر تجسس مستزاد۔ افسانہ فارم کے لحاظ سے مکمل ہے۔ نجمہ محمود صاحبہ قابل مبارک باد ہیں۔

اقبال حسن آزاد

عمدہ افسانہ ہے اگر غیر مطبوعہ ہے تو میں اسے مصنفہ کی اجازت سے ''ثالث'' کے لئے محفوظ کرلوں۔

(فیس بک کے عالمی افسانہ فارم پر شائع شدہ

○

''اور اُس کے سامنے تھیں دریا کی لہریں..... سامنے رنگ بدلتا آسمان،
زمین پر سبزے کا جادو اور تصوّر میں ایک انسان کا پیکر اور کانوں میں گونجتے
یہ الفاظ..... ''بس اتنا ہی کا پھی ہے۔بہن جی۔بس بس اتنا ہی کا پھی ہے''

(از: لہر لہر سمندر'' مشمولہ ''جنگل کی آواز'')

خالی جھولی (افسانہ)

(تبصرے)

○

''اور جب وہ وہاں سے نکلی .....اسے سمتوں کا اندازہ ہی نہ رہا
.....نہ جانے کدھر جا رہی تھی..... خون اس کی رگوں میں جم سا رہا
تھا۔ سڑک پر بھاگتی رہی نہ جانے کتنی دیر.....رکشہ لینے کا بھی اسے
ہوش نہ تھا''۔

(از: خالی جھولی'')
مشمولہ ''جنگل کی آواز''
(ادبی تخلیقات کا مجموعہ)

عالمی افسانہ فورم

ارشد عبدالحمید

ایک نہایت سچا موضوع۔ یہ ہر اس فیملی کا تجربہ ہے جس میں والدین روزگار کے حوالے سے دن بھر گھر سے باہر رہنے پر مجبور ہیں ایسے میں بچوں کی پرورش، تربیت اور ان کی صحت کی نگہداشت ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اس افسانے میں پیش کئے گئے ماں کے خدشات اور احساسات نہایت سچے ہیں اور کمال حقیقت نگاری کی مثال پیش کرتے ہیں۔ بہترین بات یہ ہے کہ یہ حقیقت جذبے اور احساس کی بنیادوں پر اُستوار ہے اور اسی احساس کو موثر ترین سطح تک بلند کرنے کے لئے افسانے کے اختتام میں ایک نوع کے مبالغے سے بھی کام لیا گیا ہے۔ جو افسانہ حقیقت نگاری کے ذریعہ آگے بڑھتا ہے وہ اپنے بچے کی فکر میں غلطاں ایک ماں کو اس وقت مبالغے کی انتہا پر پہنچا دیتا ہے جب وہ بچے کو بھیک مانگتا ہوا دیکھتی ہے اور بچہ بھیڑ میں گم ہو جاتا ہے۔ یہ وہ اختتام ہے جو روایتی انجام سے الگ ہے کہ بچے کو پہچان لینے کے بعد اسے بھیڑ میں گُم ہونے دینا اُس طرح کی حقیقت نگاری نہیں ہے جو افسانے کی ابتدا سے چلی آرہی ہے بلکہ یہ کسی ممتا بھری انتہائی فکر مند ماں کا وہ خدشہ ہے جو افسانے کے حرف اوّل سے قاری کے ساتھ ہے۔ محترمہ نجمہ محمود صاحبہ کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے واقعاتی منطق کو افسانے کی بنیاد نہیں بنایا بلکہ اس خدشے، اس خوف کو انجام تک extend کیا جو افسانے کا اصل موضوع ہے اور جس کی وجہ سے انجام اس قدر موثر بن گیا ہے کہ قاری کا دل دہل اٹھتا ہے۔ ایک نہایت سچے موضوع اور موثر پیش کش کی اس کامیاب تخلیق کے لئے میں نجمہ محمود صاحبہ کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

○

کوثر جمال

یہ افسانہ میں نے ڈاکٹر نجمہ محمود کی زبانی سنا بھی تھا۔ آج پڑھا اور اس کے اولین تاثر کو پھر سے محسوس کیا۔ اس افسانے میں کچھ ایسی قوت ہے جو قاری کو جکڑ لیتی ہے۔ آپ اس استانی کے

ساتھ رکشے میں سفر کرتے ہیں اور اندیشہ ہائے رنگا رنگ کے جھٹکے آپ خود بھی محسوس کرتے ہیں۔ افسانے میں ایک ملازمت پیشہ ماں کی بے قرار ممتا کی نفسیاتی کیفیت کو سچائی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ افسانہ کسی حقیقی واقعے کو بنیاد بنا کر لکھا گیا ہے کیوں کہ حقیقت ہی اتنی چونکانے والی ہو سکتی ہے۔ لیکن افسانہ نگار کا کمال یہ ہے کہ واقعہ کو یوں افسانے کا روپ دیا ہے کہ ہم نا قابل یقین حقیقت کے وجود میں آنے کا سارا احوال دیکھتے، تسلیم کرتے بلکہ سہتے ہیں۔ افسانے کی زبان سادہ مگر پُر زور ہے۔ ڈاکٹر نجمہ کے لئے بہت سی داد۔ ''خالی جھولی یاد رہ جانے والا افسانہ ہے۔''

○

شمع ظفر

واہ! کتنا اچھا افسانہ ہے۔ پڑھ کر دل اداس ہو گیا۔ کیسی کیسی پریشانیاں ہیں 'ورکنگ وومن' کے لئے۔ ماں کا دل و ذہن پورے وقت بچے کی طرف ہی رہتا ہے۔ جذبات اور احساسات کی بے حد سچی ترجمانی کی ہے۔ سادہ سے اسلوب میں کتنی دردمندی سے سب لکھا ہے۔ بہت ہی پر اثر اور بہترین افسانہ ہے۔

○

عذرا فاروقی

دل کو متاثر کرنے والا دل سوز افسانہ۔ انجام بہت چونکانے والا ہے۔

○

مریم ثمر

انتہائی خوبصورت، متاثر کن افسانہ۔ ایک ماں کی ممتا کی حقیقی تصویر کشی کی گئی ہے۔

○

تحسین اظہار

لاجواب اور بہترین کہانی۔ حقیقت کے قریب ترین بلکہ زندہ حقیقت۔

○

انجم قدوائی

نجمہ آپا ایک عظیم افسانہ نگار، ناول نگار اور شاعرہ ہیں۔ ان کی تحریریں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ یہ افسانہ ایک ورکنگ وومن کے تأثرات کو بہت خوبی سے سامنے لاتا ہے۔ ایک ایسی عورت جو اکثر مجبوری میں ملازمت کر رہی ہوتی ہے اور اس کے بچوں کو اس کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ ماں اپنے بچوں کی اس ضرورت کو اچھی طرح سمجھتی ہے اور ایک ایک پل پہاڑ کی طرح کاٹتی ہے اور جب گھر پہنچتی ہے تو بچے کو گود میں لے کر اپنی بھوک پیاس، ہر ضرورت سے بیگانہ ہو جاتی ہے۔

بچے کے لئے آیا رکھنا اس ماں کی مجبوری ہے جو اپنے بچوں کو گھر پر چھوڑ کر ان کے بہتر مستقبل کے لئے باہر دھکے کھاتی ہے۔ اور جب صورت حال ایسی ہو جائے تو اس ماں پر کیا گزری ہوگی یہ صرف ایک ماں ہی سمجھ سکتی ہے۔ درد میں ڈوبا ہوا ایک بہت خوبصورت افسانہ ہے۔ میں نجمہ آپا کی تحریر کی کیا تعریف کروں یہ تو سورج کو چراغ دکھانے والی بات ہوگی۔ بس اپنے جذبات کا اظہار کر رہی ہوں سلامت رہیئے، نجمہ آپا۔

○

رضوانہ سیّد علی

ٹکڑوں میں بٹی ایک ماں کی کہانی جو نجمہ صاحبہ ہی لکھ سکتی تھیں۔ پڑھ کر جی بھر آیا۔

○

اسماء قیوم

اف روح کانپ گئی۔ کیسا منجھا ہوا طرز تحریر ہے۔ نہ علامت نہ استعارہ..... بس سیدھا سادا ایک ماں کا خسارہ۔ ملازمت پیشہ ماؤں کی مجبوریوں اور ان پر مصلحتاً چشم پوشیوں کی آڑ میں خود کو دلاسہ دیتی داستان۔ لیکن حقیقت کس قدر ہولناک ہے اس کا ادراک ایک مجبور ماں ہی کر سکتی ہے۔ محترمہ نجمہ محمود کو سلام اور نیک تمنائیں۔

عذرا قیصر نقوی

ملازمت پیشہ ماؤں اور ان کے بچوں کی نگہداشت سے متعلق جانا پہچانا منظر نامہ..... انجام

غیر متوقع تھا لیکن دنیا میں کیا نہیں ہوتا۔ نجمہ آپا نے ایک ماں کی کشمکش کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔

○

زیبا خان

بہت خوبصورت۔ سچائی اور حقیقت سے قریب تر منظر نامہ پیش کیا۔ مبارکباد۔

○

عظیم اللہ ہاشمی

یہ افسانہ ملازمت کرنے والی ماؤں کے لئے سبق ہے کہ کہیں اس کے بچے کو بھی ماسی سڑک پر کٹورا تھما کر بھیک نہ منگواتی ہو۔ ایک بچہ پھٹے ہوئے میلے کپڑے پہنے ہاتھ میں پیالہ لئے دوڑ رہا تھا ہر راہ گیر کے پیچھے۔ اس لئے اس کا پہچاننا ذرا مشکل تھا لیکن اتنا زیادہ مشکل بھی نہ تھا۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی جس کے ہاتھ میں بھی ایک پیالہ تھا اور ہر راہ گیر کے پیچھے بھاگتی تھی اس کے پیالے میں چند سکے تھے اور بچے کے پیالے میں بھی اور ہر راہگیر کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتی تھی۔ مائی او مائی..... بچہ اس کی طرف پلٹا اور اس کے پیر چھونے لگا وہ کانپ گئی...... اس متن کو پڑھ کر قاری کانپ جاتا ہے۔ بہت دل گداز افسانہ ہے جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے نیک خواہشات۔

○

سلیم سرفراز

عمدہ اور متاثر کن افسانہ جس میں عہد جدید کے ایک ممکنہ خدشے کو فنکارانہ طریقہ سے آشکارا کیا گیا ہے اختتام غیر متوقع لیکن دل گداز ہے۔ ملازمت پیشہ عورتوں کے شوہر گھر کے معاملے میں ایسے لاپرواہ نہیں ہوتے نہ ہی اپنے بچے کی طرف سے اتنے بے فکر ہوتے ہیں کہ بچہ آیا کے ساتھ چار گھنٹہ سے غائب ہے اور وہ بیوی کا انتظار کر رہا ہے۔ بہر کیف افسانہ اتنا جذباتی ہے کہ ان باتوں کی طرف دھیان نہیں جاتا۔

○

ذکیہ صدیقی

اُف اللہ کتنا دلدوز افسانہ ہے۔ اس طرح کے کچھ افسانے اکثر پڑھے ہیں لیکن ایسا انجام کبھی نہیں پڑھا تھا۔ کیا خوب لکھا ہے۔ ایسا نقشہ کھینچا ہے جیسے سب کچھ سامنے ہو رہا ہے غیر ضروری کوئی بات نہیں۔ کہانی پر گرفت مضبوط رہی۔ بہت سادگی سے اتنی گہری کہانی کو انجام تک پہنچا دیا۔ انجام نے دل دہلا دیا۔ نجمہ آپ کے لئے زیادہ کچھ لکھنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ آپ کے لئے بہت سی دعائیں۔

○

نعیمہ جعفری پاشا

بہت ہی دردانگیز اور دلگداز افسانہ ہے۔ کام کاجی عورتوں کا المیہ۔ اس پر نجمہ آپا کا اندازِ بیان اور ایک ماں کے جذبات کی ترسیل بہترین۔ انجام تڑپا گیا۔ ببلو ہر ورکنگ ماں کا بچہ ہو سکتا ہے جو اپنے بچے کو آیا کے بھروسے چھوڑ جاتی ہے ایک عمدہ افسانے کے لئے نجمہ آپا کو سلام۔

○

عظمیٰ جبیں

نجمہ آپا کی تحریریں میں پڑھ چکی ہوں وہ بہت اچھے انداز میں لکھتی ہیں اور یہ افسانہ ''خالی جھولی'' بھی مؤثر ہے۔

○

مشتاق احمد نوری

نجمہ آپا نے کہانی تو ایک عام موضوع سے شروع کی کہ کام کاجی عورتوں کے لئے بچے کی پرورش کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے اور انھیں آیا پر بھروسہ کر کے اپنا لختِ جگر سونپنا پڑتا ہے۔ کہانی کی بُنت اور راست بیانیہ کا کمال یہ ہے کہ کہانی بے حد خاص ہو گئی اور قاری کا دل دہلا گئی۔ کلائمکس نے جیسے مٹھی میں دل ہی نچوڑ دیا۔ افففوہ اب کون کس پر بھروسہ کرے۔ نجمہ آپا کو بہت بہت مبارک باد۔

○

راجہ یوسف

بچوں سے ماں باپ کی دوری اس دور کا اہم مسئلہ ہے خاص طور سے ان خواتین کا جو ملازم پیشہ ہیں سرکاری نوکری کرنے والی خواتین کے شوہر بھی ملازم ہی ہوتے ہیں۔ میاں بیوی آفس کے کام میں اتنے الجھے رہتے ہیں کہ گھر اور بچوں کی طرف ان کی توجہ کم ہی رہتی ہے۔ مانا کہ وہ بھیک مانگتے مانگتے بھیڑ میں گم نہیں ہوجاتا لیکن ماں باپ کی عدم توجہی سے وہ کسی بھی غلط کمپنی میں پڑسکتا ہے، کسی برائی کی دلدل میں پھنس سکتا ہے۔ ایسا ہم آئے دن دیکھتے ہیں۔ سادہ اسلوب میں بہت بڑی بات کہی گئی ہے۔

○

حسن امام

ایک دردناک موضوع کو اچھی طرح سے برتا گیا ہے۔ نوکری کرنے والی خواتین کو اس طرح کے مسائل کا سامنا ہے۔ اس دور میں قابل اعتماد ملازمہ کا ملنا بہت مشکل ہے کہ وہ ایسا کچھ نہ کہہ دے کہ ماں کو شک ہوجائے۔ مجموعی طور پر افسانہ متاثر کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ ماں کو دیکھ کر بچے کے بھاگ جانے کا کوئی مناسب جواز نہ ہونے پر بھی افسانہ خود کو پڑھوالیتا ہے۔

○

اقبال حسن آزاد

اس موضوع پر اس سے قبل اردو میں کوئی افسانہ میری نظر سے نہیں گذرا تھا۔ مجھے یہ افسانہ اپنے موضوع کے انوکھے پن کی وجہ سے بے حد پسند آیا۔ اور میں نے اسے ''منتخب افسانہ'' کے تحت ''ثالث'' کے اس شمارے (عالمی خواتین نمبر) میں شامل کرلیا ہے۔

(نوٹ: یہ افسانہ ''ثالث'' کے ''عالمی خواتین نمبر'' میں شائع ہوا، شمارہ جنوری تا دسمبر ۲۰۲۰ء)

○

صنوبر کے سائے تلے
حجاب امتیاز علی کی طرز میں طرحی ناول

(تبصرہ)

○

''رات کا اندھیرا جھک رہا تھا۔ میں عشائیہ کے بعد اپنی خواب گاہ
میں تھی اور میرے ذہن کے نہاں خانوں میں مناظر اگ رہے تھے
.....رات کا وقت، گھپ اندھیارا، سیاہ سمندر، ساحل سمندر کی بھیگی
ریت پر چہل قدمی کرتی ہوئی میں قریب کے ریسٹراں میں ایک برتھ
ڈے پارٹی چل رہی تھی جس میں شرکت کے لئے میں آئی تھی اور
چپکے سے بحیرۂ عرب کے ساحل پر سیاہ سمندر دیکھنے اُدھر آنکلی تھی اور
سوچ رہی تھی کہ میں تنہا کیوں ہوں.....

(از: صنوبر کے سائے تلے، حجاب کی طرز میں طرحی ناول)
(مشمولہ ''جنگل کی آواز'')

سید حامد

''صنوبر کے سائے تلے''

نجمہ محمود کے ناول ''صنوبر کے سائے تلے'' کو میں نے ایک نشست میں پڑھ ڈالا۔ یہ بات میرے ابتدائی ارادہ کے خلاف تھی۔ اس ارادہ سے انحراف کے لئے مجھے دو یا تین باتوں سے مدد ملی۔ ایک تو یہ کہ ناول بہت مختصر ہے، دوسرے یہ دلکش ہے اور انہماک آفریں، تیسرے مصنفہ نے یہ اعلان بھی کر دیا تھا کہ یہ ناول حجاب امتیاز علی کی وضع پر لکھا گیا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ پر قاری کے لئے ایک مشغلہ اور جستجو کا ایک پہلو بن گئی۔ گویا داد اگر دینا ہے، ستائش اگر کرنی ہے، تو کتاب کے تخلیقی وصف کے علاوہ اس کے تقلیدی ہنر کو بھی ملحوظ رکھنا پڑے گا لیکن یہ تقلید نقالی نہیں ہے کہ اس کا شمار نقل راچہ عقل میں کر کے یکسو ہو جائیں۔ ناول نگار نے اپنے رشحات قلم کو 'طرحی' ناول سے موسوم کیا ہے گویا مصرع طرح حجاب امتیاز علی کے ناولوں نے فراہم کیا جس پر طبع آزمائی نجمہ محمود نے کی، گرہ انھوں نے لگائی لیکن مصرع طرح پر جو غزلیں لکھی جاتی ہیں وہ طرح کی ممنون صرف اس حد تک ہوتی ہیں کہ شاعر کو اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کے لئے ایک ہیئت مل جاتی ہے اور بس، پھر وہ آزاد ہو جاتا ہے اپنے افکار، تجربات، مشاہدات اور تاثرات کو اشعار کا روپ دینے کے لیے۔

لیکن بنیادی سوال یہ ہے جو کہ قاری کو خود سے شروع میں ہی کرنا چاہئے تھا کہ ناول نگار نے حجاب اسمٰعیل کو ہی کیوں اپنایا۔ جواب ظاہر ہے ان دونوں ارباب تصنیف کے مزاج اور طرز فکر میں مماثلت ہے۔ ورنہ نجمہ محمود کی کوشش پھیکی نقالی ہو کر رہ جاتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنفہ کو خلاق ازل نے غیر معمولی ذکاوتِ حس سے متصف کیا ہے۔ اس میں یہ ملکہ بھی ہے کہ وہ اپنے افکار اور احساسات کو قدرت کے وسیع پس منظر میں دیکھ سکے۔ اس قدرت کے وسیع پس منظر میں جو بہ یک وقت ایک طرف حسین اور نازک اور فرحت افزا ہے۔ قد آور درختوں اور خوشنما رنگ برنگے اور خوشبودار پھولوں سے آراستہ اور طائروں کے نغموں سے پرنور اور دوسری طرف بحر ذخار اور کوہسار اور مہیب اور صناع کے پرشکوہ جاہ و جلال سے ہیبت آفریں۔ اقبال کا وہ فارسی قطعہ یاد آتا ہے جس

میں اس نے خدا سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس نے خدا کی کائنات کو نوک پلک سے درست کیا ہے۔

بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم

مصنف زندگی کے دلفریب، تاریک اور غمناک پہلوؤں سے، بدلتے ہوئے موسموں کی طرح پردہ اٹھاتی ہوئی نظر آتی ہے۔

نجمہ محمود نے حجاب امتیاز علی کا اثر قبول کرنے کا تو اعتراف کیا لیکن وہ یہ بتانا بھول گئیں (اور ایسا کرنا چنداں ضروری بھی نہ تھا) کہ ان کی تحریر میں جا بجا ہمارے بڑے مصنفوں اور شاعروں (بالخصوص اقبال) کی بازگشت ملتی ہے۔ راقم سطور کو بتایا گیا ہے کہ مصنفہ کی تخلیقی تقلید کی ادبی حلقوں نے ستائشی انداز سے پذیرائی کی ہے۔ کیوں نہ کرتے کیونکہ یہ اپنی وضع کی ایک انوکھی اور دلکش کوشش ہے جو احساسات کے اظہار بھی کرتی ہے۔

اگر کتاب کی معنویت کو معرض جستجو میں لایا جائے تو اس میں ایک ظالم اور بے رحم دنیا سے عارضی فرار کی شکل ملتی ہے جو اعصاب کے لئے تسکین کا باعث ہو۔ یہی نہیں ناول کے قاری کو زندگی کے سرد و گرم اور سیاہ و سفید اور تغیرات کے ناگزیر ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

○

Saiyid Hamid: "A Living Stream"Vision, Action, Sporting Spirit

(تبصرہ)

پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی

Saiyid Hamid: "A Living Stream" Vision, Action, Sporting Spirit

کچھ مدت قبل سید حامد صاحب (مرحوم) پر ان کی زندگی میں انگریزی مضامین کا ایک مجموعہ Muslim Face of India کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس پر ہم نے کانفرنس گزٹ میں تبصرہ کیا تھا۔ اس میں ایک مضمون پروفیسر نجمہ محمود کا بھی تھا۔ یاد آتا ہے اس مضمون میں خاص طور سے سید حامد صاحب کی اسپورٹس مین اسپرٹ پر اظہار خیال کیا گیا تھا۔ زیر نظر کتابچے کو مصنفہ نے اپنے پیش لفظ میں مقالے کا نام دیا ہے اور لکھا ہے کہ دراصل یہ مقالہ Muslim Face of India کے لیے لکھا گیا تھا لیکن اس مقالے کی ''فلسفیانہ نوعیت'' کی بنا پر ان سے درخواست کی گئی کہ وہ ایک نسبتاً آسان مقالہ لکھ کر بھیج دیں اور اب وہ ''فلسفیانہ مقالہ'' زیر تبصرہ کتابچے کی شکل میں ہمارے پیش نظر ہے۔

فاضل مصنفہ نے سید حامد صاحب کو مسلمانانِ ہند میں سر سید احمد خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد کے بعد تیسری بلند پایہ شخصیت (Stalwart) قرار دیا ہے۔ اس سے ان کی نظر میں سید حامد صاحب کی وقعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مقالے کا آغاز اقبال کے اس شعر سے ہوا ہے:

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آبِ جو اسے سمجھا تو کوئی چارہ نہیں

اس کا مطلب ہے قدر گوہر شاہ انداند یا بداند جوہری، پروفیسر نجمہ محمود ''شاہ'' تو نہیں ہیں لیکن جوہری ضرور ہیں۔ وہ اس سے پہلے سید حامد صاحب (مرحوم) کے بارے میں اردو میں ایک گراں مایہ تصنیف ''گم اس میں ہیں آفاق'' کے زیرعنوان شائع کر چکی ہیں۔ زیر تبصرہ کتابچے میں سید حامد صاحب کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں رومی، اقبال، گوئٹے، ولیم جیمز جیسے بلند پایہ شعراء کا حوالہ دیتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ سے بھی استفاضے کا ذکر کیا ہے اور ایک

بحرِ بے کراں سے مماثلت دی ہے جو بہتا رہتا ہے، دنیا کو شاداب کرتا رہتا ہے لیکن اس کا کوئی اور چھور نہیں ہوتا ہے۔

پروفیسر نجمہ محمود کے نزدیک سید حامد صاحب کی ذات میں صوفیانہ اقدار کی جھلک بھی ملتی تھی۔ اسی لیے ان کا سروکار صرف اپنی ملت یا قوم سے نہیں تھا، عالم انسانیت سے تھا اور وہ انسان کامل کا نمونہ تھے۔ وہ ایسی تعلیم کے قائل تھے جو حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ انھوں نے اسلام کی روح اپنے اندر جذب کرلی تھی اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے تھے۔ وہ بہ یک وقت مصنف، شاعر، صحافی، ماہرِ تعلیم، عالم، منتظم، سماجی کارکن، مصلح، عملی انسان اور صحیح معنوں میں اسپورٹس مین تھے۔ ان میں وہ اسپوٹس مین اسپرٹ پائی جاتی تھی جو جرأت و ہمت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ان کی اس اسپرٹ اور اس جرأت کا بہترین مظاہرہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے دوران ہوا۔ مصنفہ کی اس رائے کی ہم بھرپور تائید کرتے ہیں۔ اسکے بعد مصنفہ نے بحیثیت وائس چانسلر سید حامد صاحب کے مختلف کارناموں پر مختصر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے سید حامد صاحب کے بارے میں مختلف علمی، ادبی اور انتظامی صلاحیتوں کے حامل افراد کے اقوال نقل کرکے یہ ثابت کیا ہے سید حامد صاحب کے معرفین و مداحین کا حلقہ کتنا وسیع ہے۔

اپنے اس مقالے میں بھی پروفیسر نجمہ محمود نے کھیلوں میں سید حامد صاحب کی گہری دلچسپی اور اس کے نتیجے میں ان کے اندر پیدا ہونے والی اسپورٹس مین اسپرٹ کا خاصہ طویل ذکر کیا ہے لیکن اس پر ہم اپنے پچھلے تبصرے میں اظہار خیال کرچکے ہیں۔ فاضل مصنفہ نے سید حامد صاحب کی ایک اور خصوصیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس طرف بہت کم لوگوں کی نظر جاتی ہے۔ راقم الحراف اپنے ایک مضمون میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک اور سابق وائس چانسلر پروفیسر عبدالعلیم (مرحوم) کی اسی خصوصیت کا حوالہ دے چکا ہے۔ یہ خصوصیت معصومیت ہے۔ بچہ معصوم ہوتا ہے۔ اس کی معصومیت اسے چھل کھپٹ سے محفوظ رکھتی ہے۔ بعض لوگ بڑی عمر کو پہنچ کر بھی اس صفت سے محروم نہیں ہوتے ہیں اور اس لیے مکر و فریب سے بچے رہتے ہیں۔ پروفیسر عبدالعلیم اور جناب سید حامد کا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔

مصنفہ نے بتایا ہے کہ سید حامد صاحب مادیت اور ترکِ دنیا دونوں کے خلاف تھے۔ ہمیں

یاد آتا ہے کہ انھوں نے کہیں لکھا تھا کہ بہت سے مسلمانوں نے توکل کو بے عملی کے مترادف سمجھ لیا ہے جو قطعاً غلط ہے۔ یہی صحیح اسلامی تعلیم ہے انسان کو نہ دولت کا غلام یا پجاری ہونا چاہیے اور نہ اس سے بے اعتنائی برتنی چاہیے۔ اسلام ہر معاملے میں اعتدالال کا داعی ہے۔ عورتوں کے سلسلے میں مصنفہ نے سید حامد کے رویے کو علامہ اقبال کے رویے کے مماثل قرار دیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ معاملے میں ان کے رویے کو مثالی نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔ اپنے عہد شباب میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک مصری مصنف فرید وجدی کی عربی تصنیف المرأۃ المسلمۃ کا اردو میں ترجمہ کیا تھا اور اس پر لکھا تھا جسمیں اسکی ہم نوائی کی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ اسکے نسخے بازار میں باقی نہیں رہے۔ جب حصول آزادی کے بعد ان سے اس کی دوبارہ اشاعت کی اجازت طلب کی گئی تو انھوں نے انکار کردیا اور کہا کہ اب اس بارے میں میرے وہ خیالات نہیں رہے ہیں جو اس وقت تھے۔

کتاب کے آخر میں فاضل مصنفہ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ سید حامد کی تمام کامرانیوں کا باعث اللہ تعالیٰ سے ان کا مخلصانہ تعلق خاطر، علم سے ان کا عشق اور ان کی بے مثال اسپورٹس مین اسپرٹ تھی۔ انھوں نے سید حامد صاحب کا ذکر کرتے ہوئے ہر جگہ افضل التفضیل (Superlative) کا صیغہ استعمال کیا ہے اور کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا ہے کہ بطور انسان ان میں کسی کمزوری یا خامی کا شائبہ بھی پایا جاتا تھا۔ ممکن ہے بعض لوگ اسے عقیدت میں غلو قرار دیں لیکن عقیدت ایسے ہی گل کھلاتی ہے اور اس لحاظ سے ہم اس مقالے کو افراط خلوص ونیاز کا گلستاں کہہ سکتے تھے۔

کتاب خوبصورت چھپی ہے، بالخصوص اس کا سرورق دیدہ زیب ہے، قیمت مناسب سے بھی کم ہے۔

○

○

آج کی صبح یقیناً بڑی شاندار تھی جو دائمی صحت مندی اور تلاش اپنے ساتھ لاتی ہے۔ اُس نے وجودِ مطلق کی بارگاہ میں اپنے وژن کے ساکار ہونے کی دعا کی اپنے عزیز ساتھیوں کو خدا حافظ کہا اور ایک نئے عزم کے ساتھ اُٹھی، جھاڑیوں اور سبزے پر پھیلی ہوئی اُلوہی روشنی کو سراہتی ہوئی کہ اُسے زندگی کو اپنے ہاتھ سے سنوارنا تھا!

(از: افسانہ ''غار'')

پیش لفظ

○ پانی اور چٹان

○ سید حامد کہ گم اس میں ہیں آفاق

○ جنگل کی آواز

○ ریگستان میں جھیل

○ بے زنجیر جستجو

○

کائنات کی طرف سب سے صاف راستہ جنگل سے جاتا ہے۔
بانسری کی تان جنگل کی آواز میں مدغم..... اوراس کے بعد ایک ہجوم
وارد ہوا۔ جنگل کی خوشبوؤں اور ہواؤں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ دریا
کے پانیوں پر کشتی مسرت سے جھوم رہی تھی۔ مجسم خوش آمدید! اور پھر
بادو باراں!

(از: ''جنگل کی آواز'' افسانہ پیکر ناول)

پانی اور چٹان

نجمہ محمود

کہانی کی وہ تعریف کہ یہ ''کسی خاص لمحے کو گرفت میں لانے کا نام ہے۔ وہ تیرتے، بہتے ہوئے لمحے، جو عموماً مشکل سے پکڑ میں آتے ہیں، ان کو لازوال بنانا کہانی کا اصل مقصد ہے''۔ بہت قابل قبول ہے کہ یوں کہانی بذات خود شعر بن جاتی ہے۔ شاعری جسے ''انسان کا بہترین کلام'' کہا گیا ہے ''علم کی روح اور تنفس'' کہا گیا ہے یوں کہانی ''تیسرے اور چوتھے درجے کی صنف سخن'' کے الزام سے خود کو صاف بچا لے جاتی ہے۔ اس سے قطع نظر قرآن حکیم میں آیا ہے ''کہانیاں کہتے رہو تاکہ لوگ کچھ تو سوچ بچار کریں''۔ ظاہر ہے کہ کہانی ایک عظیم مقصد کو ساتھ لے کر چلتی ہے۔ قرآن میں بہترین کہانیاں اور شاعری موجود ہے۔ خلیل جبران کی تحریریں شعر بھی ہیں اور افسانہ بھی، تصوف بھی اور پیغامبری بھی اور خلیل جبران بلندترین چوٹی پر کھڑا ہوا فنکار ہے۔ اس پر فقط شاعر یا افسانہ نگار کا ٹھپہ نہیں لگایا جا سکتا!

عظیم فن پارہ وہ نہیں جو سب کچھ براہِ راست کہہ دے، فقط پروپیگنڈا جس کا مقصد ہو۔ ساتھ ہی عظیم فن پارہ وہ بھی نہیں جسے پڑھ کر قاری چکرا جائے، سر پکڑ کر بیٹھ جائے، عرصۂ دراز تک اس کا مطالعہ کرے اور پھر بھی اس سے محظوظ نہ ہو سکے نہ ہی استفادہ حاصل کر سکے۔ ضروری ہے کہ کوئی تخلیقی فن پارہ پہلی بار میں ہی متاثر کرے، کچھ کہے اور بار بار پڑھنے پر بہت کچھ کہے قاری پر اک جہانِ معنی منکشف ہوں وہ فن پارہ ہم کو پہلے سے اوپر اٹھا دے، محظوظ بھی کرے اور زندگی بھی سنوار دے۔ شیخ سعدی، رومی، شیکسپیئر، دانتے، کولرج، ورڈزورتھ، خلیل جبران اور اقبال وغیرہ کی تخلیقات ایسی ہی تخلیقات ہیں۔ کہانی بھی، شاعری کی طرح زندگی کی تفسیر، تشریح، اور تعبیر ہے، نقد

حیات ہے، او ہنری کی کہانی ''میجائی کا تحفہ'' چیخوف کی ''شرط'' ٹیگور کی ''کابلی والا''، فاسٹر کی Road from Colonus وغیرہ ایسی ہی تخلیقات ہیں۔

کہانی کو سیاسی دستاویز یا معمہ نہیں ہونا چاہئے اس میں خلوص کی پروردہ ''اعلیٰ سنجیدگی'' ہو، تصوف ہو، اخلاق ہو، مذہبیت ہو، وہ مقصدی ہو، ساتھ ہی اس میں شاعری اور جیومیٹری بھی ہو یعنی استعارہ (دائرے کا استعارہ بڑے ادب میں عموماً استعمال ہوا ہے)۔ علامت نگاری، منظر نگاری، فطرت نگاری اور موسیقی کہانی کی فنی اور شعری خصوصیات ہیں۔ کرشن چندر اور حجاب امتیاز علی نے نثر میں شاعری کی، قرۃ العین حیدر کو ''تاریخ کی شاعرہ'' کہا گیا۔ تاریخ، ماقبل تاریخ، اساطیر اور Arechetypes کہانی کی روح ہیں۔ او ہنری کی ''The Last Leat'' اور فارسٹر کی ''The Road from Colonus'' میں خوبصورت شاعری ہے، مصوری ہے، عارفانہ لمحات کی گرفت ہے۔ اور ''وجود کے سوتے سے جدا'' اور ''غار'' میں شاعری، تصوف، تاریخ، اساطیر، مذہب اور اخلاق کا امتزاج، ایک تحیر خیز ماورائی کیفیت!

راقم الحروف ادب کو خانوں میں تقسیم کرنے کے خلاف ہے جبران کی تحریریں شعر بھی ہیں افسانہ بھی، ساتھ ہی اس کی الوہی صفت، روحانیت، عارفانہ شان، پیغمبرانہ بلند آہنگی، گہرائی اور گیرائی کی مظہر ہیں۔ یوں ہی فن اور فنکار کو بھی خانوں میں تقسیم کرنا غیر مستحسن ہے کسی بھی فن پارے میں ہم فنکار سے ہی ملتے ہیں اور وہ اپنی اصل شخصیت کو، حسیت کو صرف اپنے فن میں ہی ظاہر کر پاتا ہے ورنہ تو دنیا اسے کچھ کا کچھ سمجھتی رہتی ہے، اس کی تھاہ کو پانا مشکل ہوتا ہے کہ بڑی شخصیت سمندر کی مانند ہوا کرتی ہے۔ شیکسپیئر اپنی تخلیقات میں ہر جگہ موجود ہے وہ آفاقی موضوعات کی پیشکش کے ذریعہ اظہار ذات کرتا ہے۔ عشق، خودی، فنا، بقا، وقت، حسن، انسانی رشتے اور ان کی المناک ریزش — اور ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ بنوغی شخصیت کا مالک تھا، روح کا معالج تھا، صوفی تھا۔ انگریزی کی رومانی تحریک کا اہم ترین موضوع شخصیت تھا۔ جس کے بیج شیکسپیئر کی شاعری اور کہانیوں نے بوئے تھے۔ (اس پر ''ڈرامہ نگار'' کا ٹھپہ لگانا اسے محدود کرنا ہے۔ سیموئل جانسن اور کولرج نے اسے شاعر کہا تھا) خصوصاً اس کے سانیٹس میں پیش کردہ ''خوبرو نوجوان'' اور اس کے طربیوں کی نسائی شخصیتوں نے۔ اس کا تخیل زرخیز و بے کراں اور دل انسانی ہمدردی سے لبریز تھا،

اس نے حسن کا ادراک کیا تھا اس کا ذہن امتزاج تھا عقل و وجدان کا جو کہ دائروی شخصیت کی پہچان ہے۔ کسی کو گہرائی سے سمجھنے کے لئے مستند سرچشمہ اس کی تحریر ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ اپنی ذات کو مربوط اور مجتمع کرتا ہے۔ تخلیق سے غیر مخلص، نمائشی رغبت اور اس کے خالق سے بے اعتنائی (جو امریکی ''نئی تنقید'' کا خاصہ تھی) قطعاً مادہ پرستی اور اکھراپن ہے یہ اس روشن خیال کی تردید کرتی ہے کہ ''ذرہ ذرہ میں خدا کا ظہور ہے اسی کا نور ہے''۔ اگر قول وفعل میں تضاد نہیں، تال میل ہے، ریا کاری نہیں خلوص ہے تو فنکار کا مطالعہ (جو کہ افضل ترین مظہر قدرت ہے) اس کی تخلیقات سے بڑھ کر کسی اور طریقے سے ممکن نہیں۔

اس تعارف کی ضرورت یوں پیش آئی کہ اپنی تحریروں کا اور اس مجموعے کی اشاعت کا جواز پیش کرنا تھا (کہ آخر ہم کیوں شائع ہونا چاہتے ہیں) جب کہ تصانیف کی ایک باڑھ سی آئی ہوئی ہے جن کو پڑھنے کا کسی کے پاس وقت نہیں۔ آگے جو بھی لکھوں گی وہ ایک مسافر کی روئداد ہے، قلم جو ایک مسافر ہے اس کے سفر کی کہانی...... بچپن سے لے کر آج تک کا ذہنی سفر۔ اسے عنوان دیا ہے ''مسافرت'' جو تین حصوں میں منقسم ہے (حالانکہ سفر مسلسل ہی ہوتا ہے)۔ (۱) ''یادرفتہ'' جس میں بچپن میں لکھی ہوئی کہانیوں کا ذکر ہے جو غیر مطبوعہ رہیں۔ (۲) ''اپنی یاد میں..... '' کہ ہم اپنی ہی یاد ہیں اور (۳) دوڑ پیچھے کی طرف...... ''اور اب شروع ہوتی ہے.........

مسافرت

(''یادِرفتہ''...... جون ۱۹۶۳ء کی ایک پرانی نوٹ بک میں تحریر شدہ سطور جن کو کچھ مختصر کر کے اسی طرح پیش کر رہی ہوں۔

''چپکے چپکے آج میرے ذہن میں کچھ یادیں ابھر رہی ہیں جن کا تعلق بچپن میں لکھی ہوئی چند کہانیوں سے ہے جن میں سے اکثر ضائع کر دیں، کچھ محفوظ ہیں۔ کہانی سننے اور پڑھنے کا شوق بے انتہا تھا، ''گھسیٹا کی بھتنا شاہی'' اور ''تارا کا ڈنڈا''، چار پانچ سال کی عمر میں بہت پسندیدہ کہانیاں تھیں۔ صفیہ خالہ اور شرف جہاں باجی (ماموں زاد بہن) بہترین ڈھنگ سے کہانی سنانے میں ماہر تھیں۔ دونوں کا پیچھا نہ چھوڑتی ان کی آمد کا انتظار رہتا رات کے دو دو بجے تک کہانیاں چلتیں اور ہم کبھی پرستان میں تو کبھی محل میں تو کبھی اڑن کھٹولے پر ہوا میں محو پرواز..... کبھی جادوئی چراغ کے تصور میں دنیا مافیہا سے بے خبر!

لقماں (کہ انتہائی صوفی منش اور قابل تھیں) کا سنایا ہوا شیخ عبدالقادر جیلانی (بڑے پیر بابا) کے بچپن کا وہ واقعہ ذہن و دل پر ہمیشہ کے لئے نقش ہوا جس کے مطابق اس عظیم انسان نے سچ بول کر قافلے والوں کو ڈاکوؤں سے بچالیا تھا (ان ۴۰ دیناروں کے بارے میں بتادیا تھا جو چلتے وقت ان کی ماں نے ان کے کرتے کے اندر سی دیئے تھے اور نصیحت کی تھی کہ ''بیٹا جھوٹ کبھی نہ بولنا'') اس قصے نے جھوٹ سے سخت نفرت دل میں پیدا کی اور اسے ہمیشہ اپنی عزت نفس اور شان کے منافی پایا۔

گھر میں تاریخی ناولوں کا بہت چلن تھا چنانچہ کم عمری میں ہی ''فتح یرموک'' اور ''آفتابِ عالم''، ''منصور وموہنا'' وغیرہ پڑھ ڈالیں۔ پہلی کہانی شاید کسی تاریخی ناول کے ہی زیر اثر لکھی۔ عمر شاید ۸ یا ۹ سال رہی ہوگی۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بارے میں ایک ناول پڑھا اس سے ملتا جلتا پلاٹ سوچ کر کہانی لکھ ڈالی۔ گھر والوں کو سنائی۔ کسی نے سنی یا نہ سنی خود کو بہت طمانیت سی ہوئی لگا کہ ہم بھی لکھ رہے ہیں اور ہم بھی کچھ ہیں..... ذہن میں کتنی ہی داستانوی کہانیوں کی تصاویر کا ہجوم تھا تخیل کے ذریعہ زمانے بھر کی سیر۔ ایک کہانی کا پلاٹ کچھ یوں تھا۔ ایک لڑکی ابن زر نامی ظالم شخص کے چنگل میں پھنس جاتی ہے کسی صورت وہاں سے بھاگ نکلتی ہے راستے میں گھوڑسواری کرتا ہوا ایک شہزادہ اسے ملتا ہے جو کانٹوں سے لہولہان اس کے پیروں کو دیکھتا ہے اپنا کرتہ پھاڑ کر پٹی باندھتا ہے، اسے تحفظ دیتا ہے پھر اس سے شادی کر لیتا ہے (کرتہ پھاڑ کر پٹی باندھنا ایک مقبول عام رواج رہا ہے) ظلم کے خلاف بچپن سے رہی۔ شادی کے ساتھ تحفظ کا تصور بھی ذہن میں تھا جو دھیرے دھیرے دھندلا گیا!) انہیں دنوں سوچا کہ کہانی میں ان ہی باتوں کا ذکر ہو جن کا ہماری زندگی سے تعلق ہے تب ہی ایک چھوٹی سی کہانی لکھی عنوان تھا ''بھینٹ'' عمر دس سال کی رہی ہوگی۔ کہانی بھائی صاحب کے ہاتھ لگ گئی بہت ہنسے بولے ''پہلے جغرافیہ پڑھو پھر کہانیاں لکھنا یعنی تم کو یہ نہیں معلوم کہ لکھنؤ سے الہ آباد جانے میں بمبئی نہیں پڑتا'' معلومات کی کمی پر شرمسار ہوئی یہ تو بہت بعد میں پتہ چلا کہ فقط معلومات اور علم میں فرق ہے اصل میں ہوا یوں تھا کہ والد صاحب (کہ جنھوں نے خود چار حج کیے تھے ایک حج ہم بچوں کو بھی کروایا تھا) جب بائیس لوگوں پر مشتمل ایک قافلے کو ساتھ لے کر حج کو گئے تھے تو پانی کے جہاز سے بمبئی ہو کر گئے تھے اس وقت نو سال کی تھی چنانچہ ذہن میں Vague سا اک خیال تھا کہ جہاں جاؤ بمبئی پڑنا ضروری ہے! (وہ اپنا جانماز

لے کر جہاز کے عرشے پر پہونچنا اور سمندر کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنا آج تک یاد ہے......
محمدی جہاز کے عرشے پر پہونچنا اور سمندر کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنا آج تک یاد ہے.....
محمدی جہاز پر ۹ دن کا سفر..... اس کے بعد سے لگتا ہے سمندر وجود میں اتر آیا ہو!)۔ ذکر جغرافیہ کا ہورہا تھا اس کے بعد اس مضمون پر خصوصی توجہ دی کتنے ہی نقشے بھر ڈالے یہاں تک کہ ہمہ وقت دنیا نقشہ سامنے رہنے لگا اور پھر ساری سمتوں سے واقفیت۔ براعظم، کوہستانی سلسلے، دریا... سمندر ... دائرہ... پوری دنیا لگتا ہے جیسے وجود میں سما گئی ہو)

انہیں دنوں بچوں کے لئے ایک کہانی لکھی ''لالچ کا انجام'' لیکن بچہ ہوکر بچوں کی کہانیاں لکھنا بے حد مشکل کام ہے چنانچہ یہ تجربہ پسند نہ آیا۔ تقریباً گیارہ سال کی عمر پر ''نوشین'' کے عنوان سے ایک ناول لکھنا شروع کیا۔ نوشین لکھنؤ میں خوبصورت کوٹھی میں رہتی ہے ''پارٹیاں، خوش گپیاں، سیر تفریح اس کے مشاغل۔ کاپی ایک سہیلی اپنی بہن کو پڑھوانے کو لے گئی۔ واپس آنے پر اسے الٹ پلٹ کر دیکھا آخر میں یہ جملہ لکھا تھا ''اس کا کوئی ادبی معیار نہیں لکھنا وقت ضائع کرنا ہے'' خود احتسابی کی اپنی سرشت کے تحت کاپی کو نذر آتش کیا کہ خود کو بھی یہ محسوس ہورہا تھا کہ تحریر میں جان نہیں ہے.....

انھیں دنوں غریبوں کے دکھوں کا رومانی سا احساس پیدا ہوا تقریباً ۱۲ سال کی عمر میں ''شکستہ منزل'' اور ''پیر بابا'' کے عنوان سے دو کہانیاں لکھیں۔ اس کے بعد ''حسین راہیں'' کے عنوان سے ایک کہانی لکھی جو ایسے سماج کی آرزو پر مبنی تھی جس میں کوئی ''شانتی'' کسی تندیل مہاجن سے نہ بیاہی جائے یہ کہانی بھائی صاحب کے ہاتھ لگ گئی انھوں نے آخری صفحے پر یہ جملہ لکھ دیا ''جین آسٹن کا نام تم نے ضرور سنا ہوگا انھوں نے کوئی ایسا ناول نہیں لکھا جس کے ہر کردار سے وہ بخوبی واقف نہ ہوں''۔ (ان دنوں بھائی صاحب لکھنؤ کے کرسچین کالج میں پڑھ رہے تھے اور ہم ان کی قابلیت سے انتہائی مرعوب تھے) تنقید چونکہ مخلص تھی اس کا اثر ہوا۔ انھیں دنوں تقریباً ۱۳ سال کی عمر میں لکھی ''سرحد'' جس میں تقسیم ہند کے اثرات جو میرے خاندان پر ہوئے ان کا ذکر تھا مرکزی شخصیت ہماری عزیز بھانجی تھی جو ہم لوگوں سے بے حد مانوس تھی اور جسے اپنے والدین کے ساتھ مجبوراً پاکستان جانا پڑا تھا اور اس کا بہت بُرا اثر پڑا۔ وہ کہانی محفوظ ہے جب بھی پڑھتی ہوں اثر کرتی

ہے۔شائع کرانے کی توفیق نہ ہوئی۔اسی زمانے میں سماجی شعور کچھ اور بیدار ہوا۔قصبے کے ماحول میں سیکڑوں خامیاں نظر آئیں۔انھیں دنوں تحریر کی ''میراث'' اس وقت عمر تھی ۱۳ سال۔اسے پڑھ کر میرے بھانجے اور دوست امان نے کہا ''اصلاحی مضامین لکھو'' میں نے کہا ''یہ اصلاحی ہی ہے''۔اس کا مقصد سماج کی اصلاح کے علاوہ اپنی والدہ کے ایک رویہ کی بھی اصلاح کرنا مقصود تھا (جو کہ عام نقطۂ نظر سے تو صحیح تھا لیکن مجھے کوفت ہوتی تھی کہ ان کو میری شادی کی فکر لگی رہتی ہے (فقط ۱۳ سال کی عمر پر) اور وہ عموماً جہیز کی تیاری میں مصروف رہتی تھیں جب جب کہ راقم الحروف نے ایک دن دیوار پر پنسل سے لکھ دیا تھا کہ شاید ان کی نظر پڑ جائے ''یہ سخت زیادتی ہے کہ لڑکی کی شادی کر دی جائے''، جب اشارتاً کہنے پر گوٹا، چنکی اور طلع دانیاں اٹھا کر نہ رکھی گئیں تو کہانی لکھ کر روک دیا۔اماں نے کہا ''بیٹی یہ تو تم نے میرے بارے میں لکھ دی''۔میں نے جواب دیا ''مجبوری تھی'' اماں میری طرف سے مطمئن ہو کر کتابوں کے مطالعے میں لگ گئیں لڑکیوں کا اسکول کھول لیا۔گھر بھی اسکول بن گیا۔دو دو بجے رات تک پڑھائیاں ہوتیں۔اماں نے سوچا لڑکی کو پڑھا ہی دیں۔اب سوچیے ہم ایم۔اے، پی ایچ ڈی (علیگ) تین عدد کتابوں کے مصنف اور نہ جانے کتنی بیش بہا تحریروں کے خالق ساتھ ہی استاد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں انگریزی زبان و ادب کے ...... پر پیچ راہوں کے مسافر، تلاشِ حق کے لئے سرگرداں.........

اس کے بعد ''بیلے کے پھول'' کے عنوان سے ایک عدد کہانی تحریر کی جس میں ایک کم سن کنواری لڑکی کا بیلے کے پھولوں سے عشق دکھایا گیا ہے۔جس کی ماں اسے پھول چھونے کو بھی منع کرتی ہیں (راقم سطور کو بھی بیلے کے پھولوں سے عشق رہا ہے شادی سے اتنی ''الرجی'' اور ان پھولوں سے اتنا لگاؤ عجیب تضاد تھا آج تک سمجھ میں نہ آیا)۔

یہ جملہ بھی نظر سے گذرا...... ''اب تک کی لکھی ساری تحریریں معمولی ہیں ان کا کوئی ادبی معیار نہیں۔ابھی تک کوئی ایسی تحریر نہیں لکھ سکی ہوں جو قارئین کے ذہن و دل پر چھا سکے، ان کو مسحور کر سکے۔یہ مضمون بھی بچکانہ ہے اس لئے اشاعت کا ارادہ نہیں''۔

(نوٹ: قیامت کا critical sense تھا۔شاید یہی جواز ہے اس مجموعے کے اس قدر تاخیر سے منظرِ عام آنے کا جب کہ عمر کی آخری منزل پر ہوں ......! بہر حال اب وہی مضمون پیش خدمت کر دیا ہے باوجود اس کے کہ ''بچکانہ'' ہے۔)

(۲)

(جون ۱۹۶۶ء ایم۔اے فائنل (انگریزی) مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔امتحان دے کر گرمی کی تعطیل میں وطن عزیز ملیح آباد پہونچی۔اسی عرصے میں تحریر کی گئیں مندرجہ ذیل سطور بہ عنوان ''اپنی یاد میں''، جن کو جوں کا توں پیش کررہی ہوں۔ان سطور کو اس قلمی سفر یا اپنے تعارف کا دوسرا حصہ سمجھا جائے..... گرفتار شدہ یادوں کا سلسلہ..... سلسلۂ روز وشب.....)

''کاش میری تحریر میں وہ جادو پیدا ہو کہ بقول خلیل جبران بلند ترین چوٹی پر کھڑا فنکار ہے...''

......اور میں بہت دور نکل جاتی ہوں اس زمانے میں جب کہانی نے اپنی طرف کھینچنا شروع کیا تھا۔ذہن میں داستانوی کہانیوں کی خیالی تصاویر کا جم غفیر۔نئی کہانی تخلیق کرنے کا شوق جاگا۔دو تین صفحات پر مشتمل کلک کے قلم سے لکھی کہانیاں لگتا تھا معرکہ سرانجام دے لیا ہو..... لکھ کر بیشتر پھاڑ کر پھینک دیتی یا نذر آتش..... تیرہ سال کی عمر تک تقریباً دس کہانیاں لکھیں جن میں سے دو تین ہی محفوظ ہیں۔(ان کا ذکر پچھلی سطور میں آچکا ہے۔اور اب.......)

میری کہانیاں سن کر گھر والے دل رکھنے کو خوش ہو لیتے اور بس۔ان کا سب سے زیادہ نوٹس بھائی صاحب نے لیا۔(جو شاید میری صلاحیتوں کے قائل تھے واللہ اعلم) کہانی کسی طرح ان کے ہاتھ لگ جاتی، اسے پڑھ کر تنقید لازمی تھی۔اب تو استاد بھی تھے (انگریزی پڑھاتے تھے)۔ شرمساری عزم میں بدل جاتی کہ اب اس سے بہتر لکھوں گی جس دن ''میراث'' لکھی (بہ عمر ۱۳ سال) تو محسوس ہوا کہ یہ یقیناً اچھی کہانی ہے اور اس پر نکتہ چینی شاید میں برداشت نہ کرسکوں چنانچہ اسے چھپا دیا۔دھیان نہ رہا کہ چھوٹی بہن قریب کھڑی دیکھ رہی ہے۔شام کا وقت تھا کراچی والی بہن آئی ہوئی تھیں جاڑے کا زمانہ تھا سب اندر کے دالان میں جمع تھے موضوع گفتگو راقم الحروف تھی (کہ گھر کی مرکزی شخصیت تھی) بھائی صاحب (جو کہ ناچیز کے حمایتی تھے) مصر تھے کہ مجھے قصبے کے ماحول، گھر کی گھٹن (جو سخت پردے کی وجہ سے تھی) اور گھریلو کاموں سے دل برداشتہ نہیں ہونا چاہئے۔میں تقریباً رو پڑنے والی تھی کیونکہ مجھے بہت کوفت ہوتی تھی کہ گھر کے سارے کاموں کی ذمہ داری لڑکیوں اور خواتین کی ہی کیوں ہو (سلائی سے خصوصاً وحشت ہوتی تھی، باورچیوں جیسا کھانا بھی کبھی نہ پکانا آیا۔ویسے بھی اندرا گاندھی کہتی تھیں کہ دنیا کے بہترین باورچی

اور ورزی مرد ہوئے ہیں) ''لڑکی ذات'' ہونے پر سخت کوفت اور دکھ ہورہا تھا۔ فرسودہ روایات کے خلاف دل میں بغاوت کا جذبہ تھا جس میں سرفہرست تھی شادی کی مروجہ رسم جو اپنے بنیادی مقصد (رفاقت، تحفظ، تقدس) سے ہٹ کر بے عزتی، غلامی اور مجروح عزت نفس کے مترادف ہوکر رہ گئی تھی (بیویوں کی حالت زار کے پیش نظر) جس وقت بھائی صاحب ماحول سے سمجھوتہ کرنے کی تلقین کررہے تھے چھوٹی بہن کے خون نے جوش مارا اور میری چھپائی ہوئی کہانی (جسے وہ پڑھ چکی تھی اور دس سال کی تھی یقیناً کچھ سمجھی بھی ہوگی) اس نے لاکر بھائی کو تھمادی یعنی ''میراث'' انتہائی غیر متوقع طور پر، پہلی بار کہانی پڑھ کر بے حد خوش ہوئے۔ اس کہانی میں میں نے اپنے اندرونی محسوسات قلم بند کئے تھے کہانی کی صورت..... بہت تعریف کی بولے ''یہ تعریف منہ دیکھے کی نہیں ہے'' (منہ دیکھے کی کیا خاک ہوتی یہ یقین تو تھا ہی)۔ پھر حکم صادر ہوا ''اس کہانی کو پڑھ کر سناؤ'' جس کی تعمیل کی گئی۔ خوشی سے برا حال تھا۔ کہانی سنائی تو بڑی آپا بے حد متاثر کہ ہماری زبردست ''فین'' تھیں اور ہم ان کے۔ اماں ذرا الجھ سی گئیں کہ جہیز سے متعلق ان کی ''سرگرمیوں'' پر اس کہانی میں بالواسطہ نکتہ چینی تھی! اس کے بعد بھائی صاحب نے رسالہ ''آئینہ'' (جو بڑی آب و تاب سے ان دنوں نکلتا تھا..... باتصویر) دے کر کہا کہ جیلانی بانو کی کہانی ''فصل گل جو یاد آئی'' recitation (کا ناچیز کو بچپن سے شوق تھا) اس کہانی نے جادو کردیا۔ تجربے کی گہرائی، خوبصورت طرزِ ادا۔ لگا ایسی ہی کہانی میں لکھنا چاہتی ہوں۔ اک راہ مل گئی۔ اب میں ماحول کو بدلنے کے لئے، زندگی کو بہتر بنانے کے لئے کہانیاں لکھوں گی، زندگی کو جینے کے قابل بناؤں گی۔ انقلاب لاؤں گی۔ بے حد ولولہ، عزم اور حوصلہ تھا۔ اُدھر زوال پذیر معاشرہ، قصبہ کا ماحول، جہالت، تنگ نظری، غرور، ظلم، عیش وعشرت اور کھنڈرات اور اِدھر لاوے۔ اندھیرے جب تک دور نہ ہوں گے میں کہانیاں لکھتی رہوں گی۔ زندگی کو اوپر اٹھانے کی میری کوشش جاری رہے گی۔ ویسے میری بساط کیا لیکن پھر بھی میں لکھوں گی، ہمت نہ ہاروں گی۔ یہی سب ہے میری کہانیوں کا بنیادی محرک۔ یہ ظلم اور ناانصافی اور جہالت کے خلاف ایک علم بغاوت ہیں، ایک چنوتی ہیں، اور سچ کی علمبردار!

انھیں دنوں معروف ناول وافسانہ نگار ہاجرہ نازلی کی ایک کہانی ''بانو'' میں شائع ہوئی جس نے دل کو چھولیا میں نے مدیرہ کو خط لکھا۔ ''اس میں بے چاری نعیمہ کی کیا خطا تھی جو وہ اپنے شوہر کو

ایک بچے کا باپ نہ بناسکی اور سزا کے طور پر اسے طلاق ہوگئی۔ کہانی بہت پسند آئی..... ''وہ خط اس سے اگلے شمارے میں خطوط کے کالم میں سب سے پہلے شائع ہوا۔ خاندان میں کسی لڑکی کی یہ پہلی شائع شدہ تحریر تھی۔ سب بہت خوش ہوئے خصوصاً بھائی صاحب۔ اس کہانی کو پڑھ کر مجھے پہلی بار عورت کے دکھوں سے گہری ہمدردی کا احساس ہوا۔ ہاجرہ نازلی کی تحریریں ایک بہترین سماج کی تشکیل میں معاون ثابت ہوسکتی ہیں (جو کہ اگر مرد ہوتیں تو دیو بند کی مشہور دینی شخصیت ہوتیں، مولانا ہوتیں) عورت اگر عورت کی سچی ہمدرد ہوجائے تو دنیا ایک بہتر جگہ ہوسکتی ہے۔

ایک دن بھائی صاحب مجھے انگریزی شاعری کے بارے میں بتارہے تھے۔ ورڈز ورتھ، شیلی، کیٹس وغیرہ..... کہ یہ شعرا فطرت سے بے حد محبت کرتے تھے..... اس میں حسن تلاش کرتے تھے..... لیگ ڈسٹرکٹ..... اس وقت انگریزی کی رومانوی شاعری میں خصوصی دلچسپی پیدا ہوئی جواب تک برقرار ہے۔ اس شاعری میں مذہبیت ہے، معرفت ہے، گہرائی ہے کہ اس کی جڑیں دور تک پھیلی ہوئی ہیں صوفی ازم..... اسلام..... اٹھارویں صدی کی شاعری سے اس کا کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ بھائی صاحب اماں سے بولے ''یہ کچھ کرلے جائے گی اماں''۔ اماں ویسے ہی ہمیں اپنا ''بہترین ثمر'' اور نادر تخلیق سمجھنے لگی تھیں بہت خوش ہوئیں۔ حصول علم کا بے انتہا شوق ہم نے انہیں سے لیا۔ بیشتر ان کے ہاتھ میں اب کتاب رہتی۔ کبھی ''کلیات اقبال''، کبھی ''آشفتہ بیانی میری''، کبھی کوئی حدیث (یہ تب کی بات ہے جب جہیز سے متعلق سرگرمیاں رک جا چکی تھیں) بھائی صاحب انتہائی قابل، بے حد سنجیدہ، دنیاداری سے قطعاً دور، (نام خیرآباد کے صوفی مقبول میاں کا خود ان کے اپنے ہی نام پر، ان کا ہی رکھا ہوا) بس یہ کوشش تھی کہ کسی صورت بہنوں کی تعلیم وتربیت ہوجائے اور یہ اپنے پیروں پر کھڑی ہونے کے قابل ہوجائیں (اور ہم کھڑے ہوئے اپنے پیروں پر اور اب پیروں پر کھڑے کھڑے تھکان سے براحال ہوچکا ہے... خواتین کا تو گھر بیٹھنا ہی اچھا.....)۔

اونچی پرواز کی آرزو، کھلی فضاؤں میں سانس لینے کی تمنا... کہ دس سال کی عمر میں پردہ خود ہی کیا تھا.....! آزادی کی خواہش بھی اور خود پر عاید کیا ہوا پردہ بھی، یہ تضاد بھی سمجھ میں نہ آیا۔ اماں سے درخواست کی گئی..... ''برقعہ سلوا دیں'' سل گیا نیا، سیاہ برقعہ اور ہو گئے ہم اپنے گھر میں قید۔

دل میں اس معاشرے سے بغاوت کا جذبہ جس کے تحت کھلی فضاؤں، تازہ ہواؤں اور آزادی کے بجائے گھٹن میسّر ہو..... اور اس سب سے گھبرا کر علم وادب کی وسیع وعریض دنیا میں پناہ لی اور خود کو اکیلا کرلیا..... تنہا کرلیا..... تخیل کی دنیا میں ہجوم ہی اتنا تھا۔ اب سیر ہی سیر، ساری کائنات اب میری جولاں گاہ تھی، ذہنی اور روحانی سیر، دور دراز کے سفر!

انھیں دنوں تنقید کی کتابیں بھی پڑھیں جو بھائی صاحب اپنے لئے لایا کرتے تھے امیر الدولہ پبلک لائبریری لکھنؤ سے..... ''ساحل اور سمندر''، ''تنقیدی اشارے''، ممتاز شیریں کی تحریریں (جن کو دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ کوئی عورت نقاد ہے)۔ انھیں دنوں پڑھیں کفن (پریم چند) زندگی کے موڑ پر''، ''براہم پترا'' (کرشن چندر نے سحرزدہ کردیا) ''نیا قانون'' (منٹو)، ''چوتھی کا جوڑا'' (عصمت چغتائی)، ''جلاوطن'' (قرۃ العین حیدر) ''ڈھلتی شامیں'' (حجاب امتیاز علی)... انھیں دنوں ''سرخ آنچل'' کا اشتہار ''شاہراہ'' میں دیکھا فوراً وی پی کے ذریعہ کتابیں منگائی۔ اسے پرکاش پنڈت نے شائع کیا تھا، اس میں ۱۳ خواتین افسانہ نگاروں کے افسانے معہ حالات زندگی وتصاویر کے تھے۔ قرۃ العین حیدر کا افسانہ ''جہاں پھول کھلتے ہیں'' وجود پر چھا گیا... بھائی صاحب نے ایک غیر رسمی ٹسٹ لیا۔ اردو ادب کے مطالعے کو جانچنے کے لئے۔ سوال دیا ''اپنے پسندیدہ افسانے کا تجزیہ لکھو''۔ ناچیز نے اسی افسانہ کا تجزیہ لکھا وہ مضمون اب بھی کہیں رکھا ہے۔ (۱۹۵۸ء کا لکھا ہوا) ''سرخ آنچل'' پڑھ کر محسوس ہوا کہ خوشبوئیں اُٹھ رہی ہوں کتاب سے ..... دل بہت خوش کہ خواتین بہت اچھا لکھ رہی ہیں.....! (بزرگی ملاحظہ ہو.....)

اے حمید کا ناول ''جنگل روتے ہیں'' پڑھ کر رات بھر روئی..... نادر کتاب ہے..... اور احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، رضیہ فصیح احمد، شوکت صدیقی۔ مطالعے کا بے پناہ شوق تھا۔ ایک وسیع دنیا تخلیق کرلی تھی۔ کسی بات کا ہوش نہ رہتا پندرہ پندرہ روز گھر سے نہ نکلتی، گھٹن کا احساس بھی دور ہو چکا تھا..... (کہ گم اس میں ہیں آفاق!)..... ایک وسیع دنیا کی تخلیق..... لگتا تھا، یہ ارض وسماں میرے ہوں.....! انھیں دنوں وا ہوئیں نت نئی راہیں..... لیکن اپنی منفرد راہ کی بھی دھن رہی..... اور پھر ہائی اسکول میں پرائیویٹ طالبہ کی حیثیت سے فرسٹ ڈویژن حاصل کرنے پر بہ طور انعام کرامت حسین مسلم گرلز کالج میں داخلہ کرا دیا گیا (خاندان کی پہلی لڑکی جو اس منزل پر

پھوپھی) ساری کوششیں بھائی صاحب اور اماں نے کیں۔ والد صاحب لڑکیوں کی زیادہ تعلیم اور سروس کے خلاف تھے۔ شاید وہ ٹھیک تھے اور شاید وہ ٹھیک نہیں تھے عجب کنفیوژن... پڑھنا... زیادہ پڑھنا صحیح رہا کہ غلط سمجھ میں نہیں آتا....) کرامت حسین کالج نے میری علمی وادبی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ میری خود اعتمادی اور سنجیدگی میں اضافہ کیا..... کھیل کے میدان دیکھ کر طبیعت بے حد خوش ہوئی..... کیونکہ بچپن میں کھلاڑی بے حد تھی ذرا بڑی ہوئی تو کھیل بند..... کرامت میں سارے کھیل کھیلے سب سے زیادہ پسندیدہ کھیل بیڈمنٹن تھا..... اور ہاسٹل میں کیرم، این۔سی۔سی کی لیڈر بھی بنائی گئی.....!

''آواز دو ہم ایک ہیں'' چینی حملہ..... بلیک آؤٹ ((۱۹۶۱ء)۔ اس کالج کی طالبات کا ایک مخصوص hall mark رہا ہے۔ سنجیدگی، سادگی، مذہبیت، نفاست، باکرداری، ادبی ذوق، بڑوں کا ادب، چھوٹوں کا لحاظ..... اس ادارے میں رضیہ سجاد ظہیر مرکزی شخصیت تھیں ساتھ ہی انگریزی کی استاد مسز یوسف زئی..... جن کے لئے میں ''Special'' تھی، بہترین ٹیچر تھیں..... بہترین انسان تھے..... رضیہ سجاد ظہیر شفیق استاد تھیں، راہبر، سرپرست، بہت اچھی انسان اور ادیبہ کلاس میں کبھی کبھی کہانیاں بھی سناتیں.... موثر، سمندری گہرائیاں لئے ہوئے آواز، لہجہ کا زیروبم، تاثیر۔ کہانی پڑھنے کا ڈھنگ میں نے ان سے سیکھا انھوں نے مجھے بہت inspire کیا۔ ان کی کہانی ''سچ، اور سچ اور سچ کے سوا کچھ نہیں'' ان کی بہترین کہانی ہے اس میں جو مزاح رضیہ سجاد ظہیر نے پیدا کیا ہے وہ ان کی انتہائی ذہانت کا غماض ہے۔ ہنستے ہنستے آپ کی آنکھوں میں آنسو آجائیں گے رضیہ آپا روتوں کو ہنسانے والی تھیں.... رلانے والے تو بہتیرے ہیں ہنسانے اور خون بڑھانے والے کتنے ہیں، جن کو مزاح نگار ہونے کا دعویٰ ہے ان کی تحریروں میں زبردستی پیدا کیا گیا مزاح (آورد سے لبریز) ہنسانے کے بجائے رلا دیتا ہے۔ جی چاہتا ہے چیخیں مار کر رودوں۔ کبھی ایسے مضامین دیکھنے کو نہ ملے ''قرۃ العین کی تحریروں میں مزاح کا پہلو'' یا رضیہ سجاد ظہیر کی مزاح نگاری''۔ خیر یہ سب تو برسبیل تذکرہ آگیا..... راقم الحروف رضیہ آپا کی عزیز شاگرد تھی وہ نجمہ باجی کو ''جو'' کہتی تھیں مجھے بھی اکثر ''جو'' کہتی تھیں۔ (نسیم میری بے حد گہری دوست تھیں اور زبردست حمایتی...) رضیہ آپا نے مجھے بزم ادب ''کہکشاں'' کا سکریٹری مقرر کیا (جو میرے زمانے میں بے

حد سرگرم رہی۔ ہم نے ''یوم مجاز اور'' یوم ٹیگور'' منعقد کئے)، میگزین کا ایڈیٹر مقرر کیا جو کئی سال بعد آب وتاب سے شائع ہوئی۔ میرا ڈرامہ ''رائی کا پربت'' سالانہ جلسے میں پیش کروایا پھر اسے مجھ سے ہی ڈائرکٹ کروایا۔ ۱۹۶۱ء میں سجاد ظہیر صاحب سے متعارف کرایا۔'' کچی انقلابی ہے یہ لڑکی'' ''میراث'' ان کو سنوائی جسے انھوں نے ''عوامی دور'' میں شائع کرایا۔ مجاز اور ٹیگور پر لکھے مضامین ''حیات'' میں شائع کئے۔ (عوامیدور'' کا تبدیل شدہ نام) 'کنویسنگ' اتنی پرزور، اتنی مخلص تھی کہ سجاد ظہیر صاحب نے میری آٹوگراف بک پر لکھا۔

مت سہل اسے جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اس کے نیچے یہ جملہ لکھا تھا '' کہیں تم بھی پیاری نجمہ ایسی ہی انسان تو نہیں ہو''؟ میری کہانی ''میراث'' سننے کے بعد انھوں نے رضیہ آپا سے کہا تھا ''نجمہ میں بڑا ادیب بننے کے جراثیم ہیں''۔ (انسان دوستی اور خلوص سے معمور یہ موسیقی آمیز جملے اور یہ شعر کسی صورت ذہن سے نہیں نکلتے! ایک بار رضیہ آپا نے سالانہ جلسہ میں جس میں مجھے اپنا ڈرامہ سنانا تھا میرا تعارف ان الفاظ میں کرایا.....

''نجمہ کی سادگی، ذہانت، معصومیت، گھبراہٹ اور خلوص اس بات کے ضامن ہیں کہ یہ مستقبل میں بڑی ادیب ہوں گی''..... کیسے بھول جاؤں وہ سب کچھ۔ صارفیت کے اس دور میں کسے توفیق کہ وہ کسی کے جوہر قابل کو پرکھ کے سچ بات کہہ سکے، صحیح معنوں میں سرپرستی کر سکے۔ سب اندر ہی اندر گھٹن کا شکار ہیں دست شفقت رکھیں تو کیسے .....ان ہی صفات کو کیسا کیسا misinterpret کیا گیا علم وادب کے اس گہوارے میں، سرسید کے قائم کردہ اس ادارے میں..... حسد، تنگ دلی، بغض وعناد، cut throat فالتو competition! لیکن یہ سب علم کے اس سرچشمے میں کیوں ہوا؟

انہیں دنوں عصمت چغتائی کالج آئیں وہ پرنسپل مس وسیم کی دوست تھیں۔ میں پرنسپل آفس کے سامنے والے نیم دائروی برآمدے کے ایک مدور ستون کے پاس بیٹھی 'میکبتھ' پڑھ رہی تھی اچانک نظر اٹھی ایک اجنبی خاتون کا سراپا۔ لانبا قد، ترشے ہوئے گھنگھرالے بال، آنکھوں پر سیاہ

چشمہ سرمئی ساری میں ملبوس انتہائی اسمارٹ اور شاندار خاتون۔ میں کچھ گھبرا سی گئی اٹھ کر کھڑی ہوئی اسی وقت مس وسیم نمودار ہوئیں میرا ان سے تعارف کرادیا۔''عصمت ان سے ملو یہ ہیں نجمہ محمود ہمارے کالج کی creative writer ہیں۔ میں اس عزت افزائی پر خوشی سے سرشار۔ اپنا تو کالج میں Aura تھا۔ اس زمانہ کو کرامت کی ہسٹری میں ''نجمہ محمود کا دور'' کہا جاتا تھا..... (یہ لن ترانی نہیں حقیقت ہے) میں ایک اور ادیبہ سے مل کر شاداں وفرحاں مبہوت سی کھڑی تھی۔ اس زمانے میں ادیبوں سے مل کر بے تحاشا خوشی ہوتی تھی (اب خاک اتنی نہیں ہوتی سیمینار زدہ ادیبوں، ناقدوں اور مشاعروں اور اکیڈمیوں زدہ شعرائے کرام سے قطعاً ملنے کو طبیعت نہیں چاہتی) پھر تو جب تک عصمت آپا رہیں ان سے ملنے مس وسیم کی رہائش گاہ پر جاتی۔ خوب باتیں کرتی (باتونی میں بھی تھی اور وہ بھی) کہانیاں سنتی، کبھی اپنی کہانی سناتی۔ ان سے بہت inspiration ملا۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ خوف وہراس کم ہوا۔ سماج کا ہوا۔ انھوں نے احساس دلایا''تم خود سماج ہو جو محسوس کرو کہ صحیح ہو تو کسی سے مت ڈرو''ان کے اعزاز میں کہکشاں کا جلسہ کیا۔ عصمت آپا جیسی دبنگ، بے باک اور دلیر کوئی دوسری خاتون نہ دیکھی، نہ کسی کے رعب میں آتیں نہ ڈرتیں (کاش کہ انھوں نے ینگ (Jung) سے بھی اثر قبول کیا ہوتا)

(۳)

(مندرجہ ذیل سطور وقتاً فوقتاً لکھی گئیں جو محسوس کیا لکھ لیا، لمحوں کو گرفت میں لے لیا۔ اس حصے میں میرے قلم کے سفر کی تیسری اور چوتھی منزل کی پیشکش ہوگی۔ ان سطور کو عنوان دیا ہے ''سرنگیں..... دوڑ پیچھے کی طرف''تینوں حصوں کے پہلے پیراگراف مماثلت رکھتے ہیں پھر بھی مختلف ہیں..... سفر کی پہلی منزل سب سے اہم ہوا کرتی ہے..... Origin ...... ایسا کرنا ناگزیر تھا کہ ابتدا کو انتہا سے منسلک کرنا تھا)

گہری مذہبیت، حصول علم کا شوق اور صوفی فکر والدہ اور بھائی سے ملی۔ کم عمری میں لکھنا شروع کیا لکھ کر عموماً ضائع کردیتی کہ کہیں کوئی پڑھ نہ لے اتنی معمولی تحریر۔ پچھلی کہانی عموماً پھر اچھی نہ لگتی۔ خوب سے خوب تر کی جستجو رہتی۔ نکتہ چینی کو مثبت طور سے لیتی۔ رومانی اور عشقیہ کہانی کبھی نہ لکھ سکی کہ کوئی پڑھے گا تو کیا سوچے گا (یہ تو بعد میں پتہ چلا کہ میری کہانیوں میں رومانیت کی ''زیریں

لہریں'' ہیں اور یہ بھی علم ہوا کہ میری ساری کہانیاں آفاقی عشق (Universal Love) سے لبریز ہیں۔ ''لہر اور سمندر''، '' آئینہ کی تصویر''، ''غار''، ''وجود کے سوتے سے جدا''، ''خالی جھولی''، ''بوڑھا برگد'' وغیرہ میں انسان سے، فطرت سے، خدا سے گہری محبت پنہاں ہے۔ آفاقی عشق!

بی۔اے اور ایم۔اے میں اردو اور انگریزی ادب کے مطالعے سے ذہنی افق مزید وسیع ہوا۔ بی۔اے کے امتحان کے بعد شیکسپیئر کے اٹھائیس ڈرامے پڑھ ڈالے۔ ٹیگور کی گیتا نجلی، ناولوں اور کہانیوں کا مطالعہ کیا۔ خلیل جبران وجود پر مزید چھا گیا۔ ایم۔اے میں ورجینیا وولف نے خصوصی طور سے متاثر کیا۔ اس کی حسیت کو اپنے مزاج سے ہم آہنگ پایا۔ استعاراتی، علامتی، اساطیری اور الوہی اظہار کے محاسن سمجھ میں آئے۔ ورجینیا وولف کے ناول ''لہریں''، ''روشنی کے مینار کی طرف'' وغیرہ میں بہترین صوفی شاعری ہے۔ شاعری اور افسانے کا امتزاج۔ اس مصنفہ کا خصوصی مطالعہ یوں بھی کیا کہ اردو تنقید میں ''شعور کی رو کی تکنیک'' کو قرۃ العین حیدر کی تحریروں پر بے تحاشا مسلط کیا گیا تھا اسے پورے طور پر سمجھے بغیر — شعور کی رَو، تکنیک نہیں ایک تصور، Concept یا اقبال کے الفاظ میں ''زندہ رود'' ہے (۱) یہی اقبال کا تصورِ خودی ہے۔ جو قرۃ العین حیدر کی تحریروں میں بھی موجود ہے۔

''ادھورے سپنے'' قاضی عبدالستار نے ''راوی'' کے جلسے میں سنوائی شاید سامعین کو پسند بھی آئی۔ وہ کہانی میں نے سرور صاحب کو پڑھنے کو دی۔ عصمت آپا جب علی گڑھ آئیں تو ان کو سنائی۔ دونوں کا خیال تھا کہ کہانی کی مرکزی شخصیت یعنی شاہینہ کو حالات سے خاموش اور سرد جنگ لڑنا چاہیے، جدوجہد کرنا چاہیے۔ سماج کی بے جا بندشوں اور رسومات کے خلاف بغاوت کرنا چاہیے (یہ نسخہ آگے چل کر بہت کام آیا) انھوں نے یہ بھی کہا کہ اسے ایسا ہونا چاہیے کہ لوگ اسے قابلِ رحم سمجھنے کے بجائے اس کے عزم اور حوصلے کو سراہیں، اس کی ہمت کی داد دیں۔ وہ اتنے مضبوط ارادے کی مالک ہو کہ آندھیاں اور طوفان بھی اس کے عزائم اور ارادوں کو متزلزل نہ کر سکیں۔

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم

دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

(سوچتی ہوں کیسی شخصیت سازی کی تھی ان بزرگوں نے یوں میری، بالواسطہ طور پر)

ان مشوروں کے مطابق اسی کہانی کو دوبارہ لکھا گیا اور عنوان دیا گیا ''زندگی کی راہگذر پر''

اختتام کو بدلا گیا۔ اس مجموعے کی اشاعت سے پہلے اس کہانی پر نظرِ ثانی کو تو یہ طویل افسانے کی صورت اختیار کر گئی عنوان ''پانی اور چٹان'' رکھا گیا— آخری بار لکھتے وقت ذہن میں ہنری جیمس کا شہرۂ آفاق ناول Protrait of a Lady، تصورِ انسانِ کامل اور رابعہ بصری (سرسید نے ''انجمن خاتونانِ پنجاب کے جلسے میں پیش کردہ تقریر میں کہا تھا'' لیکن تم میں ہزاروں رابعہ بصری موجود ہیں''......!

—یعنی دائرہ جہاں سے شروع ہوتا ہے وہیں پر ختم ہوتا ہے—!

''مٹی کا مادھو'' ۱۹۷۰ء میں لکھی گئی ماہنامہ ''کتاب'' میں شائع ہوئی۔ یہ دستوفسکی کی زندگی کے ایک واقعہ پر مبنی ہے۔ خرید و فروخت کے اس بے ڈھنگے دور میں شاید یہ کہانی ضمیروں کو جھنجھوڑ سکے۔ دستوفسکی بہت بڑا self critic تھا اور یوں بہت بڑا ادیب تھا۔ ''زرد پتے'' ۲۸ سال پہلے لکھی تھی شائع نہیں کرائی۔ یہ ایک اندوہناک واقعے پر مبنی ہے جو کبھی وطن میں پیش آیا تھا روح لرز گئی تھی شاید کسی کی اصلاح کر سکے۔ آج کے معاشرے میں جس میں بیویوں کو مار دینا، زندہ جلا دینا ایک ناقابل سرزا فعل بن چکا ہے، شریف زادوں کے بھیس میں مجرم دندناتے پھرتے ہیں، شاید یہ کہانی درندہ صفت ''شرفاء'' کی غیرت کو جھنجھوڑ سکے، ان کو اپنی اصل کی طرف راغب کر سکے۔ صرف اس غرض سے یہ کہانی شامل کی ہے۔

''بوڑھا برگد'' خونِ جگر سے لکھی گئی ہے۔ ''خونِ جگر جس سے معجزۂ فن کی نمود'' ہوتی ہے۔ یہ ''شب خون'' میں شائع ہوئی۔ علامتی کہانی ہے۔ برگد جدید انسان کی علامت ہے جو تنہا ہے درخت کاٹے جا رہے ہیں، فطرت سے ہمارا رشتہ ٹوٹ رہا ہے۔ یہ کہانی دو یا دو سے زیادہ سطحوں پر پڑھی جا سکتی ہے۔ کسی کو ''معمہ'' بھی لگ سکتی ہے! اس کہانی کی مرکزی شخصیت وہ بچہ ہے جو اپنی تنہائی کا حل درخت اور کہانی میں ڈھونڈتا ہے۔ راقم الحروف کو بچوں سے شدید محبت رہی ہے کہ معصوم اور مخلص ہوتے ہیں، مکمل فرد ہوتے ہیں، شدت سے محسوس کرتے ہیں، دکھی بھی ہوتے ہیں۔

''آئینہ کی تصویر''، ''شب خون'' اور ''شعر و حکمت'' میں شائع ہوئی میرے ایک ''کولیگ'' کو اسے پڑھ کر کافکا کی یاد آئی۔ ''سطور میں افسانوں کا انتخاب کمار پاشی نے شائع کیا جب انھوں نے کسی رسالے میں اس کی اطلاع دی تھی تو میں نے ان کو ایک خط لکھا..... جس میں کچھ یوں

قابلیت جھاڑی کہ وہ قائل ہو گئے اور خط میں لکھا کہ افسانہ بھیجئے۔ مجھے یقین ہو گیا آپ کا خط پڑھ کر کہ یہ افسانے جو آپ نے شائع کرائے ہیں خود آپ نے ہی لکھے ہیں ورنہ میں تو اب تک یہ سمجھتا تھا کہ...... ''میں حیرت زدہ..... یا اللہ لوگوں کو یہ یقین نہیں کہ یہ تحریریں میری ہی ہیں بہر حال ''سطور'' کے انتخاب میں بھی یہ کہانی شائع ہوئی.....! اسے رضوان احمد نے بھی ایک انتخاب میں شامل کیا جو دیونا گری میں تھا۔ چڑیا کا آئینے میں اپنی تصویر دیکھنا اور چونچیں مار مار کر خود کو زخمی کر لینا علامت ہے Cannibalism کی اور بھی بہت کچھ..... انسان اپنی نسل کشی کر رہا ہے، اپنی زندگی کی خود ہی بدصورت بنا رہا ہے..... ویت نام، ہیروشیما، ناگاساکی، عراق، بوسینا، ... عالمی جنگیں، فسادات، مظالم...

ان کہانیوں کے یہ مختصر تجزیے راقم الحروف ترسیل کی خاطر کر رہی ہے کوئی بات جب سمجھ میں نہیں آتی تو ignore کر دی جاتی ہے یا تضحیک کا نشانہ بنتی ہے۔ یہ تجزیے تو روا روی میں کئے گئے ہیں کہ راقم الحروف کم مایہ ہے۔ قارئین، ناقدین اور مبصرین حضرات کہیں زیادہ بہتر تجزیے کر سکتے ہیں، محاسن تلاش کر سکتے ہیں.....!

اس کے بعد ''نرگس کے پھول''، ''الفاظ'' میں شائع ہوئی جسے پاکستان کے کسی رسالے نے بھی میری لاعلمی میں شائع کر دیا۔ انداز اساطیری، علامتی اور شاعرانہ، قدرتی مناظر میں شرکت کی سعی، اشیاء کی شیئیت کو ابھارنے، ان کی گہرائیوں میں شامل ہونے کی کوشش جو ورڈز وتھ اور شیخ اکبر ابن العربی کی خاصیت تھی ــــ خصوصاً وہ سطور جن میں بدلتے ہوئے موسموں کے زیر اثر نیم کے درخت کے مختلف رنگوں کو پیش کیا ہے۔ ذاتی ہوتے ہوئے بھی آفاقی رنگ ہے۔ (Woodnessofwood)

''خالی جھولی'' ماہنامہ ''الفاظ'' میں شائع ہوئی۔ مسلم یونیورسٹی کے اسٹاف کلب میں قاضی عبدالستار نے افسانے پر سمینار کیا اور مجھ سے بھی افسانہ پڑھنے کو کہا۔ دو دن افسانے پڑھے گئے۔ میری ایک شناسا نے مجھ سے کہا کہ چونکہ وہ علی گڑھ سے اسی روز کہیں جا رہی ہیں اور میری کہانی سننے کو بھی بے چین ہیں تو میں اپنی کہانی پہلے ہی دن صبح کے سیشن میں سنا دوں (یعنی نو واردوں کے ساتھ) ان دنوں مجھے یہ قطعاً علم نہیں تھا کہ سمیناروں کے ذریعہ ادیب لوگ establish ہوتے ہیں اور ایک جہاز کی مانند سمندر میں اتارے جاتے ہیں۔ میں سمجھتی تھی کہ سمینار کا مقصد ادبی ذوق کی

ترویج و تفہیم ہے! میں نے اپنی ان ''شناسا'' (جن کو میں دوست اور رفیق سمجھتی تھی)، کی بات کا یقین کر کے اور ان کی ''عقیدت'' اور ''ادبی ذوق'' کو مدنظر رکھ کر اپنی سادہ لوحی اور ''یاں وہی ہے جو اعتبار کیا'' کے زیر اثر پہلے ہی دن صحیح کہانی سنادی (تب تک مجھے ''پیڑھی سسٹم'' سے بھی واقفیت نہیں تھی ''جنرل نالج'' کی کمی کے سبب) لوگ رو دیئے۔ تعریفوں کے پل بندھ گئے..... میرا مقصد روح کے تاروں کو مرتعش کرنا تھا وہ پورا ہوا، اصلاح کرنا تھا، اصلاح کسی کی ہوئی کوئی محروم رہ گیا۔

مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

(شاید سوچی سمجھی اسکیم تھی!) دوسرے دن چند ''کرم فرما مسلح'' ہو کر تشریف لائے اور دل بھر کے میری کہانی کے پرخچے اُڑائے۔ میں بھی سمجھ چکی تھی کہ پہلے ہی سیشن میں مجھے پڑھنے پر مصر کیوں ہو گیا چنانچہ یہ فرض کر کے کہ میری اس کہانی پر کڑے وار ہوں گے دوسرے دن پہلے سے ہی جوابی حملہ کے لئے اسلحہ سے لیس ہو کر گئی۔ جب ایک دو حملے ہو چکے (جن کے پس پردہ مخلص جذبے کے بجائے بغض، عناد حسد اور malice کارفرما تھے) تو میں نے جوابی پرچہ نکالا اور پہونچ گئی ڈائس پر۔ سامنے نظر پڑی تو وہ ''شناسا'' تشریف فرما تھیں جن کو پہلے دن ہی باہر جانا تھا! جو لکھ کر لائی تھی بول دیئے وہ جملے:

''میں اس لئے نہیں لکھتی کہ مجھ کو شہرت ملے، انعامات سے نوازی جاؤں، تعریفیں ہوں جیسا کہ شاید کچھ لوگوں کا خیال ہے، جس خیال کے پیش نظر یہ نکتہ چینیاں کی گئیں۔ نہ شہرت، نہ دولت نہ ایوارڈ۔ بلکہ میں تب لکھتی ہوں جب میں لکھے بغیر رہ نہیں سکتی۔ اپنی بات کہے بغیر گھٹن ہوتی ہے۔ بچپن میں میں نے ایک کہانی ''میراث'' لکھی تھی کیونکہ والدہ کو اپنے جہیز کی تیاری کرتے دیکھ کر دم گھٹتا تھا کہ میرا خیال تھا کہ لڑکی کو شادی کر کے غیروں کے سپرد کر دینا اور پھر لوٹ کر خبر نہ لینا اس کے ساتھ سخت زیادتی ہے وہ جب اشارتاً نہ سمجھیں تو میں نے کہانی لکھ کر سمجھا دیا براہِ راست بات کہنے سے وہ اثر نہیں ہوتا جو کہانی کی صورت بات کہہ کر ہوتا ہے جو نگاہیں فقط ظاہر کو دیکھ کر رائے قائم کرتی ہیں وہ گہرائیوں میں اترنے کی اہل نہیں۔ مقصد اور اصلاح کے تحت لکھتی ہوں بس۔ اس کہانی کے بعد والدہ نے میری شادی کا ارادہ ترک کر دیا۔ شہرت میرا مقصد نہیں ہے اس لئے مجھے نیچا دکھانے کی کوشش فضول ہوگی''۔ یہ سب سن کر ''ناقدین'' پر اوس پڑ گئی۔ اس کے

بعد ایک ''نووارد'' نے چائے کے وقفے میں مجھ سے کہا ''ہم آپ کو آج تک بڑی خاتون سمجھتے تھے لیکن آج اس کا احساس ہوا کہ آپ بہت بڑی خاتون ہیں!'' اتنی دل برداشتہ تھی کہ تعریف سے خوش بھی نہ ہوسکی۔

اس کہانی کے بعد قلم پر پابندی لگنا لازمی تھا چنانچہ اس کے بعد جو کچھ لکھا وہ خون دل میں انگلیاں ڈبو کر لکھا! اس ''سانحے'' کے بعد میں تقریباً ۱۵ سال تک کہانی نہ لکھ سکی! تنقید کا جو روپ میں نے دیکھا، گروہ بندی کا جو نظارہ سامنے آیا اس نے افسانے کے میدان سے بددل کر دیا۔ علم کا گہوارہ اور سازشیں! بے حد تکلیف ہوئی لیکن تخلیق کے دھاروں کا رخ شاعری، تنقید اور انشائیے کی طرف مڑ گیا (کچھ نظمیں تو دورِ طالب علمی میں ہی لکھ چکی تھی۔ جیسے ''راز سربستہ'' جو ورڈز ورتھ سے متاثر ہو کر ایم۔اے میں لکھی اور جسے خلیل الرحمٰن اعظمی نے پسند کیا جس کو ۱۹۶۵ء میں ویمنس کالج میں منعقد کی گئی ''شام غزل'' میں پیش کیا تھا۔ یہ شعری نشست عبداللہ ہال کی طرف سے ہوئی تھی راقم الحروف نیو ہاسٹل کی لٹریری سکریٹری تھی جس کو ممتاز آپا کی سرپرستی حاصل تھی، ممتاز آپا جو ''جوہر'' کی پارکھ تھیں انھوں نے کسی سے کہا بھی تھا کہ ''نجمہ میں mettle ہے'')—

پھر تخلیق ہوئی ''مدر گوڈیس'' (مطبوعہ ''نثری نظم نمبر'' ماہنامہ شاعر) جس کی بہت تعریف و تحسین ہوئی۔ اسے سید حامد کے دور وائس چانسلری میں وائس چانسلری میں وی لاج پر منعقد ہوئی شعری نشست میں پیش کیا، ریڈیو پر بھی اس کی پیشکش ہوئی۔ قرۃ العین حیدر اور سردار جعفری وغیرہ نے اسے ایس۔ این ہال کی شعرہ نشست میں سن کر بہت پسند کیا۔ قرۃ العین حیدر اسے دوبارہ سننے میرے گھر آئیں (نہ جانے کتنی بار ان کا ذکر کر چکے ہیں عقیدت اور محبت کے ساتھ لیکن کیا مجال کہ کبھی ''کارِ جہاں دراز'' میں ہمارا ذکر تو کر دیں) وحید اختر نے بھی اسے بہت سراہا۔ ''شاعر'' کے اسی شمارے میں میرا ایک تنقیدی مضمون بھی شائع ہوا تھا بہ عنوان ''نثری نظم آزادیٔ روح کی ضامن''۔ کسی دل جلے نے اس پر خط کے ذریعہ نکتہ چینی کی اور نظم پر رائے گول کر گئے۔ ادب کے میدان میں اگر جھوٹ در آئے تو وہ بے ادب ہو جاتا ہے یہ چیز compulsive enmity کہلاتی ہے۔ جو لالچ، چمچہ گیری اور گروہ بندی سے وجود میں آتی ہے۔ موصوف کو خیر سے انگریزی ادب میں بھی دخل ہے پوپ کے بڑے قائل ہیں جبکہ آرنلڈ نے

صاف کہہ دیا تھا کہ ''پوپ Poetic Classic'' نہیں ہے!'' خیر چھوڑیے اس قصہ کو'' .....!

بہر حال ''مدر گوڈیس'' بہت پسند کی گئی۔ اس کے بعد آرٹس فیکلٹی کے لکچر تھیئٹر میں ایک مشاعرے میں سنائی ''شجر سایہ دار'' جس کو سن کر صدر مشاعرہ برنی صاحب نے کہا ''مسلم یونیورسٹی میں تین شاعرات قابل ذکر اور اہم ہیں'' ان تین شاعرات میں ایک نام میرا بھی تھا! یہ یقیناً ایک بے حد اہم استناد تھا اس کے کچھ عرصہ بعد انجینئرنگ کالج میں ہوئی ایک شعری نشست جس میں اپنی واحد غزل اور ایک نظم سنائی۔ غزل کا مطلع ہے۔

وجود کے درخت کی گھنیری پتیوں کے درمیان ہوا بھی
فضاؤں کی عمیق وسعتوں کو چیرتی ہوئی صدا بھی

ساتھ ہی اپنا یہ شعر بھی سنایا۔

منظر بہت عجیب تھا ہم کھو کے رہ گئے
دوری پہ آبشار تھا ہم رو کے رہ گئے

سید حامد صاحب نے بعد میں میری ان معمولی کوششوں کو ''پختہ کلام'' کہا۔ دونوں حضرات کی یہ تحسین بے حد قابل قدر محسوس ہوئی۔ خیر یہ سب بسبیل تذکرہ تھا..... کہنا یہ چاہ رہی تھی کہ —

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے
(اقبال)

مقصد یہ سب کہنے کا یہ تھا کہ افسانے کے اس سیمینار میں ہوئی ''تنقید'' یا مخالفت برائے مخالفت سے راقم سطور کو فائدہ ہی ہوا اور چند تحریریں اس نے ایسی شائع کرائیں جن کو استناد ملنا ہی چاہیے مثلاً ''مدر گاڈیس''، ''شجر سایہ دار''، ''پانی کی دیواریں''، ''نئے انسان کا جنم''، ''التماس'' وغیرہ (نظمیں)، ''سید حامد نگار خانۂ رقصاں کی روشنی میں''، ''نثری نظم آزادی روح کی ضامن''، اور ''عالمی فکر میں فیمنزم ورجینیا وولف کے خصوصی حوالے سے'' (تنقیدی مقالات) ''جہاں ہم ہیں'' (ڈرامہ)۔ ان تحریروں کو علم دوستوں نے اکثر سراہا (خلاصہ یہ کہ ناچیز کی مخالفت میں جلد بازی سے کام نہ لیا جائے کہ اسے اس سے فائدہ ہی ہوتا)

ذکر میری کہانی ''خالی جھولی'' کا ہورہا تھا (اتنا طویل digression ضروری تھا)۔ آج کے اس دور میں جب کہ عورت عزت نفس کے تحفظ کی خاطر اقتصادی آزادی اور خود کفیلی کی خواہاں ہے اس کی اس آزادی سے سماج کو کوئی دلچسپی نہیں (یہ بھی تو بینک بیلنس کی حد تک) پیسہ کی خاطر عورت کی سروس کو قابل اعتراض حد تک جلدی قبول کرلیا گیا لیکن اس سے کہیں زیادہ اہم منصب (نئی نسل کی مناسب پرورش) قبول نہیں کیا گیا۔ نتیجہ بچوں کا آیاؤں پر، نوکروں پر چھوڑا جانا، بچوں کی اپنی ماؤں سے خاموش ناراضگی کہ ان کی عزیز ترین ہستی انھیں یوں چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ بچہ یہ سب کیا جانے کہ ماں پیسہ اس کی ہی بہبود کے لئے حاصل کررہی ہے۔ بچہ ایک مکمل فرد ہوتا ہے اس کے محسوسات شدید ہوتے ہیں۔ اس کہانی میں بچہ کا ماں کو نہ پہچاننا علامتی ہے وہ اس ماں کو کیا پہچانے جس کی جھولی میں اس کے لئے کچھ ہے ہی نہیں وہ تو اس مکار آیا کی گود کو زیادہ محفوظ سمجھتا ہے جو دن کے بیشتر حصے میں کم از کم اسے اپنے پاس تو رکھتی ہے۔ ماں کی غیر موجودگی سے پیدا شدہ حزن آمیز خلا کو باپ اپنی شفقت اور محبت سے پُر کرسکتا ہے لیکن وہ روایتی باپ ہے اسے سماج کی اجازت نہیں کہ وہ اتنا ''معمولی'' اور ''نیچے درجے کا'' کام کرے اس کے رویہ میں بے اعتنائی ہے اسے بچے کی پرورش اور اس کو تحفظ دینے میں عار ہے، اسے وہ کسر شان سمجھتا ہے۔ اس کہانی میں اس بچے اور اس کی ماں کے ''ذہنی ماحول'' اور دُکھ کو فضاوہی نفوس سمجھ سکتے اور محسوس کرسکتے ہیں جن کو رحمان الرحیم کی صفت ''رحم'' ودیعت ہوئی ہو، جن کو انسانیت سے محبت ہو، خدا سے محبت ہو جن میں عشق یا Universal Love موجود ہو— جو محبت کے معنی جانتے ہیں..... ''بچے کھلانے'' سے بڑھ کر دنیا کا کوئی کام نہیں (آپ جو حیات ہیں وہ اسی عمل کے ہی تحت ہیں) میری ایک ساتھی جو ادب کی اچھی پارکھ ہیں اور جنھوں نے اکثر میری کہانیوں کو سراہا ہے۔ بولیں ''انجام بہت خوبصورت ہے اور یہی ہوسکتا تھا ورنہ کہانی کہانی نہ رہتی''۔ کسی نے یہ بھی کہا ''انجام بدل دو'' انجام کو بدلا نہیں گیا کہ اصل مقصد روحوں کو جھنجھوڑنا تھا، جگانا تھا۔ یہ بھیڑ دنیا کی بھیڑ ہے جس میں لاکھوں بچے گم ہوتے رہتے ہیں کہ جن شرعاً اور اخلاقاً ان کی دیکھ بھال لازم ہے وہ اس اہم کام میں اپنی بے عزتی محسوس کرتے ہیں (جب کہ وہ نفوس ان کی ہی وجہ سے اس دنیا میں آئے۔ عجیب سی بات لگتی ہے) یہ رویے Anti-social ہیں اور ان کے لئے معاشرے کے منفی ذہنیت رکھنے

والے افراد ذمہ دار ہیں جو کسی شخص کو اس کے بچوں سے ''الرجک'' کریں، اسے ان سے دور کریں کہ اسی میں فائدہ ہے۔ عموماً یہی ہوتا ہے۔ یہ انسان دوستی کے منافی ہے۔ کون ہے اس صورت حال کا ذمہ دار۔ یہ ایک بڑا سوال ہے اور اس کے لئے جو ذمہ دار ہے وہی جواب دہ بھی۔ (Compulsiveenmity) یہ کہانی سماج پر گہرا طنز ہے، اس کے منفی رویوں پر اور ان سے پیدا شدہ المیے۔ تصویر کیجئے دھول میں اٹا ہوا بچہ، ننگے پاؤں، بھیک کا پیالہ ہاتھ میں — شاید یہ کچھ لوگوں کے لئے انکشاف ہو، نئی اور عجیب سی بات لگے، ناچیز سے خفگی کا پہلو نکل آئے، اس بات سے کہ بچہ کی تخلیق کے بعد ماں کا کام ختم، اس کی پرورش، نگہداشت، تعلیم وتربیت سب باپ کے ذمہ، اس پر پیسہ خرچ کرنے، اس کی کفالت کا کام بھی باپ کا ہی ہے (یہ کسی معتبر، مخلص عالم دین نے ناچیز کو بتایا یہ کہہ کر کہ ایسا بڑا سچ ہے جسے سماج میں عام نہیں ہونے دیا جاتا)۔ ہمارے معاشرے میں ہوتا اس کے برعکس ہے یعنی ساری ذمہ داری ماؤں پر اور ان کی سروس کی صورت میں آیاؤں پر۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ''ماتا'' پر فقط ماں کا ہی حق نہ ہو باپ میں بھی یہ صفت ہو یعنی Universal Love اور الوہی صفت۔ رحم..... یوں ہی ہزاروں مائیں تنہا تنہا اپنے جگر کے ٹکڑے کو ڈھونڈتی پھرتی ہیں — کیسی رفاقت ہے، یہ کیسا ساتھ ہے یہ... کون ہے جو hormony نہیں ہونے دیتا anti social elements!

''خالی جھولی'' کے بعد کہانی پندرہ سال تک نہیں لکھی، لیکن شاعری تنقید کے علاوہ چند منفرد اور مختلف چیزیں لکھیں جو انوکھی ہیں اور کسی مروجہ صنف کے خانے میں نہیں رکھی جاسکتیں۔ ان دنوں قرآن شریف کے مختلف تراجم (ترجمان القرآن، ترجمۂ قرآن، عبداللہ یوسف علی کا انگریزی ترجمہ وغیرہ۔) پڑھا کرتی تھی اکثر بچوں کو سناتی۔ بچوں کو Children's Bible بھی سناتی تھی۔ (ٹی وی پر مہابھارت اور رامائن کے سیشن ہوتے تھے) نتیجہ کے طور پر صحائف کی روح، لب ولہجہ اور آہنگ ذہن و دل میں سرایت ہوئے۔ مذہب کی روح، پیغام، عارفانہ پہلو، الوہی روشنی، ساری کائنات وجود مطلق کی روشنی سے معمور! (کہانیاں کہتے رہو تا کہ لوگ کچھ تو سوچ بچار کریں ''قرآن حکیم) ۱۹۸۳ء کے بعد کئی تذکرے لکھے جن میں قابل ذکر ہیں ''ذکر ایک مشعل بہ کف اور قندیل بہ چشم کا'' اور ''نشانات نور'' عارفانہ لمحات کی گرفت، تحقیقی جائزے — ایک قصیدہ،

کمفنی، مصوری اور موسیقی کا نمونہ ایک ذہنی ماحول۔ یعنی مختلف اصناف سخن کا امتزاج۔ امتزاج تصوف کی دین ہے۔ تفریق اور ریزش اخلاقی قدروں کے زوال سے پیدا شدہ تشویشناک صورتحال جس کے تحت ہم حسن کے معنی بھول گئے، مذہب کے معنی بھول گئے، ادب کے معنی بھول گئے، یہ خالص مقصدی تخلیقات ہیں ان کا مقصد زندگی کو اوپر اٹھانا، اسے حسین بنانا ہے یہ تذکرے بہت غور اور توجہ سے پڑھے جائیں۔

۱۹۸۲ء میں ارادہ کیا اپنی مختلف النوع تحریروں کو یکجا کر کے شائع کرانے کا تا کہ بار بار کتاب چھپوانے کے کربناک عمل سے بچ جاؤں۔ وحید اختر سے درخواست کر کے پیش لفظ لکھوایا لیکن کتاب شائع نہیں کرائی پیش لفظ محفوظ رہا۔ جس میں سے کہانیوں کے بارے میں ان کی رائے پیش کر رہی ہوں ان کا مطالعہ اچھا تھا اور وہ اردو کے چند بے خوف ناقدین میں سے تھے:

> ''نجمہ نے ہر طرح کے افسانے لکھے ہیں بچوں کو سلانے والی خواب آور چڑیا چڑے کی کہانی کی تکنیک سے علامتی اسلوب تک اور کردار سازی سے بیانیہ انداز تک سب کچھ ان کے افسانوں میں مل جائے گا۔ ''آئینہ کی تصویر'' لہر لہر سمندر''، ''چیخ کی گونج''، ''خالی جھولی''، ''مٹی کا مادھو''، ''بوڑھا برگد'' میں نیا طرز احساس ہے لیکن رومانیت کی زیریں لہریں سے خالی نہیں۔ ''نرگس کے پھول'' میں وہ زیریں لہر سطح پر آ گئی ہے۔ نجمہ کے افسانوں میں کوئی مسلمہ تصور، کوئی مخصوص تکنیک یا نیا میلان تلاش کرنے کے بجائے زیادہ صحیح رویہ یہ ہوگا کہ ان کو افسانہ سمجھ کر پڑھا جائے۔ افسانے میں افسانویت نہیں تو کچھ بھی نہیں نجمہ کو ہر انداز میں کہانی کہنے کا ڈھنگ آتا ہے اسی لئے توقع کرنا چاہیے کہ وہ افسانے سے اپنی انفرادیت منوالیں گی''۔ (۱۸ر جولائی ۱۹۸۲ء)

نقاد مصنف کی مانند ہوتا ہے اسے بے خوف اور کھرا ہونا چاہیے۔

راقم الحروف خود کو کسی ''پیڑھی'' سے منسلک کرنا پسند نہیں کرتی۔ جو شیلے ناقدین جب دیکھو تب بے قصوروں کو پیڑھیوں میں فٹ کرتے نظر آتے ہیں ساتھ ہی اس عام روش سے بھی کوفت

ہوتی ہے کہ کبھی کوئی تو کبھی کوئی انتہائی جوش وخروش کے ساتھ ادب کے سمندر میں اتارا جارہا ہے (یعنی "launch" کیا جارہا ہے) سمیناروں کا مقصد توسیع علم کے بجائے یہی رہ گیا ہے۔ ۱۹۹۷ء میں کہانی نے پھر اپنی طرف کھینچا اور ''غار'' وجود میں آئی اور ۱۹۹۹ء میں ''وجود کے سوتے سے جدا'' (یہ دونوں کہانیاں ''آجکل'' اور ''شاعر'' میں شائع ہوئیں۔ جبکہ پہلی کہانی ''میراث'' ۱۹۶۲ء میں ''عوامی دور'' میں شائع ہوئی تھی) رضوان احمد نے ''جیوتسنا'' کے نام سے دیوناگری میں اردو افسانوں کا جو انتخاب شائع کیا تھا اس میں میری کہانی ''آئینہ کی تصویر'' شائع کرکے مجھے سلام بن رزاق، شوکت حیات وغیرہ کی پیڑھی سے منسلک کردیا تھا۔ جس سمینار میں ''خالی جھولی'' پڑھی تھی اس میں ''نوواردوں'' کے ساتھ کہانی پڑھی تھی تو سید محمد اشرف کی پیڑھی سے منسلک کی گئی (بلکہ اس سے بھی کاٹ دی گئی تھی جس کی مجھے خوشی ہے) اب ''وجود کے سوتے سے جدا'' اور ''غار'' کی اشاعت کے بعد کس پیڑھی میں شامل کی جاؤں گی واللہ اعلم۔ جبکہ اپنا یہ حال ہے کہ آرزومند ہوں کہ اتنی وسیع وبیکراں ہوجاؤں کہ صدیوں کو سنائی دوں۔ شاید

فیض کا شعر ہے:

اور گونجونگا جو لوٹاؤ گے آواز مری

اتنا پھیلوں گا کہ صدیوں کو سنائی دوں گا

چونکہ انشائیے، خاکے اور تنقیدی مضامین بھی (وقت اور حالات کے تقاضوں کے تحت لکھتی رہی اور انگریزی میں تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ بہ عنوان From the Circle to the Centre اور اپنی انگریزی تحقیق پر مبنی کتاب بہ عنوان "Virginia Woolfs Concept of perfect Man-An-Exploration In Comparative Literature" شائع کی، ساتھ تدریس میں بھی مصروف رہی اسی لئے کہانی پر خصوصی توجہ نہ دے سکی (کہ اس ناچیز کی شخصیت کا فقط ایک پہلو ہے)۔ دوسرے یہ کہ کچھ اس طرف سے ''ادبی سماجیات'' کی وجہ سے بددلی بھی رہی۔ میری کہانیوں کے لئے سناٹا رہا۔ زبانی تعریفیں تو اکثر ہوئیں لیکن تاثرات کو تحریر کا جامہ نہ پہنایا گیا۔ افسانہ نگاروں کی فہرست میں کبھی نام نہ شامل ہوا۔ جیسے مبصرین کسی بات سے خائف ہوں وجہ شاید یہ رہی ہو کہ نہ ہی ''کسی کی آدمی'' ہوں نہ کبھی کسی گروپ میں شامل ہونا پسند کیا کہ یوں انسان تنگ

نظر اور مصلحت پسند ہو جاتا ہے آزاد نہیں رہتا ''جوئے کم آب'' کے مثل ہو جاتا ہے۔ بہت کم لکھ پاتی ہوں اس سے بھی کم شائع کراتی ہوں (شائع کروانا ویسے ہی جوئے شیر لانا ہے) فرصت عنقا۔ درس وتدریس ذریعہ مُعاش جسے انتہائی ایمانداری سے انجام دیتی ہوں یہ محبوب مشغلہ بھی ہے۔ جو بات کہنا ہوتی ہے نئی نسل سے کہتی ہوں اصلاح کو مدنظر رکھ کر، اقدار کو پیش نظر رکھ کر۔ یوں شخصیت سازی کرتی ہوں کہ علم وادب کا بنیادی مقصد یہی ہے۔ لیکن کم لکھنا اور کم چھپوانا کوئی عیب تو نہیں۔ آرنلڈ نے کہا تھا کہ ورڈزورتھ کی چھ عدد بہترین نظمیں ہی اسے زندۂ جاوید رکھنے کو کافی ہوتیں۔ (ویسے بھی میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر اردو کے ادیب بے تحاشا تحریریں کرانے کے بجائے اردو کی تدریس کے لئے اپنے اپنے گھروں میں سبھی اردو ٹیچنگ سینٹر کھول لیں تو اس بے چاری زبان کو یقیناً بہت زیادہ فائدہ ہو۔ سمینار تو فوراً بند ہونا چاہئیں..... اور ''بریانی زدہ ڈنر'' بھی)

اپنی ان ناچیز تخلیقات کے سلسلے میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ ان کے پیچھے فقط خلوص ہے۔ یہ حق کی تلاش ہیں، خود اپنی تلاش ہیں، یہ سچی ہیں۔ چونکہ ترقی پسند اور ''جدیدیت'' کی درمیانی چیز ہوتی ہیں اسی لئے دونوں طرف عموماً ان سے بے رخی برتی گئی (کہ ہم متوازن راہ کے متلاشی تھے) جبکہ یہ صحیح معنوں میں ترقی پسند اور جدید ہیں، کیونکہ ان کا رشتہ قدیم سے بہت گہرا ہے ان میں اساطیر بھی ہیں مذہب بھی، اخلاق بھی ہے تصوف بھی، فلسفہ بھی ہے اور ماقبل تاریخ بھی۔ اپنی تحریروں کا (اور یوں خود اپنا کہ تخلیق اور خالق ناقابل تقسیم ہوتے ہیں) تعارف کرانے کی، اور وہ بھی اتنا تفصیلی، ضرورت یوں پیش آئی کہ ان سے ابھی کوئی واقف نہیں ہے اور ''نووارد'' کو اپنا "introduction" تو دینا ہی پڑتا ہے جسے انتہائی sportingly دینے کی کوشش راقم الحروف کر رہی ہے۔

حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اتنا لمبا سفر طے کرنے کے بعد بھی میرے قلم کو ''نووارد'' کی طرح تعارف دینا پڑ رہا ہے.....!

کافی عرصہ ہوا رضوان احمد نے دیوناگری میں افسانوں کا جو انتخاب شائع کیا تھا اس میں میری کہانی بھی چھاپی تھی (''آئینہ کی تصویر'' جو ''شب خون'' میں شائع ہو کر سناٹے کی صورت خراجِ تحسین حاصل کر چکی تھی) افسانے کی فرمائش کے لئے انھوں نے ۱۹۷۸ء میں جو خط لکھا تھا اس کا ایک جملہ ہے: ''آپ کے جو افسانے میں نے پڑھے ہیں وہ بیحد پسند آئے ایسا محسوس ہوا

کہ آپ کی اپنی انفرادیت ہے'' اس انتخاب کے پیش لفظ میں افغان اللہ بڑی صفائی سے میری کہانی کے بارے میں اپنی رائے اڑا گئے بہر حال رضوان صاحب کی مشکور ہوں ادھر کہانی بھیجنے کے لئے وہ میرے مشکور ہوں گے!

میرے یہ سب کہنے کا مقصد فقط یہ ہے کہ ہمیں کوئی معیار بنانا ہوگا فرنچ اکاڈمی جیسی کوئی اکاڈمی جس میں فقط دوستی یا تعلقات کی بنا پر کسی کو استناد نہ دلایا جا سکے ہمیں تنقید کو اقدار پر مبنی تو کرنا ہی ہوگا ورنہ ہمارے وجود کی پہچان کیا ہوگی۔

دراصل راقم سطور کا مقصد شہرت کا حصول ہے ہی نہیں۔ کبھی کوشش ہی نہ کی کہ نام ہو، زکر آئے۔ ایک بار جنرل ایجوکیشن سینٹر کے اس زمانے کے ڈائرکٹر نے مجھ سے کہا کہ ''ہم آپ کے ساتھ ایک شام منانا چاہتے ہیں''۔ مجھے ہنسی آگئی۔ ''میرے ساتھ؟ ایک شام؟ یہ میرے لئے یقیناً شرمساری کی بات ہوگی میری بساط کیا؟ وہ صوفی منش صاحب قائل تو تھے ہی اور زیادہ قائل ہو گئے۔ جس مقصد کے لئے لکھتی ہوں وہ پورا ہو جاتا ہے یعنی اظہار ذات اور یوں اصلاح۔ جن کی اصلاح کے لئے لکھتی ہوں مکمل اصلاح کے بعد ہی ان کی قلب ماہیت ہوگی ان میں صفائے قلب پیدا ہوگا کہ وہ ناچیز کی تحریروں پر رائے دینے کے اہل ہو سکیں گے، تعریف کر سکیں گے کہ اب ہم اتنے بھی بے نیاز، قلندرانہ ''سوپر ہیومن'' نہیں کہ تعریف کی آرزو ہی نہ ہو۔ ورجنیا وولف (جس نے انسان کامل کا تصور اپنے ناولوں اور صوفی تحریروں میں پیش کیا تھا) کہتی ہے:

"We praise ourselves while wo praise others"

جب دلوں میں کشادگی پیدا ہوگی، ایمان جاگے گا تو میری روح کی آواز ان تک ضرور پہونچے گی۔ اگر شہرت حاصل کرنے کی کوشش کرتی، اندیشۂ سود وزیاں میں مبتلا رہتی، مصلحت اندیشیاں کرتی، گروہ بندی میں وقت ضائع کرتی، بیویوں کی روحوں کو زخمی کر کے ان کے شوہروں سے فائدے حاصل کرتی، اپنی ہم جنسوں کے دکھوں میں شرکت کے بجائے ان کی جڑیں کاٹتی، اور یوں اپنی عزت نفس کو مجروح کرتی تو کب کی اردو ادب کے اس بحر بے کنار میں "launch" کی جا چکی ہوتی لیکن میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ اگر یہ سب کرتی تو پھر اپنے علم کو گہرا اور وسیع کیسے کرتی، پہونچتی کیسے وہاں تک جہاں تک کم پہونچ پاتے ہیں (یہ snobbery نہیں ہے self-esteem

اور خودشناسی ہے)

اپنی integrity کا تحفظ اگر جی جان سے نہ کرتی، عزت نفس کی حفاظت نہ کرتی تو وہ دائروی (circular) وژن کہاں سے لاتی جس سے کوئی تحریر عظیم اور کریم النفس (maganimous) بن پاتی ہے۔ جس سے وہ تخلیقات جنم لیتی ہیں جن کے عنوان ہوتے ہیں ''ذکر ایک مشعل بہ کف اور قندیل بہ چشم کا''، ''نشانات نور''، ''وجود کے سوتے سے جدا، ''غار''، ''آئینہ کی تصویر''، ''بوڑھا برگد''، ''مدر گوڈلیس''، ''شجر سایہ دار''، ''خالی جھولی''، ''نئے انسان کا جنم''، ''پانی اور چٹان'' اور وہ واحد غزل جس کا پہلا شعر ہے۔

وجود کے درخت کی گھنیری پتیوں کے درمیان ہوا بھی
فضاؤں کی عمیق وسعتوں کو چیرتی ہوئی صدا بھی

یہ کہ میں ایک Visionary ہوں یہ بات میں جانتی ہوں یا میرا خدا، وجود مطلق جس نے مجھے perennial wisdom عطا کی ہے جس کے ذریعہ وجود کے قدیم ترین سرچشموں تک رسائی ممکن ہوتی ہے — ''صوفی''، ''قلندر'' ..... ''افتخار کائنات'' وغیرہ جیسے الفاظ بھی میرے لئے استعمال کئے گئے وہ نفوس جنھوں نے یہ Complements دیئے یقیناً ان کی اپنی ذات بھی ان صفات سے مزین رہی ہوگی، ان کا علم یقیناً گہرا ہوگا ورنہ ہمہ شمہ تو کسی کے پاس وقت کہاں کہ گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کرے — کسی سے توقع بھی نہیں کہ صارفیت کا دور ہے۔ ہاں گذارش اس بات کی بے شک ہے کہ سطحی رائے نہ دی جائے اس سلسلہ میں راقم سطور ہی کی ایک نظم ہے:

بہت آسان نظر آیا
ہمیں اس روز اپنا پانیوں پر تیرتے رہنا
کسی نے جب کہا
گہرائیوں میں ڈوب کر دیکھو کہ اندر کیا ہے۔
تو ہم ڈر کر سمندر کے
کنارے کی طرف لپکے..... (''گہرائیوں کا خوف'')

ایک اور گذارش ہے کہ اس حقیر فقیر کے نام کو (جو کہ ''گمنام'' ہے) ہرگز'' کیش ، یا استعمال نہ کیا جائے۔

قصہ مختصر یہ (جب کہ قصہ انتہائی طویل ہو چکا ہے) کہ معذرت خواہ ہوں قارئین سے اس کتاب کی اشاعت کے لئے اور یوں ہی اس کا جواز پیش کر رہی ہوں (کاش بہت سے دوسرے بھی اپنی تحریروں کا یونہی جواز پیش کرتے شرمندہ ہو ہو کر) کہنا یہ ہے کہ لکھے بغیر نہیں رہ سکتی تھی زبانی اصلاح نہ کر پائی کہانی لکھ دی تا کہ ''لوگ کچھ تو غور وفکر کریں'' نصیحت زہر لگتی ہے اور کہانی کے ذریعہ وہی بات روح کو مرتعش کرتی ہے، دل میں اتر جاتی ہے اور جو کچھ لکھ رہی ہوں وہ بھی میرے قلم کے سفر کی کہانی ہی ہے۔ ''غار'' اور'' وجود کے سوتے سے جدا'' میری تازہ ترین کہانیاں ہیں جو شائع ہو چکی ہیں ('' آجکل'' اور'' شاعر'' میں)۔ ''غار'' آل انڈیا ریڈیو پر نشر ہوئی ساتھ میں مذاکرہ بھی تھا جس میں خاصی سنجیدگی سے اس کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا۔'' غار'' کی اشاعت کے بعد'' آجکل'' کے اگلے دو شمارے بغور دیکھے کہ شاید کسی نے ایک جملہ ہی لکھا ہو۔اب دیکھئے یہ جملہ'' کہتی ہے خلق خدا'' والے صفحہ پر۔'' شمارے میں'' کار جہاں دراز ہے'' کے علاوہ تمام مقالات قابل مطالعہ ہیں''۔ خالص'' سیاسی'' اور متعصبانہ جملہ ہے۔ خط کہہ کر لکھوایا گیا ہے۔ جو خوشی ہوتی ہے کہ کچھ لوگ ہمارے وجود سے لرزہ براندام ہیں کیونکہ ان کی اپنی تحریروں میں خلوص کی کمی یا فقدان ان کی وجہ سے جان نہیں ہم ان کے لئے ایک threat ہیں۔ خدا کرے ہم دین کو خود میں اتارنے کے اہل ہو سکیں۔ ''جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی'' —یوں ہی جو اگر دین ادب سے جدا ہو تو بھی فقط چنگیزی رہ جاتی ہے۔ قارئین سے گزارش ہے کہ تعصب اور مصلحت پسندی کی عینک اتار کر ان کہانیوں کو خصوصی توجہ سے پڑھیں کہ ان میں علم کی تقطیر اور انجذاب ہے۔ کچھ کرم فرماؤں سے یہ بھی کہنا ہے کہ ادب کے میدان کو'' گلا کاٹو مقابلے'' کا اکھاڑہ نہ بنائیں — کہ ادب کا مقصد بہت اعلیٰ وارفع ہے، اس کا مقصد زندگی کو اوپر اٹھانا ہے اسے سنوارنا ہے —Vision، معرفت، نیکی... ہے کاش ہم سمجھیں کہ دو فنکار ایک دوسرے کے حریف نہیں حلیف ہوا کرتے ہیں۔

میری کہانی ''غار'' کی اشاعت ماہنامہ'' آجکل'' کے دسمبر ۱۹۹۹ء کے شمارے میں ہوئی

تھی۔ مارچ ۲۰۰۰ء کے ''آجکل'' میں ایک ''شناسا'' کا خط شائع ہوا جس میں انھوں نے قرۃ العین حیدر کے ناول ''کارِ جہاں دراز ہے'' کی خوبیوں کو بجا طور پر اجاگر کیا ہے جو کہ ''دلچسپ ہونے کے ساتھ فکر انگیز اور مطالعہ خیز'' بھی ہے۔ وہ یہ باور کرانا چاہتی تھیں کہ ''آجکل'' کے بیشتر افسانے افسانویت سے عاری ہوتے ہیں اور ان کی حیثیت اخباری رپورٹ یا ''چیستاں'' جیسی ہوتی ہے اور یہ کہ ایسے افسانہ نگاروں کو ''محترمہ حیدر سے سبق'' لینا چاہیئے۔ یہ سب لکھنے کے بعد موصوفہ نے ''میں'' کو اجاگر کرنے کے لئے قرۃ العین حیدر کے ایک فقرے ''اعلیٰ درجہ کا فائیواسٹار میراثی'' پر اپنی ''آگ کا دریا'' یا ملفوظات حاجی بابا بیگتاشی'' اور اسی طرح کی ان کی دیگر تحریروں کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ بلاوجہ وہ ہم جیسے کم مایہ متنفسوں کا (جو کہ ''کریہہ'' علامات اور استعارے استعمال کر رہے ہیں) قرۃ العین جیسی نبوغی ادیبہ کے ساتھ بالواسطہ ذکر کر بیٹھیں۔ ان کا خیال ہماری کہانی پڑھ کر آیا ہی کیوں؟ کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگوا تیلی۔ لیکن صدمہ یہ ہے کہ وہ راجہ بھوج کی گہرائیوں میں اتر نہیں سکیں جو ہنوز کسی بہت بڑے Visionary نقاد کی منتظر ہیں— مکتوب نگار نے لکھتے وقت جوش کی فراوانی میں یہ بھی نہ سوچا کہ فقط بول چال ہی میں لفظ 'یار'، '''کریہہ'' اور سوقیانہ تصور کیا جاتا ہے نہ کہ ادبی تحریر میں اس کا استعمال—! (دورِ طالب علمی میں ان سے اپنی خوش گپیاں ہم ابھی بھولے نہیں ہے۔ ہمیں ان کا sense of humour تب بہت پسند تھا..... اب آگے—

میرے ایک 'کولیگ' ڈاکٹر محمد ثناء اللہ ندوی جو مسلم یونیورسٹی میں عربی کے استاد ہیں اور تحقیقی ذہن کے مالک ہیں، ادب کے انتہائی مخلص قاری ہیں اور کم عمری کے باوجود گہرے اور دائروی علم کی روشنی سے معمور ہیں) نے ''غار'' کی تعریف مجھ سے کی جو کہ (''آجکل'' کے علاوہ) ویمنس کالج میگزین میں بھی شائع ہو کر قارئین سے خراجِ تحسین وصول کر چکی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ اپنی رائے لکھ کر مجھے دے دیں چنانچہ انھوں نے مندرجہ ذیل سطور مجھ کو لکھ کر دیں اور کہا کہ میں انھیں جس طرح چاہوں شائع کرا سکتی ہوں۔ تحریر پڑھ کر راقم الحروف حیران بھی ہوئی اور خوش بھی کہ اب اپنی ہی کہانی پہلے سے بہتر طور سے سمجھ میں آ رہی تھی!— لکھتے ہیں:

''ایک ماہر فنکار کا حساس ذہن رازِ حیات کی سربستگی سے اس طرح پردہ اٹھاتا ہے کہ تخلیق کا گمان

ہوتا ہے۔ ایسی ہی تخلیق ہمیں جمالیاتی حظ فراہم کرتی ہے۔ اسی جمالیاتی حظ کو ارسطو نے 'کتھارسس' کہا تھا۔ ایک فن کار جب اپنے گردوپیش کے قدرتی مناظر کی ترنگوں کو اپنے وجود کے نہاں خانوں میں محسوس کرتا ہے تو اس کا تخلیقی ذہن ان ترنگوں کی 'تفہیم النفس' کے علاوہ آفاق اور تاریخ کے حوالے سے کرتا ہے۔ اس تفہیم کو اگر زبان کے قالب میں ڈھال دیا جائے تو جادوئی رنگوں میں تاریخی وانسانی آہنگ ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتا ہے جس سے باذوق قاری محظوظ ہی نہیں مستفید بھی ہوتا ہے۔

پروفیسر نجمہ محمود ایک حساس اور تخلیقی سرچشمہ سے معمور دانشور ہیں۔ ان کی دانشوری جب تخلیقی آہنگ میں اپنے آپ کو ڈھالتی ہے تو الفاظ اور جملوں کے سانچے میں انفس وآفاق کی آگہی ڈھل جاتی ہے۔ یہ آگہی زبان، مکان، زبان مذہب کی پابندیوں کی حدبندیوں سے دور ایک خالص انسان اور صوفی یا غنوصی وسیع المشربی کی ترجمان ہے جو حقیقت کو مختلف ناموں سے یاد کرتی ہے۔ جیسے 'ایزیس' (Isis)، 'ہرنیہ گربھ'، 'لوغوس' (Logos) کرشنا یا تاریخ اسلام اور تصوف کے حوالے سے 'نورِ محمد' تک۔ پروفیسر نجمہ محمود توحید ابراہیمی کے، 'نورِ محمدی' کے الٰہیاتی اور دینیاتی تفاعلات سے بخوبی واقف ہیں جن کو تاریخ کے نادان ہاتھوں نے مختلف اقانیم میں انتہائی بھونڈے انداز سے بانٹ دیا تھا اسی لئے 'نورِ محمدی' کی کرنوں کا رقص بیخودی ہر ذرّہ، ہر سبزہ اور ہر 'غار'، میں نظر آتا ہے۔ اس طرح 'غار' ایک فکر انگیز تخلیق بن جاتی ہے۔ افسانہ نگار نے شب وروز کی زمینی سچائیوں کو بطور خاص ہندوستان کے فرقہ وارانہ سیاسی پس منظر کے حوالے سے اس طرح اجاگر کیا ہے کہ حساس ذہن زخمی تو ضرور ہوجاتا ہے مگر افسانہ نگار کا حال بقول خلیل جبران کے اس عظیم انسان کی طرح ہے 'جس کے دو دل ہوتے ہیں ایک سے لہو ٹپکتا ہے، دوسرا صبر کرتا ہے'۔

پروفیسر نجمہ محمود نے ہندوستان کے پس منظر میں الفاظ کا ایسا رمزیاتی استعمال کیا ہے کہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ گنگا، جمنا، سرسوتی جیسی قدرتی ندیوں کے ساتھ میرٹھ، ملیانہ، بھاگلپور، بمبئی جیسی کشت وخون کی ندیوں کو تمثیلی جگہ دینا ان کی ہی فنکاری کا حصہ ہے'۔

ڈاکٹر محمد ثناء اللہ ندوی
لکچرر، شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

آپ ہی، کہ اَنا، حسد اور تعصب سے بالاتر ہیں، خونِ دل سے لکھی گئی ان تحریروں کو سمجھ کر ان پر رائے دیں گے کہ آپ سچ کے امیں ہیں۔ خدا کی بارگاہ میں صدق دل سے دعا گو ہوں کہ وہ اس مسموم ماحول کو سازگار کرے کہ ذہن و دل نورِ ایمانی سے منور ہوا ٹھیں، اَنا اور غرور سے نجات حاصل کر سکیں۔ اس anguish کا احساس کر سکیں جو مجھ جیسے حساس متنفسوں میں حالات کے زیر اثر پیدا ہوتی ہے جن کے دل سے لہو ٹپکتا ہے اور جو صبر کرتے ہیں!

خود اپنی ہی تحریروں کے بارے میں، اور یوں اپنی ذات کے بارے میں لکھنے کا جواز یہ ہے کہ ان کو قابلِ اعتناء نہ سمجھا گیا (غیر صحت مند ادبی سیاست، ''ادبی ساجیات'' اور مصلحت اندیشوں کی وجہ سے) اور راقم سطور کی بچپن سے یہ روش رہی ہے کہ جس شے یا ہستی کو قابلِ توجہ نہیں سمجھا جاتا (لیکن جس میں جوہر ہوتا ہے) پرزور طریقے سے اس کی حمایت کرتی ہے، وکالت کرتی ہے کہ اسے مظلوموں اور بے سائبان ہستیوں سے گہری اور مخلص ہمدردی ہے اور اس کے لئے اس کی اپنی تخلیقات یقیناً ایسی ہستی کا درجہ رکھتی ہیں کہ زندہ و تابندہ ہیں، روشن لمحوں سے معمور ہیں جن کی پلکوں تک آئے آنسو اس نے دیکھے ہیں — محرومی کے آنسو، ناقدری کے آنسو... کسی دوسرے کو کیا غرض پڑی تھی (کہ فرصت عنقا ہے) جو ان تحریروں کے بارے میں اتنی محبت، ہمدردی اور عرق ریزی کے ساتھ کچھ لکھتا۔ کسی سے توقع بھی کیوں ہو اور لکھا بھی کیوں جائے کسی بھی تحریر کے بارے میں کچھ بھی — ادبی تخلیقات کو فقط پڑھا جائے، حسبِ توفیق ان سے روشنی حاصل کی جائے، اتنا ہی کافی ہے..... تنقید نگاروں کی جب ریل پیل ہو جاتی ہے، بہتات ہو جاتی ہے تو بڑا ادب تخلیق ہونا مشکل ہو جاتا ہے، کریم النفس (Magnanimous) تحریریں عنقا ہو جاتی ہیں۔ اردو ادب کے اس لق و دق صحرائی میدان میں ''حشرات الارض'' کی طرح ناقدین بکھرے پڑے ہیں ان میں سے بیشتر فضول میں ہی قلم گھسے چلے جا رہے ہیں، کسی کی ٹانگ گھسیٹ رہے ہیں کسی کو جھنڈے پر چڑھا رہے ہیں، سمندروں میں اتار رہے ہیں — چودھراہٹ — اور اسی لئے کوئی بہت قدر آور ادیب — جبران یا اقبال کے رتبے کا نظر نہیں آ رہا۔

کیا ضروری ہے کہ ہم کسی کو اپنے بارے میں کچھ لکھنے کے اہل سمجھیں — فضول لکھنے سے نہ لکھنا اچھا — اسی لئے اب ہم اپنے بارے میں خود لکھ رہے ہیں۔ یقین ہے کہ ہم بھی شاید خود اپنے

اندرون کے سمندروں اور غاروں تک رسائی حاصل نہ کرسکیں کہ ..... ''گہرا ہے مرے بحر خیالات کا پانی''___ کہ شخصیت ایک لہر بھی ہے اور سمندر بھی___ کہ شخصیت، خواہ وہ کسی کی ہو اس کے بارے میں گہرائی سے لکھنا جوئے شیر لانا ہے یوں ہی جیسے سمندر میں اندرون تک پہونچنا۔

اسلامی ممالک میں (خصوصاً سعودی عرب) اگر کوئی خاتون اپنے نام کے آگے مردانہ نام استعمال کرتی ہے تو پوچھا جاتا ہے ''کیا یہ آپ کے والد ہیں؟''___ خیال رہے کہ اسلام نے عورت کی عزتِ نفس کے تحفظ اسے اس کا اپنا نام دیا ہے (بی بی مریم، بی بی عائشہ، بی بی فاطمہ وغیرہ) چنانچہ کسی کے بھی نام کے اضافے کی چنداں ضرورت نہیں ہے___ ویسے یہ نام کا قضیہ بھی خوب ہے۔ شیکسپیئر نے کہا ہے ''نام میں کیا رکھا ہے'' جس کا مطلب یہ بھی نکالا جاسکتا ہے کہ نام یا شہرہ کرنے سے کیا حاصل۔ کام کرو کہ وہی اصل چیز ہے۔

ذکر شہرت، نام یا ''شہرے'' کا ہو رہا تھا۔ بات کہاں سے کہاں نکل آئی۔ جہاں تک چاہو پہونچا دو___ رزمیاتی اور انشائیاتی خصوصیت ہے___ زندگی میں آنسو اور مسکراہٹیں اتنی ملی جلی ہوتی ہیں کہ دونوں کو الگ الگ کرنا محال ہوتا ہے___ یوں ہی راقم سطور کی تحریر میں مزاح اور اداسی کا امتزاج امید ہے گراں نہ گزرے گا۔ غم اور حزن والم سے پیدا شدہ ذہنی تناؤ اور کرب ایک مزاحیہ جملے سے کم ہو جاتا ہے، ہلکا ہو جاتا ہے، زندگی جینے کے قابل اور خوبصورت لگنے لگتی ہے۔ ایسی کسی بھی تحریر سے مجھے الجھن ہوتی ہے جس کو پڑھ کر کم از کم تین دن تک ذہن سخت تناؤ میں رہے___ شیکسپیئر کے المیوں میں comic relief کا یہی جواز ہے۔ رُلانے کے بعد ہنسانا وہ انسانی فرض سمجھتا ہے اور وہ حق بہ جانب ہے۔

بات اردو ادب کی ہو رہی تھی۔ اس بے چارے ادب (اور زبان) کی ''خدمت'' بڑے زور شور سے ہو رہی ہے اردو بے چاری سے مخلص فقط چند گنے چنے___ دوست نوازیاں، مصلحت اندیشیاں، جھوٹ، فریب، مکاری، ریاکاری، پشت پر چھریاں مارنے کی روش اور پرائی چیز پر قبضۂ غاصبانہ، اسے اپنی جاگیر سمجھنا، یہ ہے اردو ادب کا جدید ترین منظر نامہ (چند نفوس کو چھوڑ کر جو بے چارے حیرت بدنداں اور دم بخور ہیں)۔ اس حسین اور عظیم زبان وادب سے اتنی ''الرجی''، اتنی نفرت اور پرخاش کیوں، وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ کاش کہ ایسا ہو کہ ناقدین، مبصرین اور مدیران

میں کریم النفس مردانہ جوہر یعنی ہمت اور بے خوفی پیدا ہو اور وہ وسیع النظری اور وسیع القلبی کے ساتھ، دوست نوازیوں اور مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر) حق داروں کو ان کا حق دلائیں، ہٹ دھرمی، فریب اور مصلحت اندیشی کرنے والوں سے مورچے لیں، بامعنی مذاکرے اور مباحثے کریں (مباحثے جو حق کی تلاش ہوا کرتے ہیں جُہلاء جنھیں غلط معانی پہناتے ہیں) — کہ ان کے ہاتھوں میں انصاف کی ترازو ہے کہ اگر انصاف نہ ملا تو وہ مخلص بندگان خدا بددل ہو کر اس آفت کی ماری زبان میں لکھنا ہی کہیں بند نہ کردیں جسے اس کے اپنے ہی زخمی کر چکے ہیں، جس زبان میں لکھنا ہی ''بے شکریہ'' عمل ہے اس صورت میں ان ''حق داروں'' کا کم اور اُردو زبان وادب اور بنی نوع انسان کا کہیں زیادہ نقصان ہوگا کہ بڑا ادیب وقت کے دھاروں کا رخ بدل سکتا ہے۔

مصنف صاحبان بُرے چاہے بن جائیں (اچھے بن کر ملا بھی کیا ہم جیسوں کی دل شکنی)، مضحکہ چاہے اڑے پرواہ نہ کریں جبیں پر شکن نہ آئے (خود پر اعتماد ہی اتنا ہو، شخصیت میں عظمت، برگزیدگی، توازن اور حُسن اتنا ہو کہ —

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

اور

برتر از اندیشۂ سود وزیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

کے مصداق حق کی خاطر بڑے سے بڑے خطرے کا سامنا کرنے کا دم خم ہو — جرأت ہی تو ساری نیکیوں کی ماں ہے، سرچشمہ ہے۔

ادب کا مقصد انتہائی عظیم ہے۔ یہ سارے علم کی روح ہے، زندگی کی تشریح ہے۔ اس کا مقصد سستی شہرت کا حصول اور ہوس بھی نہیں۔ ہوس زندگی کو بدصورت بنادیتی ہے — جن کے مقاصد بلند ہوتے ہیں، جن کی نگاہ آسمان کی رفعتوں پر رہتی ہے وہ خاموشی سے خلوص سے کام کرتے ہیں، نمائش اور نام ونمود سے دور رہتے ہیں۔ خودنمائی اور شہرت کی خواہش، عدم تحفظ، خود اعتمادی کی کمی یا فقدان اور یوں شخصیت کی کمزوری کی دلیل ہے۔ جب کوئی خود اپنے ہی نام کو

استعمال کرتا ہے، اس کو 'کیش' کرتا ہے (اور ساتھ ہی بہت سے دوسرے بے ضمیر لوگ انتہائی بے حیائی، بے غیرتی اور بے رحمی سے اس شخص کے نام کو استعمال کرتے ہیں اور فائدے اٹھاتے ہیں، (لالچ، خوشامد اور جھوٹ کی روش اپنا کر) تو دراصل وہ شخص خود اپنے آپ کو ذلیل وخوار اور رسوا کرتا ہے، اپنی شخصیت کو سوخت کرتا ہے، اپنی روح کو موت سے ہم کنار کرتا ہے اور وہ ''دوسرے'' بھی خود اپنے آپ کو اور اس شخص کو ذلیل کرتے ہیں، اپنی عزت نفس کا سودا کرتے ہیں!

مقصد یہ سب کہنے کا یہ ہے کہ اس مجموعے کے ذریعے اُردو ادب کے سمندر میں اترنے (یا بزبان انگریزی 'launch' ہونے) کا کوئی ارادہ راقم الحروف کا نہیں ہے اس کی تو فقط یہ خواہش ہے کہ آپ اس کا مافی الضمیر سمجھیں، کہ آپ اس کے اندرونی محسوسات کے خلوص پر یقین کریں ..... اور اس موجودہ زوال پذیر سماج کو بدل ڈالیں، انقلاب لائیں، وقت کے دھاروں کا رُخ موڑ دیں، ایک خوبصورت، صحتمند معاشرے کی تشکیل کریں جس کی بنیاد اعلیٰ انسانی اقدار پر ہو، جس میں مجرم دندنات نہ پھریں، ایسا معاشرہ جس میں ظلم، بے ایمانی، اور ناانصافی نیست و نابود ہو جائیں جس میں ہم جیسے مخلص، نیک اور ایماندار لوگ عزت سے جی سکیں، ہمارے وجود سے لہو نہ ٹپکے، جس میں حق داروں کو ان کا حق ملے، ان کی جڑیں نہ کاٹی جائیں، جس میں بے رحمی، دھاندلی اور سفا کی کا دور دورہ نہ ہو.....!

اور ــــ راقم الحروف یہ وعدہ کرتی ہے کہ ایک مثالی معاشرہ اگر آپ نے قائم کر دیا تو وہ قلم رکھ دے گی اور فقط ایک گوشۂ تنہائی میں، ایک چھوٹے سے حجرے میں، جس کے چہار سو پھول کھلتے ہوں، پہاڑیاں ہوں، جھرنے بہتے ہوں، طیور چہچہاتے ہوں، ہوائیں گیت گاتی ہوں، وہ انتہائی مسرور و شاداں، مطمئن اور پرسکون ہو گی اور کوئی اس کا نام بھی نہ جانتا ہو گا یوں کہ وہ گمنام ہی رہنا چاہتی ہے اور ــــ حجاب میں.....!

○

سید حامد کہ گم اس میں ہیں آفاق

نجمہ محمود

غالب، اقبال اور فیض وغیرہ نے اردو کی ادبی تحریروں کو بہترین عنوانات سے مزین کیا ہے
چنانچہ.........

سید حامد
کہ گم اس میں آفاق

چونکہ اس تصنیف کی نوعیت بہ ظاہر تحقیقی ہے اس لئے لازمی ہے کہ لفظ 'تحقیق' کی تشریح کی جائے کہ آج کے اس دور میں جہاں اور بہت سے دوسرے الفاظ نے اپنے معنی کھودئے ہیں وہاں یہ لفظ بھی اپنے اصل معنی سے محروم ہوگیا ہے .... (چونکہ ادب کو خانوں میں تقسیم کرنے کے خلاف ہوں اس لئے یہ بتادوں کہ یہ ایک تخلیقی (شاعرانہ) وتنقیدی تحقیق ہے....... ایک زندگی کی تشریح....... ایک تفسیر حیات!)

تحقیق میکانکی عمل نہیں اس کے سرچشمے اندرون سے پھوٹتے ہیں یہ ایک فطری جذبہ ہے جس کے پس پردہ جستجو ہے، ''بے زنجیر جستجو'' (سید حامد کی ایک خوبصورت ترکیب)....... ایک روشن خیال، اندرونی اپج، تخلیقی عمل .... گہرائیوں میں اتر کر وہ موتی نکالنے کی کوشش جن تک کسی کی رسائی نہ ہوسکی، ان مناظر کو کھوج نکالنے کی آرزو جن پر کسی کی نظر نہیں پڑی.......

Full many a gem of purest ray serene,
The dark unfathomed caves of ocean bear,
(Thomas Gray)

(سیکڑوں گہر آبدار سمندر کے عمیق ترین غاروں میں پنہاں)

تحقیق یا ریسرچ (Re-search) کے پیچھے سربستہ وہ جذبہ ہے جس کے تحت دنیا کی عظیم تحقیقات وجود میں آئیں (یہی جذبہ عظیم تخلیقات کے پس پردہ بھی کارفرما رہا ہے.......) یوں تحقیق وتخلیق اور تنقید کا مسلک ومنبع ایک ہی ہے....... چیزوں کی اصل کی جستجو، شے کی حقیقت کو دیکھنے کی آرزو، اس کی جڑوں تک پہنچنے کی سعی۔ تحقیق اتنا ہی مشکل عمل ہے جتنا سمندر کے اتھاہ پانیوں میں اترنا کہ جو گہرائیوں سے خوف محسوس ہوتا ہوتو سمندر سے دور رہنا ہی مناسب ہے .... روزمرہ کی زندگی میں بھی ہم کو تحقیق کے عمل سے گزرنا ہوتا ہے۔ کسی کے بارے میں اپنی رائے کا غیر ذمہ دارانہ اظہار نہ ہو ورنہ رائے محفوظ رکھی جائے۔ یہ کام سچا اور مخلص فنکار کرتا ہے .... تحقیق کار کا (اور تخلیق کار کا بھی) دل انسانی ہمدردی سے لبریز ہونا چاہئے۔ یوں تحقیق وتنقید اور تخلیق کا بنیادی مقصد نوع انسانی سے گہری ہمدردی، اس کی بھلائی اور بہبود ہے جو اس روحانی ارتقا میں مضمر ہے جو ہم کو کسی انوکھی، تحیر خیز بات کا علم حاصل کر کے ہو....... تحقیق، تخلیق کی مانند تلاشِ حق ہے....... بنی نوع انسان کے لئے مفید، کارآمد، عظیم لمحۂ انکشاف انھیں ودیعت ہوا کرتا ہے ''جنوں پیوستگی'' جن کا شعار ہوتی ہے دھیان کو ایک طرف مجتمع کرنے کے جو اہل ہوتے ہیں ذہن اور روح جن کے روشن ہوتے ہیں، ''فکر کے نور'' (سید حامد کی دوسری خوبصورت ترکیب) سے جو معمور ہوتے ہیں.......

؎ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

تحقیق (ساتھ ہی تخلیق وتنقید) کے پس پردہ کارفرما ہوا کرتا ہے، تدبر، ''غور وفکر''، جمع شدہ مواد کا انجذاب .... یہ ''خونِ جگر'' کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی....... بڑی تحقیقات وتخلیقات زرخیز اور شگفتہ ذہنوں کی پیداوار ہوتی ہیں۔ محقق (ساتھ ہی تخلیق کار) کی مثال ایک سراغ رساں کی بھی ہوا کرتی ہے جو معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کی سعی کرتا ہے، ''جستجو'' جس کی فطرت ہوتی ہے۔ تحقیق ایک انبساط کا، سرشاری کا عمل ہے (مانند تخلیق کے) جو کسی نتیجہ پر پہنچنے سے حاصل ہوتی ہے اور انسانیت کو فائدہ پہنچانے کے امکانات روشن ہوجاتے ہیں .... حقیقی، سچے اور دائروی علم کا حصول .... (جس کی بنیاد intellect سے زیادہ Wisdom پر ہو) جو نیکی، دیانت داری اور راست بازی کی طرف مائل کرے بہت مشکل ہے۔ اس کے لئے جرأت اور حوصلہ مندی اور

استقامت درکار ہوتی ہے۔ آج ضرورت ہے بلند پایہ، کریم النفس تحقیقات کی جو انکشافی اور تشریحی ہوتی ہیں۔ جو اپنے اندر معنویت رکھتی ہیں...... آج کے مسائل کا حل...... جب کہ آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنیوں (اور بے محابا ''ترقیوں'') نے تاریکیوں کو جنم دیا ہے، جب کہ انسان بے روح ہو گیا ہے...... انکشاف لوگوں کو متحیر کرتا ہے۔ انوکھا اور تازہ ہونے کی وجہ سے عجیب سا لگتا ہے۔ شروع میں لوگ اسے قبول کرنے سے جھجکتے ہیں کہ ان کی مثال ایک سمت میں بہتی ہوئی نہر سے دی جاسکتی ہے چشمے سے نہیں۔ انکشافی محقق ایک چشمہ کی مانند ہے جو زمین سے پھوٹتا ہے اور اپنی راہ خود بناتا ہے، ناہموار اور انجانی راہوں پر رواں دواں ہوتا ہے وہ گرفت میں لاتا ہے، پھیلاتا ہے ایک پیام دیتا ہے یوں تحقیق تخلیق کے ماسوا تدریس اور پیغامبری سے بھی جا ملتی ہے!

تحقیق کے پس پردہ، جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے ''بے زنجیر جستجو'' اور ''شے کی حقیقت'' کو سمجھنے کی آرزو پنہاں رہتی ہے۔ کسی شخص پر لکھی گئی تحریر بھی تحقیق ہی ہے اسی جذبے نے مجھے مجبور کیا کہ میں سید حامد کی عظمتوں کا سراغ لگاؤں کہ ہمیشہ سے تحقیق کی خوحق کی جستجو، سربستہ رازوں کو جاننے اور یوں خود کو پہچاننے کی آرزو ہی...... سمندر کی گہرائیوں میں ڈوب کر موتی نکالنے کی آرزو۔ زندگی نے اکثر ضرورتاً (یہاں لفظ ''ضرورتاً بہت بامعنی اور اہم ہے کہ بے ضرورت تحقیق محض تضیع اوقات ہے)، تحقیقات پر اکسایا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا قلم ہاتھ میں پایا۔ ''قلم گوید کہ من شاہ جہانم''۔ مجھے اعتراف ہے کہ کسی بھی موضوع پر قلم اٹھانے میں میں اتنی فکرمند کبھی نہیں ہوئی۔ اتنی دقتوں کا سامنا کبھی نہیں کرنا پڑا، اپنی کم مائیگی کا احساس کبھی اتنا نہ ہوا۔ بڑی شخصیتوں پر لکھنے کے لئے، بڑی تخلیقات کو سمجھنے کے لئے، وسیع علم درکار ہوا کرتا ہے۔ یہ انکسار نہیں میں واقعی اپنی کم علمی اور ادراک کی کمی پر شرمسار ہوں۔ چنانچہ اس پوری تصنیف کو ایک کم علم کی کاوش کا ہی نتیجہ سمجھا جائے اور کمیوں اور کوتاہیوں کو درگزر کیا جائے قارئین سے یہ خصوصی درخواست ہے۔

سید حامد کی شخصیت کی عظمتوں اور بلندیوں اور وسعتوں کا سراغ لگانے کی جستجو خصوصاً یوں ہوئی کہ اسے قصداً متنازعہ فیہ بنایا گیا جیسا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ ہوا تھا (جن کو بلاشبہ ملک کا وزیراعظم ہونا چاہئے تھا کہ علم، تدبر اور بصیرت کے لحاظ سے برتر تھے، دین جن میں سرایت

تھا (اور سیاست سے جو دین جدا ہو جائے تو چنگیزی رہ جاتی ہے)۔ مولانا آزاد کی آواز بڑی آواز تھی جسے سن لیا گیا ہوتا تو تقسیم ہند کا المیہ نہ ہوا ہوتا، نہ ہی گجرات کانڈ....... یوں ہی مولانا آزاد کے بعد ''ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان دوسری بڑی آواز سید حامد کی ہے'' جن کی بات، بابری مسجد کی بابت، اگر بروقت مان لی جاتی تو قوم سلامت روی کی راہ پر چلتی۔ ان سارے خودساختہ قائدین نے، جن کی دھواں دھار تقریروں نے اس سانحہ کے لئے زمین تیار کی اس ہستی کی عظمتوں کو پہچان لیا ہوتا، انا پر قابو پالیا ہوتا، مسلمانوں کا رہنما لگنے کی کوششیں نہ کی ہوتیں تو وہ سارے المیے نہ ہوئے ہوتے جو ہوئے۔ سوال شے کی حقیقت کو سمجھنے کا ہے۔

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا

سید حامد کی ہمہ گیر شخصیت کا اعتراف ملک گیر پیمانے پر ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ اکثر انتہائی مشکل اوقات میں انھوں نے ملت کی مخلصانہ رہنمائی کی ہے، ڈھارس بندھائی ہے۔ ان کی بے ریا شخصیت، وقت کے اس لمحہ میں متنازعہ فیہ نہیں ہے۔ مسلمان ملک گیر سطح پر ان کے بہت قائل ہیں اور ان سے انتہائی محبت وعقیدت رکھتے ہیں۔ ان کی بات مانتے ہیں۔ ان کا احترام کرتے ہیں۔ سید حامد نے آڑے وقت میں ہمیشہ صبر وضبط، توازن اور حوصلہ کی تلقین کی۔ اردو اخباروں کے قارئین ان سے جرأت فکر اور اصابت رائے منسوب کرتے ہیں۔ ان اعترافات کی جن سے انھیں نوازا گیا فہرست طویل ہے تازہ ترین اعترافات وہ ہیں جو ۲۰۰۲ء کے آخری ہفتہ میں ان کی نذر کیے گئے پہلے پونہ میں ایک جلسہ ہوا۔ جس میں قاضی مجاہد الاسلام قاسمی مرحوم، سلیمان سیٹھ اور سید حامد کو ایف۔ ی کی طرف سے جو امریکہ میں آباد ہندوستانیوں کا مقتدر ادارہ ہے ایوارڈ دیئے گئے اس کے چند روز بعد سید حامد کو الامین سوسائٹی بنگلور نے قومی خدمات کے لئے ایوارڈ دیا۔ جامعہ ہمدرد کے چانسلر کے منصب پر سید حامد کی تقرری کی ستائش کی گئی۔ ''قومی آواز'' نے رپورٹ دی) ۱۳ر ستمبر ۱۹۹۹ء۔ ''حکیم عبدالحمید کی فروغ تعلیم تحریک کے سچے امین اور جانشین کو انجمن کے جلسہ میں خراج تحسین''۔

○

سید حامد صاحب کی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری سے سبکدوشی کے بعد میں نے ہمت

جمع کر کے ان کو خط لکھا جس کا جواب انھوں نے ۲۱ر اپریل ۱۹۸۵ء کو لندن سے دیا۔ پہلا جملہ ''نجمہ صاحبہ، عمر میں اتنا فاصلہ اور خیالات میں اتنا قرب ہے کہ میں تخاطب کا دوسرا لفظ نکال بھی سکتا تھا''۔

میں نے دوبارہ ہمت کی خط لکھنے کی اس کے جواب میں انھوں نے لکھا:

''آپ نے گویا ارادہ کرلیا ہے کہ اپنے قلم کی طاقت سے وہ سارے نقوش مٹا کر دم لیں گی جو ۲۷ر مارچ کی دلفریب شام کو نور وصدا نے مرتسم کر دیئے تھے۔ جشن منانے والوں نے میری برائیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا تھا۔ آپ نے میری مفروضہ یا مخترعہ اچھائیوں کے سلسلے میں جہاں تک غلو کا تعلق ہے جشن نجات منانے والوں کو مات دے دی۔ جیت یوں بھی آپ ہی کی ہوتی کہ یہاں غلو کی تہہ میں خلوص تھا، وہاں ہنگامہ آرائی''۔

۱۹۸۷ء میں میں نے سید حامد صاحب کی تنقیدی تصنیف ''نگار خانۂ رقصاں'' پر طویل مقالہ لکھا جو شائع بھی ہوا۔ اس کے بعد ''فکر ونظر'' کے ''ناموران علی گڑھ'' سلسلہ کے تحت میں نے ان پر مضمون لکھنے کا ارادہ کیا اور ان سے تفصیلی حالات زندگی لکھ کر بھیجنے کی فرمائش کی جو کہ انھوں نے بھیجے (جو محیط تھے ان کی زندگی کے نصف سے بھی کم عرصے پر)......... میں نے مضمون لکھا جو اشاعت پذیر نہ ہو سکا چند وجوہات کی بنا پر......... چنانچہ یہی بات محرک بن گئی اس طویل تحقیق کی......... (مخالفت نے مجھے ہمیشہ فائدہ پہونچایا ہے)..........

تفصیلی حالات زندگی کے مطالعے کے بعد میں نے شکریہ کا خط لکھا۔ چنانچہ مندرجہ ذیل سطور.........

''آپ کے ان سوانحی حالات نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ وہ سب برتوں جسے آپ غلو کا نام دیتے ہیں۔ لیکن واقعتاً جو سچائی اور حق ہے......... غلو وہ لوگ برتتے ہیں جن کا کوئی ذاتی مفاد کسی سے وابستہ ہوا کرتا ہے۔ ان سوانحی حالات سے عظیم المرتبی مترشح ہے۔ آپ مجھے حق گوئی سے کیوں روک رہے ہیں۔ مجھے مجبور کیوں کرتے ہیں کہ جو چیز موجود ہی نہیں یا فقط جس کی رمق ہو شاید (یعنی سیاہی) میں اسے ابھاروں؟ میرا خیال ہے کہ سیاہی ہے نہیں......... ''کھرا سونا، کھوٹ کہیں ہے ہی نہیں'' آپ مجھے بتائیں کہ کن عیوب کی نشاندہی کروں؟ ہاں ان محاسن پر روشنی ضرور ڈالوں گی جن کو عیوب بنا کر پیش کیا گیا ہے اور دکھا دوں گی ''انھیں'' کہ بے بصیرتی ان

کا مقدر ہے کہ غلو ان کی فطرت ہے.......... ''ہوشمندانہ'' معروضیت میری روش نہیں ہے میری نیت قطعاً صاف ہے.......... آپ کی ان سوانحی سطور نے مجھے مزید غلو برتنے (یعنی مزید حق گوئی) پر اکسایا ہے۔ میرے پاس اتنا مواد جمع ہوگیا ہے کہ پوری کتاب ہوسکتی ہے جو ایک غیر رسمی انکشافی وتشریحی تحقیق ہوگی........''۔

خط کے جواب میں پھر وہی غلو کے سلسلے میں فہمائش۔ صبر کا پیمانہ لبریز...... میں نے لکھا:

''میں نے آپ کی تعریفیں اس لئے نہیں کی ہیں کہ مجھے آپ سے کوئی دشمنی ہے یا میں نادان ہوں بلکہ اس لئے کی ہے کہ حق بات کہنے میں بخل، مصلحت، تامل یا پس وپیش مجھے اپنی عزت نفس کے منافی محسوس ہوتا ہے۔ اس سے میری عزت نفس مجروح ہوتی ہے۔ میں نے جو محسوس کیا ہے اسے بے خوف ہوکر لکھا ہے۔ ایسا میں نے اس لئے نہیں کیا کہ لوگ آپ سے allergic ہوجائیں۔ نہ ہی میرے اُس مقالے پر کوئی استہزائیہ مضمون آیا۔ لوگ آپ کا تہ دل سے احترام کرتے ہیں۔ سنجیدہ حضرات کا خیال ہے کہ میں نے یہ مضمون لکھ کر اردو ادب کی خدمت انجام دی ہے اور یہ بھی کہ ''سید حامد صاحب پر آپ کی کتاب آنی چاہئے''۔ اس پر میں نے جواب دیا کہ وہ بچی تعریف کرنے تو دیں صفحے کے صفحے کاٹ دیتے ہیں کہ غلو ہے تہلکہ مچ جائے گا۔ ایسا تو میں نے فقط آپ کو ہی دیکھا ورنہ بہت سے لوگ تو کہہ کر لکھواتے ہیں، زبردستی لکھواتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ اس میں بھی کوئی بہت زیادہ حرج نہیں کہ جس میں بھی خوبیاں ہوں (اور کس میں نہیں ہوتیں) وہ چاہتا ہے کہ لوگ اسے جانیں، اس کی قدر کریں کہ ہر انسان میں ایک تاریخ نہاں ہوتی ہے.......... مثلاً میری خود (بہ حیثیت ایک عام انسان کے) خواہش ہے کہ میرے بارے میں کوئی کچھ لکھے.......... اکثر مخلص حضرات نے کہا کہ آپ کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے اور دفاع کرسکتا ہے جس میں آپ ہی کی جیسی وسعتیں ہوں جو آپ کو سمجھنا چاہے، مخلص و ایماندار ہو.......... خودستائی کے لئے معذرت خواہ نہیں کہ یہ خود شناسی ہے۔ انکسار لازم ہے لیکن مجبور ہوگئی.......... اب آپ نکتہ چیں ہوں گے کہ اپنا قصیدہ پڑھنے لگیں تو یہ بھی مجبوری ہے۔ اپنی پہچان نہ کراؤں تو آپ کے بارے میں لکھی ہوئی رائے استناد کیوں کر حاصل کرے گی.......... کس سے کہوں کہ میرا قصیدہ لکھے؟ (۱۹۸۷ء.........)

ان ہی سطور کے زیر اثر ہی شاید سید حامد صاحب نے میری انگریزی کتاب From the Circle to the Centre (تنقیدی مقالات کا مجموعہ) کا تعارف لکھا جس سے میری خوداعتمادی میں اضافہ ہوا۔ اب یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ سید حامد صاحب پر مضمون لکھنے میں اگر آپ کا ذاتی فائدہ وابستہ نہیں تھا (مشکل یہ ہے کہ صارفانہ ذہنیت کے لوگ اسے فائدہ ماننے پر راضی نہیں) تو انگریزی کتاب کا تعارف ان سے کیوں لکھوایا۔ یہ اعتراض بھی صحیح ہے کیا دونوں باتیں بہ یک وقت صحیح نہیں سکتیں؟

اس تصنیف میں جسے ''سید حامد کہ گم اس میں آفاق'' کا نام دیا گیا ہے۔ سید حامد کی شخصیت کا مطالعہ ان کی حیات، تحریروں، تقریروں اور ''عمل پیہم'' کی روشنی میں کیا گیا ہے.........ایک دائروی شخصیت کا مطالعہ وتفسیر دائروی وژن اور طریق کار سے ....ان کے شایانِ شان خراج ان کو ہنوز نہیں مل سکا ہے۔ شایان شان تو شاید یہ بھی نہیں، واللہ اعلم بالثواب۔ بہت انتظار اس بات کا کیا کہ کوئی بابصیرت ہستی قطرے میں دجلہ دیکھ سکے، دکھا سکے، کہ کوئی معتبر ومستند ہستی اس اہم کام کو انجام دے سکے اسی انتظار میں دیر ہوتی چلی گئی۔ (ویسے اس ناچیز کا ۶۳ صفحات پر مشتمل مقالہ ''سید حامد: نگار خانۂ رقصاں کی روشنی میں'' شائع ہوکر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ مخلص، معتبر اور سنجیدہ حضرات نے اسے خاصا پسند کیا تھا)۔ چنانچہ ارادہ کیا کہ ''معتبر ومستند'' نہ سہی یعنی کہ ''معروضی...........'' (جوکہ شاید ہم ہو چکے ہیں)۔ اس اہم اور مشکل کام کو ہمیں ہی انجام دینا ہوگا۔ (قارئین سے اس ''پرفریب انکسار'' کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ دراصل اس کے پس پردہ لطیف طنز ہے۔ ناقدین کے طبقے نے اس مقالے پر معنی خیز خامشی اختیار کی تھی۔ ویسے جتنا کچھ سید حامد صاحب کے بارے میں مختلف حضرات نے لکھا وہ یقیناً اہمیت کا حامل ہے۔ ۱۹۸۶ء میں عابد رضا بیدار نے ''ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل'' کے عنوان سے سید حامد صاحب کے مضامین کو ترتیب دیا جس میں ''حرفِ چند'' کے عنوان سے ایک مختصر پیش لفظ شامل تھا۔ یقیناً یہ قابل قدر خراج تحسین تھا۔ ۲۰۰۰ء میں پروفیسر فصیح احمد صدیقی کی کتاب ''یادوں کی مہک'' شائع ہوئی جس میں سید حامد صاحب پر دو مضامین بہ عنوان ''محترم سید حامد صاحب قبلہ'' اور ''کچھ کہنے نہ کہنے کے درمیان'' شامل ہیں جو اہمیت کے حامل ہیں۔ جذبۂ عقیدت سے لبریز۔ ۲۰۰۱ء میں

''عرفان سید حامد'' (مرتبہ پروفیسر اصغر عباس) میں کافی مضامین اور تبصرے سید حامد صاحب پر جمع کئے گئے ہیں۔ جس میں ایک مختصر پیش لفظ مرتب کا بھی شامل ہے۔ ان مضامین میں جمیل الدین عالی، اسلوب احمد انصاری اور شمس الرحمٰن فاروقی، وارث کرمانی، توقیر احمد خاں اور مجتبیٰ حسین وغیرہ کے مضامین بہت اچھے ہیں۔ یہ کتاب مرتب کی اس عقیدت کی غماز ہے جو ان کو سید حامد سے ہے۔ ۲۰۰۲ء میں خلیق انجم نے ''مضامین سید حامد'' دو جلدوں میں شائع کی۔ اس میں جگن ناتھ آزاد، خلیق انجم، ابوالفیض سحر اور نثار احمد فاروقی اور عبدالمغنی وغیرہ کے مضامین قابل قدر ہیں (سید حامد صاحب کے بہ قول، غلو میں جگن ناتھ آزاد، عابد رضا بیدار اور راقم سطور ایک ساتھ کھڑے ہیں۔ اس اتہام سے ہمیں فقط معزز قارئین ہی بچا سکتے ہیں!) ''مضامین سید حامد'' کے علاوہ خلیق انجم نے ''روشنی کے مینار'' کے عنوان سے سید حامد صاحب کے تحریر کردہ خاکوں کو یکجا کیا ہے۔ اس میں ''حرف آغاز'' کے عنوان سے مختصراً انھوں نے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ان کے علاوہ نثار احمد فاروقی اور ابوالفیض سحر کے مضامین بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ خلیق انجم نے ایک اور اہم کام انجام دیا یعنی جشن سید حامد کمیٹی کی طرف سے سید حامد صاحب کی نظموں کا مجموعہ ''شیرازہ'' شائع کیا، جو یقیناً خوبصورت شاعری کا نمونہ ہے......

میری اس کتاب کے سلسلے میں منصوبے کافی تھے۔ بہت سی معلومات کی فراہمی، یہ کام آسان ہو جاتا اگر میرا تعلق اس صنف سے نہ ہوتا جس کے پیروں میں پیش تر بیڑیاں رہی ہیں ...... ملازمت، گھریلو ذمہ داریاں، بچوں کی نگہداشت، سرپرستی، ...... کچھ کرم فرما بھی راستے کا پتھر بنے رہے جو ہر خوبی کو عیب میں بدل دینے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں اور حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے میں سرگرم عمل باوجود نامساعد حالات کے یہ کتاب انشاءاللہ منظر عام آئے گی۔

اس کتاب کے شروع کے مضامین کے عنوانات اقبال کے اشعار سے ماخوذ ہیں جن میں ایک نظم ہے، ایک rhythm ہے۔ ''کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ'' ''اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے'' ''خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں'' ''یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم'' ''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں'' ''آہنگ میں یکتا صفت سورۂ رحمٰن'' ''لمحات پر مضمون کا عنوان .... ''خرد نے پیڑ کے پتوں میں تیری معرفت ڈھونڈی'' ''شیرازہ'' پر

مضمون کا عنوان ''ریگ زار اس کے اشارے سے خیابان بنے'' اور کاروانوں پر تحریر شدہ مضمون ''سرِ افلاک نظر آتا ہے اس کا پرچم'' اور سید حامد کی چند تحریروں کے انتخاب پر مشتمل مضمون ''نورِ آتش کدۂ فکر سے روشن ہے دماغ'' سے لئے گئے ہیں ''لمحات'' میں شامل نظم بہ عنوان ''حمد'' اور ''شیرازہ'' میں شامل نظم ''تشنہ لبی'' سے۔ کتاب کے بیشتر ابواب کے عنوانات مصرعوں پر رکھنے کی روش شائد عجیب لگے۔ عنوانات روایتی انداز میں بھی رکھے جاسکتے تھے۔ مثلاً سید حامد حیات اور کارنامے، ''بچپن کا دور''، دورِ طالب علمی، ملازمت کا زمانہ''، مسلم یونیورسٹی کی سربراہی کا زمانہ، جامعہ ہمدرد میں''، میر کارواں'' وغیرہ وغیرہ.......... اس سلسلے کا آخری مضمون ''دجلہ بہ دجلہ یم بہ یم، چشمہ بہ چشمہ جُو بہ جُو.......... '' فارسی شاعرہ قرۃ العین طاہرہ کی مشہور غزل سے ماخوذ ہے۔ یوں پوری کتاب ایک طرح سے ایک شعری تخلیق بھی بن جاتی ہے۔

اس ساری کاوش میں اک معنی خیزی ہے جسے شاید ستائش کی نظر سے دیکھا جائے!

باقی تحریریں ۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۷ء کے درمیان کی لکھی ہوئی ہیں۔ جن میں نگار خانۂ رقصاں پر مقالے کے علاوہ سب سے اہم اور معنی خیز تحریر ''ذکر ایک مشعل بہ کف اور قندیل بہ چشم کا ہے''۔ یہ نثری قصیدہ ۱۹۸۳ء میں لکھا گیا تھا اس کا انداز عارفانہ اور صوفیانہ ہے ایک ذہنی ماحول کی تشکیل، کئی اصناف سخن کا امتزاج، ایک سپاس نامہ، اس ہستی کے لئے جو ہمارے عہد کی ''محبوب ومحترم شخصیت'' (خیال نثار احمد فاروقی)۔ سرِ افلاک نظر آتا ہے جس کا پرچم۔

مندرجہ ذیل سطور طویل مقالے ''سید حامد نگار خانۂ رقصاں کی روشنی میں'' کے سلسلے میں۔ یہ ۱۹۸۷ء میں قلم بند کی گئیں بہ طور پیش لفظ اس مقالے کے جو پہلے حیدرآباد سے شائع ہونے والے جریدے ''شعر وحکمت'' میں شائع ہوا پھر اسے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی نے رسالے سے اخذ کر کے کتابی صورت میں شائع کیا۔ یہ وہی مقالہ ہے جسے قدر دانوں نے سراہا مثلاً سید حامد کے بڑے بھائی سید محمد مرحوم، حکیم عبدالحمید مرحوم، عثمان ادھمی مرحوم، فضل المتین صاحب وغیرہ (جو اجمیر سے علی گڑھ تشریف لائے۔ اس مقالے کی بنیاد پر اس ناچیز کو اجمیر آنے کی دعوت دی کہ وہاں تصوف پر لکچر دوں جس پر کچھ مجبوریوں کی وجہ سے عمل نہ کر سکی)۔ عثمان ادھمی، بہ قول خود، اس مقالے کو پڑھنے کے لئے ''گوشہ عافیت'' کی تلاش میں علی گڑھ سے کچھ دور رمیسر انام کے پر فضا مقام پر گئے۔

وہ سطور جو بہ طور پیش لفظ تحریر کی گئیں یوں تھیں:

''اردو میں کسی تصنیف پر تفصیلی تبصرہ لکھنے کا رواج عموماً نہیں ہے بڑی بڑی اہم کتابوں پر چند صفحات میں تبصرے کا حق ادا کردیا جاتا ہے۔ جن میں تبصرہ نگار کی پہلے سے طے شدہ رائے کا اظہار ہوتا ہے۔ میں نے اپنے طویل تبصرے میں ''نگار خانہ رقصاں'' کے تمام اہم گوشوں کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے۔ تخلیق کی طرح تنقید بھی لکھنے والے کی شخصیت سے مربوط ہوتی ہے۔ اس لئے اس تبصرے میں سید حامد کی شخصیت کو ان کی تنقیدی تحریروں کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کی گئی ہے۔ ان کا اپنا ذاتی خیال ہے کہ ''زندگی میں بہت سی چیزیں ناقابل تقسیم ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر شخصیت، عدل اور سچائی انھیں کے زمرے میں علم آتا ہے''۔ اسی علم کا اظہار مصنف کی تحریروں میں ہوتا ہے یوں شخصیت (ذات) اور فکروفن کو خانوں میں تقسیم کرنا غیر مستحسن ہے کہ اس سے سالمیت مجروح ہوتی ہے۔ ''نگار خانہ رقصاں'' میں اس کے خالق کی غیر منقسم شخصیت ظہور پذیر ہوئی ہے .... ادب کا مقصد کائنات کے رازہائے سربستہ کی جستجو ہے اور کائنات (جو اک دائرہ ہے) کا مرکز انسان ہے جو ازل سے اپنی ہی تلاش میں گم ہے۔

اور اسی لئے جو مضمون کتاب پر فقط تبصرے کی صورت تحریر کیا جانے والا تھا۔ اس نے مصنف کی شخصیت کو بھی سمیٹ لیا۔ ایلیٹ بھی بالآخر ذات اور فکروفن کے غیر تقسیم پذیر ہونے کا قائل ہو ہی گیا تھا (ملاحظہ ہوں بن جانسن اور جان فورڈ پر تحریر شدہ اس کے مضامین) مذہبیات اور ادبیات میں عموماً دائرے کا استعارہ غیر منقسم، کامل شخصیت کی نشاندہی کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ سید حامد کی شخصیت دائرے کی مانند محیط اور محتوی ہے اور آج کی اس دنیا کو ایسی شخصیتوں کی اشد ضرورت ہے!

سید حامد کی تحریریں (خواہ وہ تنقید ہو، انشا پردازی یا شاعری) ان کی بے ریا، مخلص، عارفانہ اور مدبرانہ شخصیت کا اظہار ہیں۔ اسی لئے اس مقالے میں ان شخصی خصوصیات کو جابجا زیر بحث لایا گیا ہے۔ خود کو پیشہ ور نقاد نہیں سمجھتی لیکن انگریزی اور اردو تنقید کا جتنا اور جیسا مطالعہ میں نے کیا ہے اس سے میں اس نتیجہ پر پہونچی ہوں کہ اچھی اور کھری تنقید وہی ہوتی ہے جو متوازن، انسانی اور عارفانہ معیاروں (Mystical standards) کو ادب کی تفہیم وتشریح کے لئے استعمال کرے۔ سید

حامد کی تحریروں اور ان تحریروں کی روشنی میں ان کی شخصیت کے مطالعے کے لئے یہی معیار استعمال کئے گئے ہیں ورنہ دیانت دارانہ تفہیم ناممکن تھی۔

میں اس تبصرے میں خالص غیر جانب داری اور ''معروضیت'' نہ برت سکنے پر نادم نہیں ہوں اس لئے کہ میں ان کی دائروی شخصیت سے مرعوب بھی ہوں اور متاثر بھی (بجا طور پر) جب معاملہ حق کی طرفداری کا ہو تو شخصیت کے بارے میں جو کچھ کہا جا سکتا تھا وہ کافی حد تک اس تبصرے (یا مقالے) میں موجود ہے''۔

اس مضمون کا پہلا ڈرافٹ سید حامد صاحب کو دکھانے کے لئے میں جامعہ ہمدرد گئی۔ واپسی پر ان کا ایک خط آیا جس سے یہ اقتباس..........

''آپ نے مجھ پر مضمون لکھنے کے سلسلہ میں بڑی زحمت اٹھائی۔ ممنون ہوں۔ آپ کے مطالعے کی وسعت سے متاثر ہوا۔ آپ تشریف لے گئیں تو یہ خیال آیا کہ مضمون اور اختصار اور اس کا موضوع مزید تخفیف کا طالب ہے۔ زحمت نہ ہو تو مصحح مضمون کو دوبارہ لکھ لیں ان مقامات کو حذف کرتے ہوئے جہاں اعادہ اور غلو ہوا ہو۔ مجھے ایک نظر دیکھنے کے لئے بھیج دیجئے۔ دوسرے دن ہی واپس کر دوں گا۔ مضمون بہت اچھا ہے لیکن اسے مربوط کرنے کا عمل ابھی باقی ہے''۔

(مورخہ ۵؍ستمبر ۱۹۸۶ء)

اور اس مقالے کی اشاعت کے بعد اس کے بارے میں انھوں نے جو رائے دی وہ یوں تھی..........

''افسوس اس کا ہے کہ میں کھل کر آپ کے مضمون کی تعریف بھی نہیں کر سکتا کہ یہ میرے متعلق ہے۔ جی بھر کے داد دیتا اگر یہ سطور آپ نے کسی اور کے بارے میں لکھی ہوتیں۔ یہ مضمون پڑھ کر میرا اعتبار میری نظر میں بڑھ گیا۔ رائی کا پہاڑ آپ نے ضرور بنایا ہے لیکن رائی کو دیکھ لینا اور اس کی نشان دہی کرنا آسان کام نہیں ہے۔ مبالغہ کے ساتھ آپ نے وہ سب کہہ دیا جو میری قلم برداشتہ تنقید کے بارے میں بالعموم اور نگار خانہ رقصاں کے سلسلہ میں بالخصوص کہا جا سکتا تھا۔ عام خیال جس کا نگار خانۂ رقصاں کے بارے میں اظہار کیا گیا یہ تھا کہ یہ کتاب قاری دلچسپی سے پڑھے گا کہ طرز بیان شگفتہ ہے اور بات لطف لے کر کہی گئی ہے۔ کسی نے شاید یہ نہیں کہا ناقد کا بنیادی وصف انصاف پسندی ہے۔ یہ آپ نے کہا اور شدومد سے کہا۔ آپ صرف کہتیں'' (اور شدو

مد کے ساتھ نہ کہتیں) تو اور اچھا ہوتا..........

مضمون آپ کے مطالعے کی وسعت اور آپ کے تنقیدی ذوق (اگر میرے بارے میں اغراق سے اغماض کیا جائے) کا آئینہ دار ہے۔ اگر بہ طور نقاد میری کوئی حیثیت ہوتی تو میں بلا تامل یہ کہہ دیتا کہ میری تنقید کو سمجھنے کے لئے آپ کے مضمون سے رجوع کرنا ناگزیر ہے۔ چوں کہ ایسا نہیں ہے اس لئے میں آپ کے تنقیدی شعور، تجزیاتی گہرائی اور اسلوب نگارش کو داد دینے پر اکتفا کروں گا''۔

(مورخہ یکم اگست ۱۹۸۷ء، ہمدرد نگر، نئی دہلی)

اس انتہائی متوازن، منصفانہ اور دیانت دارانہ رائے کے بعد پھر مجھے مزید کسی بھی دوسرے کی رائے کی فکر نہ رہی یقیناً یہ رائے میری ''جستجو''، میری بے انتہا عرق ریزیوں اور ان تھک محنتوں کا صلہ ہے جو مجھے اس مقالے کو تحریر کرنے میں ہوئیں۔

سید حامد صاحب پر کچھ لکھنے کی تحریک مجھے ایک معجزاتی طور پر ہوئی جواب تک جاری ہے۔ (۲۰ سال کے عرصہ پر محیط) منارۂ نور کی طرف نظر جانا فطری امر ہے.......... شخصیت کا تصور آفاقی تصور ہے.......... انسان کامل کا تصور جس کی بہترین مثال سرور کائنات، رحمت اللعالمین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ان کے نقوش قدم پر رواں دواں ہستی.......... ''زندہ رود، ''جوئبار.......... خودی، خود شناسی، فقر، عشق وغیرہ اوصاف سے مزین ہستی.......... حضور پر تحریر کردہ ان کی دونوں نعتوں کے مندرجہ ذیل اشعار کو خود ان کی ہی شخصیت پر منطبق کر دیجئے کہ سلسلۂ نسب اسی ہستی سے ملتا ہے۔

ٹکرائے صداقت کی خاطر بے خوف وخطر چٹانوں سے
جب رزم سے محفل میں آئے تو جان حیا بن کر آئے

(نعت مشمولہ ''لمحات''

اور اسی نعت کا یہ شعر بھی چھوڑا نہ جا سکا..........

یونان سے حسن جسم وخرد انساں کو ملا تھا اس کے سوا
تہذیب وعروج روح بشر کے نغمہ سرا بن کر آئے

اوراب دیکھئے ''شیرازہ'' میں شامل ''نعت'' سے یہ اشعار

تخت شاہی پر بٹھائیں گے محمد آپ کو ڈال دیں گے پاؤں پر گنجینۂ لعل و گہر
شرط یہ ہے چھوڑ دیجئے رسم و راہ انقلاب دودماں کی ریت کیا ہے آپ جاتے ہیں کدھر
''ذکر کیا لعل و گہر کا'' آپ فرمانے لگے ''لا کے میرے ہاتھ میں رکھ دیں اگر شمس وقمر
باز آؤں گا نہ پہونچانے سے خالق کا پیام روز روشن بن کے دم لے گا صداقت کا شرر''

اور پھر............

طنز، استہزاء، تمسخر، سنگباری، دھمکیاں نرغۂ اعداء میں برسوں تک رہے پیغامبر

اور پھر نظم کے آخری اشعار...........

ناخوشی کا آپ کی اظہار کم کرتی زبان اور ہونٹوں پر نہ آتی بات کوئی دل شکن
روئے روشن پر ابھرتی موجۂ تغیر رنگ پرتو گل سے گلابی رنگ جیسے یاسمن

بچپن سے لے کر اب تک حضور سے اپنی بے پایاں عقیدت کے باوصف جب مجھے ایک ہستی میں ان کی شخصیت کے پرتو اور واضح نقوش ملے تو پھر قلم کیوں رکتا...........اسے کوئی کیوں روک پاتا؟

استدعا ہے مجھ پر غلو کا اتہام اب نہ لگایا جائے۔

نظموں کے مجموعے ''شیرازہ'' کے بارے میں ان کی خواہش تھی کہ میں کچھ لکھوں (دو تین نظموں پر)...... مطالعہ شروع کیا تو خود کو روک نہ سکی کئی نظموں کا احاطہ کرلیا...........ایک طویل مقالہ وجود میں آیا۔ اس مجموعہ میں داخل ہو کر واپسی دشوار ہوئی۔ ایک جہان معنی...........سب سے زیادہ مشکلات کا سامنا اسی مقالے کو لکھنے میں ہوا۔ دوسری بات یہ کہ چوں کہ دائرۂ سوچ ہے اس لئے شخصیت اور فن کو ناقابل تقسیم سمجھتی ہوں۔ شاعری کے ذریعہ شاعر کے اندرون تک رسائی ....شخصیت کا مطالعہ........... حیات کی تفسیر وتشریح۔ فقط شعری حسن کو داد دینا بے رحمی سمجھتی ہوں۔ اگر شاعری میں کہیں رنج وغم کی کیفیات کا اظہار ہے، اس صورت میں ہمدردی اور غم گساری انسانی فریضہ ہے۔ یوں ناقد اور قاری کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس مقالے کو تحریر کرنے کے دوران میری جستجو اور سوالات سے سید حامد صاحب کو زحمت ہوئی ہوگی لیکن یہ اعتماد

سے کہہ سکتی ہوں کہ جو کوئی واقعی اصل سید حامد کا سراغ لگانا چاہے جو کہ سراپا شاعر ہے، ایک سچا شاعر تو ''شیرازہ'' کا مطالعہ از حد لازمی ہے۔ اس مجموعے کے پس پردہ جو پرکشش شخصیت پنہاں ہے، شخصیت کی جو جہت نمایاں ہے وہ ان کی شخصیت کی دوسری جہات پر سبقت لے گئی ہے .... ایک ''قلزم بہ جو''، مراقبوں میں غرق، سراپا محبت، انتہائی مخلص اور معصوم انسان کی شخصیت جو نیک طینت، شریف النفس اور با کردار ہے، آزادئ روح کا جو علمبردار ہے، وجود مطلق کے عشق میں جو ڈوبا ہوا ہے، دین کی روح جس میں جذب ہے، ایک مدبر جس میں پنہاں ہے، بزرگی جسے ودیعت ہوئی، فطرت سے جسے عشق ہے، عظمت انساں کا جو نقیب ہے، سادگی اور فطریت جس کا شعار ہے، وضعیت اور تصنع سے جو برگشتہ خاطر ہے، فریب اور دکھاوے سے جو گریزاں ہے، الحیاء والایمان جس کا شیوہ ہے شاعروں کی عمومی روش سے جسے حذ ہے......... جسے خود سے اوپر اٹھنے کا، ترفع کا فن آتا ہے......... شیرازہ کا شاعر معرفت کی منزلوں کا مسافر .... حلقۂ عرفاں میں شامل اور پھر مراقبوں سے واپسی پر ایک خوبصورت دنیا کی تعمیر وتشکیل کا متمنی اور اس کے قیام کے لئے کوشاں......... انسان کامل.........

شاعری جز ویست از پیغمبری

میں سید حامد کی مشکور ہوں کہ انھوں نے میری جستجو کے تحت اپنے بارے میں لکھنے کی اجازت دی اور یوں مجھے خود اپنی ذات کے علم وآگہی کے حصول میں مدد دی۔

میں ان سبھی ہستیوں کی شکر گزار ہوں جنھوں نے مجھے کسی نہ کسی صورت تعاون دیا (جس میں تعلیم آباد کے مختلف افراد بھی شامل ہیں)۔ میں اپنے بچوں ہمایوں، صائمہ اور خسرو (فریدوں) کی شکر گزار ہوں جن کے تعاون کے بغیر یہ کتاب اشاعت پذیر نہ ہو پاتی۔ میرے چھوٹے بیٹے خسرو نے اسے مکمل کرنے اور شائع کروانے کے لیے اکسایا، اس کی معنویت اور اہمیت کا احساس دلایا۔ اس کی حوصلہ افزائی پر ہر بار میرے کام کی رفتار تیز ہوئی۔ میری دوست شہناز کنول غازی نے مسودہ کے اکثر حصے پڑھے ان پر گفتگو کی۔ اکثر عقدہ کشائی کی جس سے کہ ان کا تنقیدی شعور اور علم مترشح ہے۔ محمد ثناء اللہ ندوی (استاذ شعبۂ عربی) نے میری درخواست پر حرف اوّل تحریر کیا۔ ڈاکٹر راحت ابرار نے اپنی تصنیف ''کل ہند تعلیمی کارواں'' سے چند تصاویر شائع کرنے کی

اجازت دی۔ اس تصنیف کے طابع محترمی این۔ آر۔ فاروقی، کمپیوٹر ٹائپسٹ اور خطاط غیاث الدین اناادی کی شکرگزار ہوں جن کی محنت سے یہ کتاب منظر عام پر آسکی۔ ان سب حضرات کے ماسوا میں ان سبھی حضرات کی مشکور ہوں جنھوں نے مجھے کسی نہ کسی صورت تعاون دیا۔

سرورق پر دائرے کے اندر تعلیم آباد کا ایک طرحدار گوشہ، پیڑ کے پتے اور اس کے پیچھے ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کے آفس کی عمارت۔ تصویر کے نیچے سید حامد کی نظم ''حمد'' کا یہ مصرعہ.......

خرد نے پیڑ کے پتوں میں تیری معرفت ڈھونڈی

جس کا دوسرا مصرعہ.........

جنوں دریا و صحرا میں تجھے آواز دے آیا

○

جنگل کی آواز

نجمہ محمود

کہانی کی وہ تعریف کہ یہ ''کسی خاص لمحہ کو گرفت میں لانے کا نام ہے۔ وہ تیرتے اور بہتے ہوئے لمحے جو عموماً پکڑ میں مشکل سے آتے ہیں ان کو لازوال بنانا کہانی کا اصل مقصد ہے'' ......

قابل قبول ہے کہ یوں اچھی کہانی بہ ذات خود شعر بن جاتی ہے۔ ایک ایسا فن پارہ جو عصری حسیت کو خود میں سموئے ہوئے ہو ساتھ ہی جو ''وارفتگی و محویت و نغمگی کی ایک ایسی خوابناک دنیا میں قاری کو کھینچ لے جائے جہاں چہار سمت مسرت و انبساط کی روشنی بہہ رہی ہو۔ جو اس کے رگ و پے میں سرایت کر جائے''، اس کو سکون بخش سکے اور تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی وہ وجود کے کرب سے نجات حاصل کر سکے، اس میں سرشاری کی کیفیت اور جمالیاتی حظ پیدا ہو سکے!

دنیا کی بہترین شاعری کہانیوں کو سموئے ہوئے ہے شاعری جسے ''انسان کا بہترین کلام'' کہا گیا ہے، ''علم کی روح اور تنفس کہا گیا ہے۔ مثال کے طور پر رومیؔ جنھوں نے کہانی اور شاعری کو یکجا کر کے معجزے دکھائے ..... دانتے اور شیکسپیئر نے بھی یہی کیا۔ ورجینیا وولف نے ناول میں شاعری کی ..... خلیل جبران کی تحریریں شاعری بھی ہیں اور افسانہ بھی ..... معرفت، تصوف، پیغامبری اور خلیل جبران بلند ترین چوٹی پر کھڑا ہوا فن کار ہے اس پر فقط شاعر یا افسانہ و ناول نگار کا ٹھپہ نہیں لگایا جا سکتا، اور قرآن حکیم میں بہترین کہانیاں اور شاعری موجود ہے۔

قیصر تمکین مرحوم نے اپنے معرکتہ الآرا مضمون ''فکشن نگاری۔ ایک لمحہ فکریہ'' میں کہا تھا۔

''شاعری اگر پیغامبری ہے تو افسانہ خدائی ہے۔''

ادب کو خانوں میں تقسیم کرنا غیر مستحسن ہے کہ یوں ادب اور ادیب دونوں محدود ہو جاتے ہیں ..... کسی بھی فن پارے میں ہم فن کار سے ہی ملتے ہیں اور وہ اپنی حسیت اور اصل شخصیت کو

صرف اپنے فن میں ہی ظاہر کر پاتا ہے ورنہ دنیا اسے کچھ کا کچھ سمجھتی رہتی ہے کہ بڑی شخصیت سمندر کے مانند ہوا کرتی ہے..... شیکسپیئر اپنی تخلیقات میں ہر جگہ موجود ہے۔ آفاقی موضوعات (تصور انسان، عشق، خودی، وقت، حسن، فنا، بقا، انسانی رشتوں کی المناک ریزش) کے ذریعہ وہ اظہار ذات کرتا ہے، اور ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ نبوغی شخصیت کا مالک تھا، صوفی تھا، روح کا معالج تھا، اس میں گہری مذہبیت تھی۔ انگریزی کی رومانی تحریک کا اہم ترین موضوع شخصیت کا تصور تھا جس کے بیج شیکسپیئر کی کہانیوں اور شاعری نے بوئے تھے (اس پر فقط ڈرامہ نگار کا ٹھپہ لگانا اسے محدود کرنا ہے تھیٹر اس کی پیشہ وارانہ مجبوری اور ضرورت تھی..... سیموئیل جانسن اور کولرج نے اسے شاعر کہا تھا) خصوصاً اس کے سانیٹس، میں پیش کردہ ''خوب رو، نوجوان'' اور اس کے طربیوں کی نسائی شخصیات..... روزالنڈ، پورشیا وغیرہ نے۔ اس کا تخیل زرخیز و بے کراں اور دل انسانی ہمدردی سے لبریز تھا۔ اس نے حسن کا ادراک کیا تھا۔ اس کا ذہن امتزاج تھا عقل و وجدان کا جو کہ دائروی شخصیت کی پہچان ہے..... کسی کو گہرائی سے سمجھنے کے لیے مستند سرچشمہ اس کی تحریر ہوتی ہے (بہ شرطیکہ وہ فنکار ریاکار نہ ہو) جس کے ذریعہ وہ اپنی ذات کو مربوط اور مجتمع کرتا ہے۔ تخلیق سے غیر مخلص، نمائشی رغبت اور اس کے خالق سے بے اعتنائی (جو امریکی نئی تنقید کا خاصہ تھی) قطعاً مادہ پرستی اور اکہرا پن ہے۔ یہ اس روشن خیال کی تردید کرتی ہے کہ ذرہ ذرہ میں خدا کا ظہور ہے، اسی کا نور ہے۔ اگر قول و فعل میں تال میل ہے، ریاکاری نہیں خلوص ہے تو اس فنکار کا مطالعہ اس کی تخلیقات سے بڑھ کر کسی اور طریقہ سے ممکن نہیں اس کے برخلاف جو سوچ ہے وہ قطعاً بددیانتی ہے۔

مندرجہ بالا توجیہات کے پیش نظر اس افسانوی مجموعہ کی تخلیقات ایک فنکار کا مطالعہ ہیں، انسان کا مطالعہ ہیں۔..... ذاتی بھی ہیں اور آفاقی بھی۔ ایک سفر کی داستان ہے۔ مرکز سے دائرے اور دائرے سے مرکز تک کا سفر! مجھے اپنے افسانوں کے بارے میں کبھی کوئی زعم نہیں رہا۔ ان کی اہمیت کا کبھی احساس ہی نہ ہوا۔ اسے آپ میری کسر نفسی اور انکساری پر ہی محمول کریں (کہ یہ میری طبیعت کا خاصہ ہے) مجموعہ کے شروع اور آخر میں دی گئی معتبر ناقدین اور قارئین کی رائیں میرے اس خیال کی تائید کریں گی۔

افسانوی مجموعہ ''پانی اور چٹان'' کا دوسرا ایڈیشن شائع کرانے کا ارادہ تھا ساتھ ہی اس کے بعد کی تخلیقات پر مشتمل دوسرا مجموعہ بھی لانا چاہتی تھی، لیکن کتاب کی اشاعت (وہ بھی بوجوہ خود

اپنے آپ، اپنے ہی تشکیل کردہ ''وژن پبلی کیشنز'' کے ذریعہ) بہت بڑا دردِ سر ہے۔اس سے بھی بڑا دردِ سر کسی پبلشر کے ذریعہ شائع کرانا ہے۔دو عدد کتابوں کی بہ یک وقت اشاعت ایک مصیبت معلوم ہوئی۔مخلصین نے میری الجھن دیکھ کر مشورہ دیا کہ پہلے مجموعہ کے دوسرے ایڈیشن کے بجائے دوسرا مجموعہ شائع کیجیے اوراسی میں پہلے مجموعہ کے بیشتر افسانے شامل کردیجیے یوں دو کے بجائے فقط ایک مصیبت رہ جائے گی۔مشورہ خاصا قابل قبول اور دل خوش کن لگا لیکن صحافت کے بندھے ٹکے اصول وضوابط کی خلاف ورزی بھی معلوم ہوا پھر یہ سوچ کر کہ اس طرح کی خلاف ورزی کرنے کی جرأت تو میں اپنے چند نادر ''تجربوں'' کے ذریعہ اس سے قبل ہی کر چکی ہوں۔یعنی اپنا اور دوسروں کا قیمتی وقت بچانے کے لیے ''ماہنامہ بزم سہارا'' کے فقط چھ صفحات پر مشتمل ناول (جنگل کی آوز) اور کئی ''طرحی'' افسانے (جب کہ اب تک فقط طرحی غزل لکھنے کی اجازت تھی)۔تو پھر ایک مزید تجربے میں کیا ہرج ہے۔جیسے پچھلے تجربوں کو قبول خاص وعام ملا ویسے ہی یہ انشاء اللہ قبول کیا جائے گا۔اس لیے کہ یہ بات عموماً سب جانتے ہیں کہ ایک معقول مصنف کے لیے ایک ہی کتاب شائع کرانا، اور ایک معقول قاری کے لیے فقط ایک ہی کتاب پڑھنا (آج کے مصروف دور میں) کس قدر مشکل کام ہے نہ کہ بہ یک وقت دو دو کتابیں شائع کرانا اور دو دو کتابیں خریدنا اور پڑھنا۔مجھے امید ہے کہ قارئین میری اس درجہ انسانی ہمدردی کی قدر کریں گے (اپنے جذبۂ ہمدری کے تحت ہی میں نے جتنا لکھا ہے اس سے کافی کم شائع کرایا ہے)

عظیم فن پارہ وہ نہیں جو براہِ راست سب کچھ کہہ دے فقط پروپیگنڈا اور رپورٹنگ ہو۔ساتھ ہی عظیم فن پارہ وہ بھی نہیں جسے پڑھ کر قاری مخمصہ اور خلجان میں پڑ جائے بار بار پڑھنے پر بھی اس سے استفادہ نہ کر سکے، محظوظ نہ ہو سکے۔لازم ہے کہ کوئی فن پارہ پہلی بار میں ہی متاثر کرے، کچھ کہے اور بار بار پڑھنے پر بہت کچھ کہے، قاری پر ایک جہان معنی منکشف ہوں وہ فن پارہ ہم کو خود سے اوپر اٹھا دے۔محظوظ وسرشار کرے اور زندگی بھی سنوار دے، اور بار بار کوئی فن پارہ تب ہی پڑھا جاتا ہے جب اس میں آفاقی موضوع، زرخیز تخیل کی فراوانی، فطرت کے پُراسرار وفسوں خیز حسن کی پیش کش، جنس کا ترفع، گہرے اور دائرۂ علم کا انجذاب ہو (شعوری کوشش کے بغیر) عظیم فن پارے میں بڑے موضوع کے علاوہ زبان وبیان کا حسن، جدت اور ندرت ہوتی ہے۔جس سے کہ قاری میں سرشاری کی کیفیت پیدا ہو سکے وہ وجود کے کرب سے (لمحاتی ہی طور پر سہی) نجات

دلا سکے۔ شیخ سعدی، رومی، عطار، شیکسپیئر، ورڈز ورتھ، کولرج، گوئٹے، دانتے، کیٹس، ورجینیا وولف، اروندوگھوش، خلیل جبران، اقبال اور ٹیگور وغیرہ کی تخلیقات ایسی ہی تخلیقات ہیں اسی لیے عالمی ادب میں ان کا مقام مستحکم ہے۔ فکشن بھی، شاعری کی طرح زندگی کی تفسیر، تعبیر اور تشریح ہے۔ نقد حیات ہے۔

افسانہ میں، فکشن میں اگر افسانویت نہیں تو کچھ بھی نہیں ساتھ ہی شعریت بھی کہ ''شاعری سارے علم کی روح ہے، تنفس ہے، انسان کا بہترین کلام ہے''۔ خلیل جبران اور شیکسپیئر نے افسانہ اور ڈرامے میں شاعری کی۔ حجاب امتیاز علی، کرشن چندر اور جمیلہ ہاشمی نے فکشن میں شاعری کی۔ قرۃ العین حیدر کو ''تاریخ کی شاعرہ'' کہا گیا اور راقم الحروف بھی اسی راہ پر گامزن ہے! اور اب معتبر (لیکن نسبتاً غیر معروف) فکشن ناقد وافسانہ نگار قیصر تمکین مرحوم کے ایک مضمون ''فکشن نگاری ایک لمحۂ فکریہ'' (مطبوعہ آئندہ'' اپریل تا جون ۲۰۰۶ء) سے چند اقتباسات دینا ضروری سمجھتی ہوں یہ مضمون اپنی نوعیت کا واحد مضمون ہے جس کے تحریر کرنے والے کو فکشن سے واقعی محبت تھی یوں ہی وہ اس کے منصب اور مقصد کے سلسلے میں فکر مند تھا۔ اس مضمون کے مطالعہ سے مجھے اپنے افسانوں پر اعتماد پیدا ہوا۔ ان کا سوال ہے کہ ہم افسانہ کیوں لکھیں۔ لکھتے ہیں:

> ''فکشن پر لکھنے والوں کی تعداد ہمارے ادب میں اب زیادہ نہیں ہے کل دس بارہ ہی معتبر نام ملیں گے۔ ان میں بھی کوئی ایسا لکھنے والا نہیں ہے جس نے تحقیق اور غور وفکر کے بعد یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہو کہ ناول وافسانہ وغیرہ کی ادب اور سماج میں اہمیت کیا ہے اور یہ کہ اگر کسی معاشرے میں فکشن نہ ہو تو اس کی تہذیبی تاریخ کس حد تک نامکمل سمجھی جائے گی۔ مستند لکھنے والوں نے بھی فکشن نگاروں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی''۔

فکشن ناقدین کی صف اول میں ممتاز شیریں، حسن عسکری اور وقار عظیم کو رکھنے کے بعد قیصر تمکین، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، وارث علوی اور علی عباس حسینی وغیرہ کا فقط نام لیتے ہیں اس کے بعد وہاب اشرفی اور علی احمد فاطمی کا سرسری ذکر کرتے ہیں پھر ذرا طنزیہ انداز میں لکھتے ہیں:

> ''دوسرے ادب دوستوں نے بھی فن افسانہ نگاری پر جو مضامین لکھے ہیں

ان میں بھی دوست نوازی کے جراثیم زیادہ ہیں''۔

اس کے بعد کچھ نیم مزاحیہ انداز میں فکشن پر خیال آرائی کا ''عمومی فارمولا'' بتاتے ہیں کچھ اس طرح کہ آپ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتے:

''فکشن محوِ ترقی ہے۔ تنقید نگار، اصل میں فہرست نگار کا فیصلہ۔ نہایت خوش آیند حالات ہیں۔ ہمارا فکشن بھی مغرب کے شانہ بہ شانہ محوِ ترقی ہے دو چار صفِ اوّل کے افسانہ نگار پھر نئے اور معروف افسانہ نگاروں کی دس گیارہ پر مبنی فہرست۔ بعض بعض افسانہ نگار مفید ناقدین کی خدمت بھی کرتے ہیں..... ناقدین اکثر اپنے ناپسندیدہ افسانہ نگاروں کو نظر انداز کرتے ہیں..... ان سب میں بہت کچھ ہونے کے باوجود یہ نہیں ہے کہ افسانے اور فکشن کی اہمیت کیا ہے۔ جب کہا جاتا ہے کہ شاعری پیغامبری کا جزو ہے تو افسانہ کہاں اور کس مرتبہ پر فائز نظر آتا ہے..... یہ نکتہ کہ ہم فکشن کو کس طرح سماج سدھار کے لیے استعمال کریں اب تک واضح نہ ہو سکا..... ڈرائڈن نے کہانی کو شخصیت سازی کا ذریعہ کہا تھا۔ تعلیم، اخلاق، سبق آموزی افسانہ کا اصل مقصد ہے۔ قدیم داستانوں اور ناولوں میں ''تہذیب نفس پر زور ہے، خیر و شر کے تضاد کی پیش کش ہے''۔

قیصر تمکین کے نزدیک فنِ افسانہ کو پایۂ امتیاز صرف ترقی پسند تحریک نے عطا کیا ''اس دور کے فکشن نگاروں نے فرقہ وارانہ فسادات کے خلاف مورچہ لگایا۔ سامراجی سازشوں کا پردہ چاک کیا۔ اس تحریک کا بنیادی عنصر تھا زندگی بردوش افسانہ جس نے معاشرتی سقائم کی تنقیص کی، مظلوموں کی آزادی کی حمایت کی''۔ وہ جدید افسانہ نگاروں سے جواب طلب کرتے ہیں کہ ''ان کے مسائل سے عصرِ رواں کے فکری نزاع کے حل کی طرف کیا اشارے ملتے ہیں۔ سماجی ناانصافیوں اور سامراج کے احیاء کے مظاہروں پر وہ خاموش کیوں ہیں۔ اقلیتوں کی نسل کشی پر قلم کیوں نہیں اٹھاتے''۔ ان کا خیال ہے کہ مشاہدے کی کمی اور فنی اخلاص کے فقدان نے افسانہ نگاروں کو ادب برائے ادب کا نمائندہ بنا کر چھوڑ دیا ہے''۔

یہ سب لکھنے کے بعد قیصر تمکین فکر مند ہو کر لکھتے ہیں:

''آج کا فکشن بنیادی مسائل اور حقائق سے گریزاں رہے گا تو پھر افسانے کو کہانی کا عنصر اور اس کے لیے قاری کہاں سے اور کیوں آئے گا۔ یہ شکایت غیر منصفانہ ہی ہوگی کہ کہانی کا قاری گم ہو گیا ہے بلکہ کہانی سے انسان ہی گم کر دیا گیا ہے۔ اس صورت میں جب کہ انسان کے دکھ درد وجہ تر ذد نہ رہ جائیں تو اچھا فکشن کہاں سے آئے گا۔ آج کے افسانے میں انسان کہاں ہے۔ آج فنکاری کی طرف کتنے اہل قلم محنت کرتے نظر آرہے ہیں۔ وہ جذبہ کہاں دکھائی دے رہا ہے جو پسماندہ ممالک کی معاشی وتہذیبی آزادی کی تحریکوں کا ساتھ دے سکے۔ اگر شاعری پیغمبری ہے تو فکشن دنیائے ادب کی خدائی ہے''۔

یہ مضمون پڑھ کر مجھے یہ مصرعہ یاد آیا کہ ''میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے''۔ حیرت ہے کہ یہ سب ان سے پہلے (یا بعد میں) اب تک کسی نے کیوں نہ کہا، اکثر سننے میں آیا کہ کسی تخلیق میں مقصد کی بات نہ کی جائے تو کہنا یہ ہے کہ مقصد کا برعکس لفظ تو بے مقصد ہوا۔ یعنی فضول!..... دھیرے دھیرے یہ احساس ہوا کہ مقصدیت کی مخالفت بس یوں ہی نہیں ہے۔ اردو ادب کے برباد شدہ منظرنامہ پر جو بھی ہلچل اور تگ و دو ہے وہ بچوں کی طرح انعامات لینے والوں کی ہے جو یکے بعد دیگرے اسٹیج پر لائے جاتے ہیں (یا زبردستی آتے ہیں) انعام لیتے ہیں اور پھر انعام دینے والے سے ایک خاموش وعدہ کر کے واپس ہو جاتے ہیں۔ زبان پر مہر لگانے کا وعدہ۔ قیصر صاحب مرحوم کے اس گراں قدر مضمون سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ اردو میں قابل ذکر فکشن تنقید لکھی ہی نہیں گئی افسانے کے مرتبے پر روشنی ڈالی ہی نہیں گئی اسی لیے وہ افسانے لکھے ہی نہیں گئے جن میں خدائی ہوتی، الوہیت اور Divinity ہوتی اور جو چند ایک ایسے افسانے لکھے بھی گئے ان کو بے رحمی سے نظر انداز کیا گیا۔ معتبر اور دیانت دار مقصدی فکشن ناقدوں کو بھی (جن کی تعداد بہت کم ہے) پس پشت ڈال دیا گیا!۔

احمد زین الدین (مدیر ''روشنائی'' کراچی) اپنی کتاب ''حرف پزیرائی'' میں شامل مضمون

''احمد سہیل کی ذہنی قلابازیاں'' میں بجا طور پر لکھتے ہیں:

''ہمارے یہاں آج تک بڑے ادیب یا شاہکار فن پارے کا تعین نہیں ہوسکا''۔

وہ کلیم الدین احمد کا یہ قول پیش کرتے ہیں:

''اردو میں اصول تنقید کی تشریح وترتیب ابھی تک نہیں ہوئی ہے۔ عالمی تناظر میں اپنے ادب کا جائزہ شاذونادر ہی لیا گیا ہے''۔

قیصر تمکین کے مضمون کا اتنی تفصیل سے جائزہ لینے اور احمد زین الدین کے مضمون کا حوالہ دینے کی ضرورت مجھے یوں پیش آئی کہ مجھے اردو فکشن (نیز اردو ادب) کے موجودہ منظر نامہ پر اپنی موجودگی کا احساس دلانا تھا، ''فہرست سازوں'' کے ذریعہ اپنے نام کے حذف کیے جانے کا جواز پیش کرنا تھا۔ ساتھ ہی یہ کہ اب وقت آگیا ہے کہ عالمی تناظر میں اپنے ادب کا ایماندارانہ اور مخلص جائزہ اردو کے ناقدین لیں!۔

اپنی دینی اور صوفی فکر کے تحت قیصر تمکین نے افسانے میں مقصدیت کی بات کی ہے۔ (اور دینی فکرو سچی مذہبیت ہی ادب کی روح ہے۔ سیاست ہی نہیں ادب سے بھی اگر ''دین جُدا'' ہوجائے تو فقط ''چنگیزی'' رہ جاتی ہے)۔ سامعین کے مجمع میں اور سنجیدہ ومعتبر قارئین وناقدین کے ذریعہ میری افسانوی تخلیقات کی پسندیدگی اور قبولیت اور ''فہرست سازوں'' کے ذریعہ میرے نام کا قصداً حذف کیا جانا معنی خیز ہے اور اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ قیصر صاحب مرحوم نے جو بھی اعتراضات فکشن نگاروں پر کیے ہیں اس زمرے میں میں نہیں آتی ہوں اس لیے کہ میرے افسانے خالص مقصدی ہیں ان میں ایک پیغام ہے، شخصیت سازی اور..... تہذیب نفس پر زور ہے، اصلاح معاشرہ کی کوشش ہے اور اصلاح معاشرہ کی کوشش کوئی فرسودہ معیوب عمل ہرگز نہیں ہے۔ اس کا مقصد زندگی کو اوپر اٹھانا، اسے خوبصورت بنانا، جینے کے قابل بنانا ہے۔ میرے افسانوں میں سبق آموزی ہے تاریک ذہنوں اور گمراہ مسافروں کے لیے۔ ان میں انسان کی بازیافت ہے۔ گمشدہ انسان (جو ادھر کافی عرصہ سے اردو افسانہ سے بیشتر غائب تھا)۔ یہ افسانے شائع ہونے کے علاوہ اکثر وبیشتر ادبی جلسوں خصوصاً بمبئی اور ابوظہبی کے جلسوں) میں خراج تحسین

حاصل کر چکے ہیں اور شائع بھی ہوئے ہیں (معتبر رسالوں میں) قیصر صاحب کا یہ مضمون پڑھ کر میں ان کو اپنا مجموعہ بھیجنے والی تھی کہ ان کے انتقال کی خبر پتہ چلی رنج ہوا۔

آج افسانہ سے انسان ہی گم کر دیا گیا ہے کہ مکمل اور اعلیٰ انسان آج کل احمق سمجھے جاتے ہیں، ان کو بے وقعت گردانا جاتا ہے۔ کامل انسان کا تصور عالمی ادب کا اہم ترین موضوع ہے۔ آج کے دور میں اخلاقی قدریں اپنی قیمت کھو چکی ہیں۔ بے حسی اور غنڈہ گردی، نفس پرستی اور ظلم عام ہو چکے ہیں کہ خون بہتا دیکھتے رہتے ہیں (نظر آنے والا اور نظر نہ آنے والا خون) اور آنکھ میں آنسو نہیں آتا، دل پر تکلیف نہیں ہوتی۔ اس مجموعہ میں شامل کہانیوں، افسانوں، تذکروں اور ''افسانہ پیکر ناول'' میں آپ کو وہ گم شدہ انسان ملیں گے۔ ''مٹی کا مادھو'' کا رام دلارے، ''لہر لہر سمندر'' کا سیتارام ''اپنا پرایا'' کا احمد، ''خالی جھولی'' کی محبت گزیدہ ماں، '' آئینہ کی تصویر'' اور ''غار'' کی مرکزی شخصیتیں (فرقہ وارانہ فسادات پر جن کے دل لہولہان ہیں، آنکھیں خونچکاں ہیں) ''دوسری دنیا کا باسی'' کی غیر مرئی، غیر دنیاوی، برگزیدہ ہستی جس نے بت شکنی کی تھی۔ وہ بزرگ جو گمشدہ انسان تھا جس پر پتھر پھینکے گئے لیکن وہ پتھر پھول بن گئے)۔ ''جنگل کی آواز'' کے دو مرکزی کردار جن پر اس دنیا میں عرصۂ حیات تنگ کیا گیا اور انھوں نے جنگل کی طرف مراجعت کی۔ جنگل جوان کے لیے جائے پناہ، باغِ عدن ثابت ہوا۔ دونوں شخصیتیں انسان کامل کے سب سے بڑے وصف آفاقی عشق سے مزیّن، اور حجاب کے طرز میں تحریر شدہ طرحی افسانوں کی کئی شخصیتیں جو دنیا کی موجودہ صورتِ حال پر بے حد افسردہ خاطر ہیں۔ یعنی نوری، نور، اور پُرنور وغیرہ۔ ان افسانوں کی خاطر خواہ پذیرائی کیوں ہونے دی جاتی جن میں اعلیٰ انسانی اقدار کی پیشکش ہے جو حق گوئی اور راست بازی، سچے اور دائروی علم و دینی فکر اور آفاقی عشق کو اپنے جلو میں لیے ہوئے ہیں۔

اس سب کے باوجود ملک اور بیرونِ ملک کے معتبر سامعین، قارئین اور ناقدین ایسے تھے (اور ہیں) جنھوں نے مصلحت پسندی اور خوف و ہراس سے دامن بچا کر، جرأت اور ایمانداری سے میرے افسانوں کی تفہیم کی ہے، قدر کی ہے۔ تیرہ سال کی عمر پر تحریر شدہ کہانی ''میراث'' سن کر سجاد ظہیر صاحب نے رضیہ آپا سے کہا تھا:

''نجمہ میں بڑا ادیب بننے کے جراثیم ہیں، پکی انقلابی ہے یہ لڑکی''۔

ایم۔اے سال اوّل ۱۹۶۵ء میں قاضی عبدالستار صاحب کی تشکیل کردہ ادبی انجمن ''راوی'' میں افسانہ ''ادھورے سپنے'' سنایا اس کی تعریف رضیہ آپا، عصمت آپا اور سرور صاحب پہلے ہی کر چکے تھے۔سرور صاحب کے مشورہ پر اس کا اختتام تبدیل کیا بعد میں عنوان ''پانی اور چٹان'' کر دیا۔مجموعہ بھی اسی نام سے شائع ہوا۔جلسہ میں افسانہ کو سن کر قاضی صاحب نے بہت تعریف کی اور کہا کہ یہ قرۃ العین حیدر کی یاد دلاتا ہے۔(ان کی تب کی رائے آخر میں دی گئی ہے)''آئینہ کی تصویر'' پڑھ کر اردو، انگریزی کے معتبر ناقد پروفیسر زیڈ۔اے عثمانی مرحوم کو کافکا کی یاد آئی۔رضوان احمد نے ''جیوتسنا'' کے افسانوی انتخاب میں شامل کیا ''سطور'' کے منتخب افسانوں میں اسے شامل کیا گیا۔''سطور'' میں کمار پاشی نے افسانوں کے انتخاب کے سلسلے میں اشتہار دیا تھا میں نے ایک خط کے ساتھ ''آئینہ کی تصویر'' انھیں بھیجا۔جواب میں انھوں نے لکھا کہ آپ کا خط پڑھ کر یقین آ گیا کہ آپ کے نام سے جو افسانے شائع ہوتے ہیں وہ آپ نے ہی لکھے ہیں۔میں حیران یا اللہ یہ کس نے اڑا دیا کہ مجھے کوئی لکھ کر دیتا ہے۔بہرحال ایسا نہ ہوا ہوتا تو ''سطور'' کے مدیر یہ بات کیوں لکھتے۔۱۹۸۳ء میں افسانہ بہ عنوان ''خالی جھولی'' افسانہ کے ایک سمینار میں پیش کیا قاضی صاحب کے منعقد کردہ سمینار میں اس وقت جو سازش چند کرم فرماؤں نے کی (وہ جنھیں میرے لیے سائبان ہونا تھا) مجھے افسانہ کے میدان سے برطرف کرنے کی اسے دہرانا تضیع اوقات سمجھتی ہوں اسے اپنے پہلے افسانوی مجموعہ ''پانی اور چٹان'' کے تعارف میں لکھ چکی ہوں۔افسانہ سن کر سامعین آبدیدہ ہوئے۔تعریف کے پُل بندھ گئے۔

میرا مقصد روح کے تاروں کو مرتعش کرنا، ضمیر کو جھنجھوڑنا تھا، زندگی کو اوپر اٹھانا، اسے خوبصورت بنانا تھا۔میرا مقصد بے حسی پر نکتہ چیں ہونا تھا۔وہ ایک حد تک پورا ہوا۔اصلاح کسی کی ہوئی، کوئی محروم رہ گیا۔بعد میں شہناز ہاشمی مرحومہ (استاذ شعبۂ انگریزی، ویمنس کالج) نے اس کہانی کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور ویمنس کالج میگزین میں شائع کیا۔سمینار میں ہوئی نکتہ چینی کی مخالفت کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ اس کا اختتام یہی ہونا چاہیے ورنہ کہانی کا مقصد ہی ختم ہو جائے گا نکتہ چیں ادب کی مقصدیت کے خلاف تھے)۔ابوالکلام قاسمی نے اس کہانی کو ماہنامہ

''الفاظ'' میں شائع کیا۔ اس قدر دانی کے باوجود میں ''ادبی سیاست'' اور سازشوں سے اتنی بد دل ہوئی کہ پندرہ سال تک افسانہ لکھنے کی تحریک نہ ہوئی (لیکن اس درمیان شاعری اور تنقید کے میدان سر کر کے حریفوں کو ہراساں کیا۔ چند تذکرے بھی لکھے) یعنی اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے۔ ایک مخلص، صوفی منش قدر دان نے عرفیؔ کا یہ شعر سنا کر میرے زخموں کا اندمال کرنے کی کوشش کی۔ (عرفی کی جگہ میرا نام رکھ کر)۔

عُرفی مکُن اندیشہ زغوغائے رقیباں
آواز سِگاں کم نہ کند رزق گدارا

بہر حال افسانہ کے میدان میں میرا داخلہ روک دیا گیا (بات ۱۹۸۳ء کی ہے) کسی ''پیڑھی'' میں شامل نہ ہوسکی اچھا ہی ہوا کہ (پیڑھی سسٹم سے نالاں رہی ہوں) کہ یوں محدود ہوجاتی ''صدیوں کو نہ سنائی دیتی''۔

اور گونجوں گا جو لوٹاؤ گے آواز مری
اتنا پھیلوں گا کہ صدیوں کو سنائی دوں گا

۱۹۹۸ء میں (یعنی پندرہ سال بعد) آل انڈیا ریڈیو کی طرف سے افسانہ پڑھنے کے لیے دعوت نامہ آیا (جب کہ کافی پہلے میں وہاں منع کر چکی تھی کہ مجھے افسانہ کے لیے نہ بلائیں کیوں کہ میرے اوپر یونیورسٹی میں تدریس اور گھر میں خانہ داری، بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی بے حد اہم ذمہ داریاں ہیں۔) بہر حال بادل ناخواستہ افسانہ لکھنے کا موڈ بنایا انھیں دنوں ورجینیا وولف پر اپنی پی ایچ ڈی کی تھیسس Virginia Woolfs Concept of Perfect Man شائع کر چکی تھی۔ اس تحقیق کی روح کو اپنے افسانے ''غار'' میں سمو دیا (کہ گہرا اور وسیع علم افسانے کا لازمی وصف ہے فقط معلومات کافی نہیں)۔ اس افسانہ کو فرقہ وارانہ فساد اور انسانوں کی نسل کشی پر چند بہترین افسانوں میں شمار کیا جانا چاہیے۔ یہ کسی گنتی شمار میں نہ رہا ''فہرستوں'' میں شامل نہیں کیا گیا اس کا بھی چنداں ملال نہیں۔ یہ آل انڈیا ریڈیو پر نشر ہوا وہیں پر مذاکرہ بھی ہوا جس میں مظہر امام اور ابوالکلام قاسمی وغیرہ شریک تھے۔ مثبت تنقید۔ دونوں رطب اللسان اس انوکھی تخلیق کو سن کر۔ میں سرشار (خاموش سامع) بعد میں قاسمی نے یہ بھی کہا ''عینی آپا کے یہاں بھی مذہبیت

ہے''۔ یہی افسانہ ابوظہبی کی ایک ادبی نشست میں سنایا۔ سامعین کے حلقہ میں محصور ہوئی اتنی تعریف وتوصیف کہ تقریباً عاجز ہوگئی اور سرشار بھی۔ شعبۂ عربی کے استاذ ثناء اللہ ندوی نے اس افسانہ پر گراں قدر تبصرہ لکھ کر دیا جس سے ان کے علم کی گہرائی اور وسعت مترشح ہے۔ (آخری صفحات میں اسے ملاحظہ کریں گے) ''آج کل'' اور ''تشکیل'' (کراچی) میں بھی ''غار'' شائع ہوا۔ (احمد ہمیش نے ''تشکیل'' میں میرے مجموعہ پر مثبت تبصرہ بھی کیا) لکھنؤ میں صبیحہ ناز لاری (جو دینی فکر سے مزین بہترین مقرر ہیں، اردو اور انگریزی ادب کا وسیع مطالعہ کئے ہوئے ہیں اچھی ادیبہ ہیں افسانہ نگار، مضمون نگار، ناقد اور میری ہم نوا وہم نفس) نے خواتین ادیباؤں پر مشتمل ایک سمینار لکھنؤ میں کیا اس میں انھوں نے مجھے بھی مدعو کیا۔ تب وہاں بھی میں نے یہی افسانہ (غار) پیش کیا اور سامعین کے درمیان محصور ہوئی۔ بہرحال افسانہ کے میدان میں پندرہ سال بعد میری واپسی خاصی دل خوش کن تھی (گویا اپنے گھر واپسی) لیکن دوڑ میں پچھڑ گئی (ویسے بھی دوڑ میں بچے ہی شریک ہوتے ہیں) خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم کا شعر ہے۔

یاروں نے خوب جا کے زمانے سے صلح کی
میں ایسا بد دماغ یہاں بھی پچھڑ گیا

لیکن اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ''افسانہ نگار'' کا ٹھپہ لگنے سے بال بال بچی اور سجاد ظہیر صاحب کی پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی۔

''نجمہ محمود میں بڑا ادیب بننے کے جراثیم ہیں'' اور یقیناً ہمہ جہت ''بڑا ادیب'' ہونا فقط یک جہت ''افسانہ نگار'' ہونے سے کہیں زیادہ اہمیت کا حامل ہے (اور یہ بات میں اعتماد سے کہہ رہی ہوں)۔

۱۹۹۹ء میں تخلیق ہوا ایک ''خوبصورت'' انوکھا افسانہ جسے صحیح معنی میں تانیثی افسانہ کہا جاسکتا ہے یعنی ''وجود کے سوتے سے جدا''۔ چونکہ سیمناروں کے دروازے ''خوف وہراس'' اور مصلحت کے تحت میرے لیے بند کرائے جاچکے تھے۔ اس لیے اس افسانہ کو اپنی ہی تشکیل کردہ ادبی انجمن ''حلقۂ ادب وجدان'' کے جلسہ میں پیش کیا۔ علم وادب سے سنجیدہ دلچسپی رکھنے والی خواتین قلمکار موجود تھیں اور اپنی تخلیقات پیش کی تھیں مرحومہ ہاجرہ نازلی، شہناز کنول، ضیاء فاطمہ اور سیما صغیر

وغیرہ۔ اول الذکر دو تو اپنے ناولوں اور افسانوں کے ذریعہ ادب میں اپنا مقام بنا چکی ہیں۔ (شہناز کنول میری ہم نوا ہم نفس ہیں۔ دینی فکر اور وسیع علم سے مزین ادیبہ۔ افسانہ و ناول نگار، نقاد، شاعر) بھی میرے اس افسانہ سے متاثر ہوئی تھیں اسے سراہا تھا۔ اس کا موضوع صحیح معنی میں تانیثی تھا (سرچشمۂ فیضان مولانا اشرف علی تھانوی کی دینی فکر) تنہا شریف خواتین کا المیہ، ان کا کرب۔ وہ خواتین (بیوائیں، خلع یافتہ و مطلقہ خواتین، عمر رسیدہ غیر شادی شدہ خواتین) جو اپنی عزت نفس اور شرافت کے تحفظ کی خاطر ''تل تل مرتی ہیں'' اور اس بے حس اور بے رحم معاشرے کو احساس تک نہیں ہوتا (معہ ''تانیثیت'' کے بے حس علمبرداروں کے) یہ افسانہ ''شاعر'' میں شائع ہوا''۔ تانیثی فکشن ناقدین' نے ایک معنی خیز خاموشی اختیار کی کیونکہ وہ لفظ 'فیمنزم' اور تانیثیت کے اصل مفہوم سے ہی واقف نہ تھے (گہرے اور دائروی علم اور دینی فکر کے فقدان کے سبب) نہ ہی اس لفظ کی عظمت و تقدس سے آگاہ۔ مصلحتوں کے تحت ان کی ''ذہنی ترجیحات'' تھیں!۔

میرے افسانوی مجموعے ''پانی اور چٹان'' پر دو عدد منصفانہ تبصرے شائع ہوئے (اور انصاف ہی نقد کا اہم ترین وصف ہے) دائروی علم کو خود میں سموئے ہوئے۔ پہلا ثناء اللہ ندوی اور دوسرا حقانی القاسمی کا۔ بیشتر ''فہرست نگاروں'' کو میں نے کتاب بھیجی ہی نہیں تھی یہ سوچ کر کہ مارکیٹ میں ہے تو ''فکشن ناقدین'' اسے خرید کر ضرور پڑھیں گے کہ نقد انتہائی اہم ذمہ داری ہے۔ ہاں مشتاق صدف نے بے شک اپنے مضمون 'معاصر فکشن نگار خواتین' (مطبوعہ ''ہمارا سماج'' نئی دہلی.....) میں میرا نام جیلانی بانو کے فوراً بعد رکھا میں ان کی بے خوفی اور دیانت داری کی قائل ہوئی اور ممنون ہوں۔ ایک ''نامور''، ''فکشن ناقد'' (جن کو ان کے ''نام'' کے زیر تحت مجموعہ بھیجا تھا) نے مصلحتاً اسے قابل اعتناء نہ سمجھا اور مجھے باور کرانے کی کوشش کی کہ میرے افسانے قارئین کے ''حافظہ سے محو'' ہو چکے ہیں۔ یعنی نسیان عام ہوا جو کہ تشویشناک صورتِ حال ہے!۔ ۲۰۰۹ء میں ''شاعر'' نے راقم الحروف کا گوشہ شائع کیا اس میں شہناز کنول کا مضمون ''وہ اپنی مشعل احساس لے کے جب نکلے'' شامل تھا خون جگر سے لکھا ہوا یہ مضمون میرے لیے مسرت بخش تھا جس نے مرہم سازی کی.....

میرے مختصر ترین افسانے (تذکرے) صحائف کی روح اور آہنگ کو خود میں سموئے ہوئے

ہیں۔''دوسری دنیا کا باسی''، ذکر ایک مشعل بہ کف اور قندیل بہ چشم کا'' وغیرہ میں مختلف النوع اصناف سخن باہم ضم ہیں الوہیت، ربوبیت اور روحانیت کو اپنے جلو میں لیے ہوئے۔ یہ ثابت کرتے ہیں کہ اگر''شاعری پیغمبری ہے تو افسانہ خدائی ہے''۔ ملاحظہ کریں خصوصی طور سے''ذکر ایک مشعل بہ کف اور قندیل بہ چشم کا''۔

اب میں اپنے ان افسانوں کا ذکر کروں گی جن کو جرأت مندانہ اور انوکھے تجربے کہا جاسکتا ہے۔ عجیب وغریب، فرحت بخش، زندگی بخش اور مرہم ساز۔ حجاب امتیاز علی کی طرز پر لکھے ہوئے طرحی افسانے۔ ایک شعوری کوشش کے بجائے تفنن طبع کا ذریعہ، فرحت بخش سرگرمی، ایک ذہنی ماحول کی تخلیق۔ حالات کی سنگینی سے خود کو محفوظ رکھنے کا ذریعہ۔ فطرت کی گود میں، (لمحاتی طور سے ہی سہی)، پناہ لینے کی سعی۔ ایک مراقبہ۔ یہ اردو میں ایک منفرد تجربہ ہے۔ طرحی غزل تو ہوتی ہے طرحی افسانہ کبھی نہ سنا۔ اردو کے کلاسیکی ادب اور تصوف کا مطالعہ کیے ہوئے سامعین و قارئین (جن کی حسِ مزح بدرجۂ اتم موجود ہے) ان افسانوں سے محظوظ بھی ہوئے اور متاثر بھی۔ شہناز کنول غازی اور صبیحہ ناز لاری ان''تفریحی'' افسانوں کی اوّلین سامع تھیں۔ خان جمیل (ایک غیر معروف صاحب علم اور صاحب ذوق ناقد) نے خط کے ذریعہ اپنی مخلص رائے کا اظہار کیا جس سے مجھے ان افسانوں کی اہمیت اور معنویت کا احساس ہوا (ان کی رائے آخر میں دی گئی ہے)۔ دبئی میں نجم الحسن رضوی (جن کا نام تعارف کا محتاج نہیں۔ اچھے افسانہ نگار، عمدہ صحافی، طنز و مزاح نگار) نے خلوص کے ساتھ ان افسانوں کی پذیرائی کی اور کروائی۔ مشتاق صدف نے''شاعر'' کے گوشہ میں ان افسانوں (اور دیگر افسانوں) کی پُرزور وکالت کی، کڑی حمایت کی۔ افسانہ سے ان کو واقعی دلچسپی ہے۔

کم عمری سے ہی حجاب سے متاثر رہی تھی عجب پُراسرار، ماورائی، طلسماتی و رومانی (لفظ رومانی کو انگریزی کی رومانی تحریک کی صفت کے مفہوم میں لیا جائے نہ کہ عامیانہ مفہوم میں) ماحول تخلیق کرتی ہیں اپنے افسانوں اور ناولوں میں۔ میں نے ۱۹۹۸ء میں اُن کو دوبارہ پڑھا (۱۲ کتابیں ان کی بہ یک وقت دستیاب ہوگئی تھیں)۔ ایک خواب ناک ماحول میں پہنچ جاتی، تفکرات سے نجات مل جاتی۔''تصویر بتاں''،''ظالم محبت''،''کالی حویلی''،''صنوبر کے سائے''،''یہ

بہاریں یہ خزائیں''اور''ڈھلتی شامیں'' (یہ افسانہ کم سنی میں پڑھ کر مسحور ہو چکی تھی)۔ان کی تحریروں میں دینی فکر، مذہبیت، زندگی سے، انسانیت سے شدید محبت، فطرت سے، خالق کائنات سے عشق، گہرا سماجی شعور، دردمندی، ساتھ ہی حسن مزاج۔ ایک آفاقی پیغام نظر آیا۔ امن عالم کا پیغام۔ پسندیدگی اتنی بڑھی کہ خیال آیا کہ ان کی طرز پر''طرحی'' افسانہ لکھوں (کیوں کہ نقالی میری روش نہیں) جو تجربہ تفریحاً کیا گیا تھا وہ پورے سات سال بعد منظر عام پر آیا (ماہنامہ ''شاعر'' میں شائع ہوا۔) پس وپیش اس لیے رہا تھا کہ تفننِ طبع کے لیے لکھی گئی نجی تحریر ہے اس پر نہ معلوم کیا ردِّ عمل ہو۔ بہر حال قصیدہ خوانیاں ہوئیں کچھ پر'' کلامِ نرم ونازک بے اثر'' بھی ہوا۔ کچھ افسردہ چہرے بھی کھلے جو کہ افسانوں کا بنیادی مقصد تھا۔ ساتھ ہی لمحۂ فکر یہ عطا کرنا تا کہ لوگ کچھ تو''غور وفکر'' کریں۔

کچھ نئے اور انوکھے کی دُھن میں ایک اور منفرد اور دلچسپ تجربہ یعنی''افسانہ پیکر ناول''، ''جنگل کی آواز''اور''صنوبر کے سائے تلے''۔لفظ''ناول''پر اپنی مختصر تحقیق کے تحت کہنا چاہوں گی کہ اس لفظ کے لغوی معنی کے مطابق چند تاریخی ناولوں (مثلاً شرر کا''فردوس بریں'') اور معروف خواتین ناول نگاروں کے رومانی ومعاشرتی ناولوں کے ماسوا (جن میں''ناول'' کے لغوی معنی کے مطابق مہجور جوڑوں کا ملاپ ہوتا ہے) اردو میں ناول لکھے ہی نہیں گئے (جو لکھے گئے ان کو کوئی دوسرا بھلا سا نام دیا جا سکتا ہے)۔ ان خواتین ناول نگاروں کے ناولوں میں جو نام سب سے پہلے ذہن میں آتا ہے وہ جمیلہ ہاشمی کا''دشت سوس'' ہے جس میں مہجور جوڑے کا روحانی ملاپ ہے۔ ان خواتین ناول نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے ان میں جو ناول مجھے ذاتی طور پر زیادہ پسند رہے ہیں وہ حجاب امتیاز علی کا''ظالم محبت''، رفیعہ منظور الامین کا''عالم پناہ'' اور شہناز کنول کا''شہابی'' وغیرہ۔ مہجور جوڑوں کے روحانی ملاپ کی وجہ سے۔ کہ عقد جو اگر''سرودِ حیات'' ہے تو وہ روحانی ہم آہنگی کی وجہ سے ورنہ تو.....)

لفظ ناول کا نقطۂ آغاز قرونِ وسطیٰ کے تخیلی افسانوں (Romances) میں ملتا ہے جن کا موضوع عشق اور مہم جوئی ہوا کرتا تھا اور جن کی جڑیں قدیم یونان میں دوسری اور تیسری صدی قبل مسیح میں تخلیق کئے گئے طویل بیانیہ Romances میں پیوست ہیں جو مہجور جوڑوں کی روئداد اور پھر ان کے ملاپ کے موضوع پر مبنی ہوتے تھے مثلاً ہیلوڈورس کا رُومینس-Ethiopica، بوکاشیو کا

ڈیکامیرن Decameran نثر میں ایسے تخیلی افسانوں کی پہلی مثال ہے۔ اطالوی میں ایسے افسانے ناویلا کہلائے یعنی انوکھے، نرالے اور حقیقی زندگی سے ہٹے ہوئے۔ ویبسٹر -Webster (جس نے اپنی انگریزی لغت میں الفاظ کی جڑوں اور ماٰخذ کو تلاش کیا) کے نزدیک ناول، قدیم فرانسیسی اور لاطینی لفظ 'ناویلس' سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی بھی یہی ہیں یعنی نیا، انوکھا، نرالا، عجیب و غریب..... انوکھا خیال یا تجربہ جس سے لوگ پہلے لاعلم رہے ہوں..... لفظ ناول کی دوسری لغوی تشریح۔ ''افسانوی کہانی جو پوری زندگی پر محیط، کئی جلدوں پر مشتمل ہو'' (جو پوری زندگی کئی ہزار سال کی تاریخ پر بھی مبنی ہوسکتی ہے) جب کہ ایک ذرّہ میں ساری کائنات، پورا انسانی وجود اور ایک لمحہ میں سارا وقت، ساری انسانی تاریخ، ماقبل تاریخ اور ماورائے تاریخ سمائی ہوئی ہے۔

یہ ایک عام خیال ہے کہ آج کے مشینی دور میں ضخیم ناول پڑھنے کے لیے کسی کے پاس وقت نہیں ہے۔ صارفیت کے اس دور میں، جب کہ ''نیٹ کیفے سے پیدا شدہ بحران'' نے افراد کو اپنے حصار میں قید کرلیا ہے، ناول کو اپنے اوّلین، بنیادی اور لغوی مفہوم کو پیش نظر رکھ کر ہی (یعنی نرالا، انوکھا اور عجیب جس سے لوگ لاعلم رہے ہوں) تخلیق کیا جانا چاہیے ضخامت لازمی وصف نہ ہو) اور اسے اتنا انوکھا ہونا چاہیے کہ انٹرنیٹ کے باوجود صفحۂ قرطاس پر نظر مرکوز کرنے کے لیے قاری بے چین ہوجائے۔ ایسا نادر فن پارہ جو عصری حسیّت کو خود میں سموئے ہوئے ہو ساتھ ہی جو ''وارفتگی ومحویت و نغمگی کی ایک ایسی خوابناک دنیا میں قاری کو کھینچ لے جائے جہاں چہار سمت مسرت و انبساط کی روشنی بہہ رہی ہو، جو اس کے رگ وپے میں سرایت کرجائے۔'' اسے سکون بخش سکے اور تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی وہ وجود کے کرب سے نجات حاصل کرسکے۔ اس میں سرشاری کی کیفیت اور جمالیاتی حظ پیدا ہوسکے۔

ناول کے مختصر اور اپنے اوّلین مفہوم کے مطابق ہونے سے قاری کو دیگر فنکاروں کی تخلیقات کو پڑھنے اور ان سے حظ اندوز ہونے کا موقع مل سکے گا۔ ویسے تو ناول کی موت کا اعلان کیا جاچکا ہے۔ ''نوبل انعام یافتہ'' ناپال کے نزدیک آج کی دنیا کو تخیل کی نہیں حقیقت کی ضرورت ہے (یعنی اس نے تخیل کو برطرف کردیا ہے) جب کہ تخیل کی بنیاد زمین پر ہے) حقیقت پر ہے، بہر حال یہ تو ذہنی ترجیحات کا معاملہ ہے۔

میرا یہ ناول عالمی سطح کے بحران کا نتیجہ ہے جس نے دنیا کو جہنم بنا کر رکھ دیا ہے جس میں سچ کے لیے دار ورسن ہیں (اور کب ایسا نہیں تھا؟) یہ ''نرالی'' انوکھی، اور عجیب تخلیق جسے میں نے 'ناول' کہا ہے دراصل میرے کئی سو صفحات پر مشتمل ضخیم ناول کا پہلا باب ہے اور جسے شائع کرنے میں پس وپیش یوں ہے کہ اتنا طویل ناول پڑھنے کے لیے کس کے پاس وقت ہوگا (یہ شکایت نہیں قارئین سے ہمدردی ہے'') یہ نرالی تخلیق یعنی ''جنگل کی آواز'' جسے ''افسانہ پیکر ناول'' بھی کہا گیا ہے، مخلص اور صاحب بصیرت ناقدین، قارئین اور سامعین کے ذریعہ استناد حاصل کر چکی ہے۔ اس پر سیّد حامد صاحب کی رائے کو میں حرف آخر سمجھتی ہوں! اسے ''مشہور'' ناقدین کی سند کی ضرورت نہیں۔ عالمی ادب کا اہم ترین موضوع انسان رہا ہے۔ عمدہ، اعلیٰ، مکمل انسان، اس تخلیق کے دونوں مرکزی کردار مکمل انسان ہیں آفاقی عشق، رحم اور گہری انسانی ہمدردی کو خود میں سموئے ہوئے۔ ان کی نگاہیں لہولہان انسانیت کے لیے خونچکاں ہیں۔ یہ ایک ''قصۂ کہنہ'' کی تجدید بھی ہے جسے آج کی دوڑتی بھاگتی زندگی نے فراموش سا کر دیا ہے۔ یہ تخلیق بارود کے ڈھیر کو چمن زار، سمن زار میں تبدیل کرنے کے خواب پر مشتمل ہے، باغ عدن کا خواب، گمشدہ جنت کا خواب۔ اس کا موضوع آفاقی عشق اور اعلیٰ انسانی اقدار ہیں۔ اس کے سرچشمہ ہائے فیضان ہیں۔ اقبال اور مشرقی صوفیاء کا تصور انسان کامل، خلیل جبران کا عربی قصیدہ ''المواکب''، شیکسپیئر کا طربیہ ڈرامہ As You Like it ورڈز ورتھ کی نظمیں The Prelude اور Tintern Abbey، سید حامد صاحب کی نظم ''خانہ بدوش کا گیت''، حجاب امتیاز علی کے افسانے و ناول، جمیلہ ہاشمی کا ناول ''دشتِ سوس'' اور سب سے بڑھ کر مولانا روم کا یہ شعر۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند

وز جدا یہاں شکایت می کند

(بانسری روح انسانی سے سن وہ کیا حال بیان کرتی ہے اور اپنے ہجر و فراق کی کیا شکایت کرتی ہے)

علاوہ ازیں محسن کاکوروی کا وہ قصیدہ جس کا مصرعہ ہے ''سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل'' (فطرت کے سحر خیز حسن سے لبریز) اور کرشن کی بانسری۔ وحدت کا مرکز..... چراغ سے

چراغ سدا سے جلتے آئے ہیں۔

حجاب کی طرز میں تحریر کردہ طویل طرحی افسانہ ''صنوبر کے سائے تلے'' جسے میں نے مہجور جوڑے کے (روحانی) ملاپ کی وجہ سے ناول کہا ہے مجھے نجی طور سے پسند ہے۔ اس کو میں نے خون جگر سے لکھا ہے۔ اس پر سید حامد صاحب کی رائے کو میں حرف آخر سمجھتی ہوں۔ وہ تنقید کے اصل منصب سے پوری طرح واقف ہیں۔

اپنی تخلیقات کے سلسلے میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ ان کے پیچھے فقط خلوص ہے، خون جگر کی آمیزش ہے۔ یہ حق کی تلاش ہیں خود اپنی تلاش ہیں۔ یہ صحیح معنوں میں ترقی پسند اور جدید ہیں کیوں کہ ان کا رشتہ قدیم سے بہت گہرا ہے۔ ان میں مختلف علوم کا انجذاب ہے (ان میں اساطیر بھی ہیں۔ اخلاق بھی، تصوف اور نفسیات بھی ہے اور فلسفہ، تاریخ اور ماقبل تاریخ بھی) ان میں ''رومانیت کی زیریں لہریں'' ہیں۔ ان میں اعلیٰ انسان کا تصور ہے اور یہ آفاقی عشق سے لبریز ہیں۔

ادب کا مقصد انتہائی عظیم ہے (نہ انعام و اکرام، نہ شہرت اور نہ 'recognition'........ ادب اور انسانیت کی خدمت اپنے آپ میں سب سے بڑا انعام ہے۔ ادب سارے علم کی روح ہے، زندگی کی تشریح ہے، تعبیر ہے۔ زندگی کو سنوارنا، اسے اوپر اٹھانا، تہذیب نفس، شخصیت سازی ہی اس کا اصل مقصد ہے اور ہونا چاہیے۔ ساتھ ہی جمالیاتی حظ اور سرشاری کی کیفیت پیدا کرنا جو زبان پر قدرت اور اسلوب کی خوبصورتی کے بغیر ممکن نہیں حسن الوہی صفت ہے اس لیے سرشاری پیدا کرتا ہے۔ اس کے برعکس سوچنا ادبی بددیانتی ہے۔ ادب کو سستی شہرت اور حصول زر کا وسیلہ ہرگز نہ ہونا چاہیے۔ ہوس زندگی کو بدصورت بنا دیتی ہے جن کے مقاصد بلند ہوتے ہیں، جن کی نگاہیں آسمان کی رفعتوں پر رہتی ہیں وہ خلوص سے، خاموشی سے کام کرتے ہیں، خودنمائی اور شہرت کی خواہش اور کوشش عدم تحفظ، خوداعتمادی کے فقدان اور یوں کمزور شخصیت کی دلیل ہے۔

میرا مقصد یہ ہے کہ آپ میرا مافی الضمیر سمجھیں میرے خلوص پر یقین کریں ادب کا اصل مرتبہ سمجھیں اور اس کے ذریعہ موجودہ زوال پذیر معاشرہ کو بدلنے کی کوشش کریں، انقلاب لائیں اپنی تحریروں کے ذریعہ وقت کے دھاروں کا رخ موڑ دیں۔ ایک خوبصورت، صحت مند معاشرہ کی تشکیل کریں جس میں مجرم دندناتے نہ پھریں، جس کی بنیاد اعلیٰ انسانی اقدار پر ہو ایسا معاشرہ جس

میں ظلم، بے ایمانی اور ناانصافی نیست و نابود ہو جائیں، جس میں نیک، مخلص اور ایماندار متنفس عزت اور سکون سے جی سکیں، حق داروں کو ان کا حق ملے، ان کو فریب اور دھوکہ نہ دیا جا سکے، ان کے وجود سے لہو نہ ٹپکے، ان کی جڑیں نہ کاٹی جائیں۔ اور ایسا معاشرہ آپ قلم کے زور سے قائم کریں۔ ''قلم گوید کہ من شاہ جہانم'' ...... قلم جو سب سے زوردار ہتھیار ہے۔ کہانیاں کہیں۔ کہانیاں سنیں کہ کہانی سنی ہی جانے والی چیز ہے (دوست نوازی کے تحت منعقد کیے گئے سمیناروں سے خود کو محفوظ رکھیں)۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنی عزت نفس اور شخصیت اور کردار کی حفاظت کریں۔

اور اب میں اپنے پچھلے افسانوی مجموعہ ''پانی اور چٹان'' کے تعارف کے آخر میں کہی گئی اپنی ایک بات کو، ایک فقرہ کے اضافے کے ساتھ، دوہرانا چاہوں گی جو یوں تھی:

> ''اور راقم الحروف یہ وعدہ کرتی ہے، دنیا کے سارے قلم کاروں سے، کہ اگر عالمی سطح پر آپ نے ایک مثالی معاشرہ قائم کر دیا تو وہ قلم رکھ دے گی اور فقط ایک گوشۂ تنہائی میں، ایک چھوٹے سے حجرے میں، جس کے چہار سو، پھول کھلتے ہوں، پہاڑوں کے سلسلے ہوں، جھرنے گیت گاتے ہوں، طیور نغمہ ریزی کرتے ہوں ہوائیں گنگناتی ہوں وہ انتہائی مسرور و شاداں، مطمئن اور پُرسکون ہو گی اور کوئی اس کا نام بھی نہ جانتا ہو گا کہ وہ گم نام ہی رہنا چاہتی ہے.....!''

○

ریگستان میں جھیل

نجمہ محمود

دس سال کی عمر میں شعر لکھا تھا:

چاند کے گرد حسین ہالہ ہے
اور ستارے بھی ہیں کتنے روشن

آسمان پر دائروی چاند روشن تھا...... پراسرار، فسوں خیز دائروی چاند......اور اس کے گرد ہالہ! اور ٹمٹماتے ستارے...... اُن ہی لمحوں میں یہ شعر وارد ہوا جو کسی کو کبھی بھی سنایا نہیں گیا......نہ ہی اُسے سنجیدگی سے لیا گیا......

دُور کہیں آم کے باغوں میں کوئلیں کوُکتیں جو وجود کو سرشار کر دیتیں...... بارش رم جھم، رم جھم برستی، بادل گرجتے، بجلی چمکتی تو شدت سے محسوس ہوتا کہ خود بارش ہوں، بجلی ہوں، بادل ہوں......!

مندرجہ بالا شعر کے بعد طویل عرصہ تک کوئی شعر نہیں کہا......قصبہ (ملیح آباد) کا سخت پردہ نشین ماحول، گھر میں دینی ماحول...... خاندان میں کوئی شاعر نہ تھا (شکر ہے) جوشؔ صاحب چچا زاد بھائی کے ہم زُلف تھے...... جب بھی ملیح آباد آتے تو عموماً ان کی ہی رہائش گاہ پر قیام کرتے......شعری نشستیں منعقد کی جاتیں......والد صاحب کی جوشؔ صاحب سے دوستی تھی تو از راہِ مروّت وہ کسی نشست میں شرکت کر لیتے (شاعری سے ورنہ اُن کو کوئی دلچسپی نہ تھی) ایک بار والد صاحب اور بھائی کے ساتھ میں بھی ایک نشست میں شریک ہوئی تھی (شاید ۹ سال کی عمر میں...... دس سال کی عمر میں خود عائد کردہ پردہ ہونے سے پہلے)۔ جوشؔ صاحب نے اپنی گھن گرج آواز میں کلام سنایا تھا......جو شعر کانوں میں گونجتا ہے وہ شاید یہ رہا ہو......

ملا جو موقع تو روک دوں گا جلال روزِ حساب تیرا
پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا عتاب تیرا

یا ممکن ہے وہ نظم سنائی ہو جو یوں شروع ہوتی ہے

(عنوان یاد نہیں)

نظر جھکائے عروس فطرت جبیں سے پلکیں اٹھا رہی ہے

سحر کا تارہ ہے زلزلے میں افق کی لَو تھرتھرا رہی ہے

ممکن ہے چاند ستاروں کے بارے میں لکھا ہوا وہ شعر اسی نظم کا مرہون منت ہو واللہ اعلم......

گھر میں شعر و شاعری کا ماحول نہیں تھا۔ اماں بے شک اکثر کلیات اقبال پڑھتی نظر آتیں۔ بلند آواز میں شعر پڑھنا تقریباً ممنوع تھا۔ گھر میں کوئی فحش، ناشائستہ لفظ یا جملہ بولنے یا لکھنے کی اجازت نہ تھی (الحیا من الایمان) روز مرّہ زندگی اور ادب میں جذبات کا ترفع اور Sublimation لازمی ہے...... تہذیب اسی کا نام ہے! کچھ عمر بڑھنے پر تاریخی اور معاشرتی ناول زیر مطالعہ رہے۔ شرر، صادق، سردھنوی، نسیم حجازی، اے۔ آر خاتون، منشی فیاض علی...... اے حمید کے ناول ''جنگل روتے ہیں'' نے بہت متاثر کیا...... ان سب کے علاوہ جاسوسی دنیا...... ہائی اسکول میں اردو لی تھی (پرائیویٹ طالبہ تھی) انگریزی بھائی نے پڑھائی تھی۔ آٹھویں جماعت میں ہی بارہویں جماعت کی نظمیں پڑھا دی تھیں۔ باقی انگریزی شاعری میں عموماً غزل والی بات نہ تھی۔ اسے پڑھانے میں بھائی کو تامل نہ تھا۔ لیکن اردو غزل...... کیسے پڑھاتے...... اردو کی نصابی کتاب فقط ایک بار سرسری طور سے پڑھ ڈالی۔ بیشتر اوقات میں مختلف رسائل واخبارات کا مطالعہ......

''ادب لطیف''، ''نقوش''، ''شاہراہ''، ''ماہ نو''، ''نقوش''، ''آئینہ''، ''قومی آواز''، ''نیشنل ہیرالڈ'' وغیرہ...... حجاب امتیاز علی کا فسوں خیز افسانہ ''ڈھلتی شامیں'' (مطبوعہ ''ماہ نو'' کراچی) وجود پر چھا گیا۔ جیلانی بانو کی کہانی ''فصل گل جو یاد آئی (مطبوعہ آئینہ) سرچشمۂ فیضان ہوئی، قرۃ العین حیدر کے افسانے ''جہاں پھول کھلتے ہیں'' نے مسحور کیا، کرشن چندر کا افسانہ ''زندگی کے موڑ پر'' آج بھی اُسی ماحول میں پہنچا دیتا ہے جس کی خوبصورت عکاسی اس میں کی گئی ہے...... تراجم کے ذریعہ عالمی فکشن...... تخیل وسیع ہوا۔

کمی تھی کیا خوبصورت شہ پاروں کی جو نصاب کی ایک ہی کتاب کا ورد کرتی۔ شاعری والا حصہ تیار ہی نہیں کیا۔ فرسٹ ڈویژن کے باوجود اردو میں نمبر کم یعنی ۵۸ فیصد جس پر حیرت ہوئی کہ

اتنے بھی کیسے آ گئے۔ کرامت حسین مسلم کالج میں انٹر اور بی۔ اے میں رضیہ آپا، ریحانہ باجی اور مس حتان نے اردو اور فارسی شاعری پڑھائی چنانچہ امتیازی نمبر حاصل کیے۔ ہاسٹل میں بیت بازی کی محفلیں جمتیں...... میر، غالب، اقبال، فیض، ساحر، مجاز وغیرہ از بر ہوئے۔ ساتھ ہی شیکسپیئر اور خلیل جبران وجود پر چھائے، ٹیگور کی گیتا نجلی نے مسحور کیا۔ بی۔ اے کے دوران شیکسپیئر کے ۲۸ ڈرامے پڑھ ڈالے...... اس کے ڈراموں کی شاعری نے تخیل کو مزید زرخیز کیا۔

یہ سب لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ گھر میں شاعری کا ماحول نہیں تھا چنانچہ یہ بات دور از قیاس تھی کہ میں شاعری کر سکتی ہوں۔ جن افسانوں کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے مثلاً ''ڈھلتی شامیں'' وہ بھی بیش تر شاعری ہی تھے۔ تک بندی نہ سہی۔

افلاطون نے شاعروں کو اپنی آدرش ریاست سے باہر نکالنے کی بات بجا طور پر کہی تھی۔ (اُسے ''شاعرات'' کو بھی شامل کرنا تھا) شکر ہے ناچیز ''شاعرہ'' نہیں ہے۔ افلاطون شاعری کے خلاف کیوں ہوتا اس نے خود اپنی اکثر نثری تحریروں میں خوبصورت شاعری کی ہے! اب میں یہ بتانا ضروری سمجھتی ہوں کہ میری منظوم شاعری کی ابتدا کیوں کر ہوئی ورنہ نثر میں شاعری میں نے اکثر کی۔

ایم اے (انگریزی) سال اوّل کی طالبہ تھی (۱۹۶۵ء) مسلم یونیورسٹی کے عبداللہ ہال کے پر دوسٹ آفس سے نیو ہاسٹل اپنے کمرے پر جا رہی تھی شام جھک رہی تھی۔ اچانک تیز ہوا چلنے لگی...... سرسراتی ہوئی، درختوں کی جھومتی شاخیں، برستی بوندیں، سیاہ گرجتے بادل اور میں تیز قدمی سے پگڈنڈی پر گامزن! ایک سرشاری کی کیفیت پورے وجود پر طاری...... اُن دنوں انگریزی کی رومانی شاعری کا مطالعہ کر رہی تھی۔ ورڈز ورتھ، شیلی، کیٹس اور کولرج ذہن و روح پر چھائے ہوئے تھے خصوصاً ورڈز ورتھ جس نے کہا تھا......

The world is too much with us late and soon,
Getting and spending we lay waste our powers,
Little we see in Nature that is ours,
We have given our hearts away a sordid boon.

ان ہی لمحوں کے شدید عارفانہ جذبات و محسوسات کمرے پر پہنچ کر ڈائری میں قلم بند کیے۔
''شام کے سائے گہرے ہوتے جاتے ہیں۔ سیاہ بادل اُمڈ رہے ہیں سائیں سائیں کرتی

ہوائیں بہہ رہی ہیں اور ایک سرشاری کی کیفیت پیدا کر رہی ہیں ...... اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے...... پورب کی طرف دور، بہت دور آسمانوں میں بجلی لہرا رہی ہے جو پراسرار ہے...... اپنی ہستی کو آسمانوں کی بے کراں وسعتوں اور پنہائیوں میں کھو کر یہ جاننے کی شدید خواہش ہے کہ آخر یہ نگاہوں کو خیرہ کرنے والی روشنی کیوں اور کیسے پیدا ہوتی ہے...... یہ سیاہ بادل جھوم جھوم کر کیوں اس طرح گرجتے برستے ہیں، ہوائیں سیٹیاں کیوں بجاتی ہیں، پراسراری آواز پیدا کر کے وجود کو تحلیل کیوں کرتی ہیں، فطرت کے ان سربستہ رازوں کو معلوم کرنے کے لیے بے قرار ہو جاتی ہوں۔ ایک پگ ڈنڈی پر تنہا چلتی ہوئی، تیز ہواؤں، آسمان کی اتھاہ گہرائیوں میں سماتی ہوئی بارش کی موسیقی سے سرشار ہوتی میں کون ہوں، کیا ہوں...... یہ سربستہ راز مجھے کون بتائے گا، کون سمجھائے گا؟

اور پھر بعد میں اس شاعری کو نظم کی صورت دی بہ عنوان ''راز سربستہ'' اور حیرت زدہ رہ گئی۔ یہ میری پہلی نظم تھی (ورنہ شاعری تو غیر شعوری طور پر میں بچپن سے کر رہی تھی!)

اس نظم کو نیو ہاسٹل کی لٹریری سوسائٹی (جس کی میں سکریٹری تھی) کی طرف سے منعقد کی گئی ''شام غزل'' میں پیش کیا۔ اس میں علی گڑھ کے نمایاں شعرا موجود تھے۔ اس نظم کے ابتدائی مصرعے ہیں:

فضا مسحور کن ہے آسماں پر گہرے بادل ہیں
اندھیرا بڑھتا جاتا ہے ہوائیں تیز چلتی ہیں

قارئین کو شاید تعجب ہو کہ یہ نظم چالیس سال کے بعد (۲۰۰۷ء) میں ماہنامہ ''شاعر'' میں شائع کروائی...... لکھ کر جو دلی مسرت اور طمانیت محسوس ہوئی تھی وہ اتنی بھرپور تھی کہ اشاعت کا خیال ہی نہ آیا نہ ہی ضرورت محسوس کی...... اس مجموعہ کی کئی نظمیں بہت پہلے کی ہیں ان کی اشاعت میں تامل تھا لیکن پھر مجموعہ اور مختصر ہو جاتا۔ کسی نے مجھ سے کہا ''آپ رومانی نظمیں نہیں لکھتیں'' اب کیا کہتی کہ ''راز سربستہ'' رومانی نظم ہی ہے کیسے کہتی کہ جذبات و محسوسات کا ترفّع کسے کہتے ہیں...... کاش ضخیم مجموعے شائع کرنے کی اہل ہوتی لیکن ان میں تکرار ہوتی۔ تعداد اور ضخامت کو معیار نہیں مانتی۔ ضخامت کے پردے میں اکثر سرقے بھی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ قارئین کا وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ، ان کا دھیان مستقل اپنی ہی طرف لگائے رکھنے کی کیا ضرورت ہے...... سروں کو گننے سے

بہت زیادہ مستحسن ہے سروں کوتولنا۔لیکن فی زمانہ ''عوام الناس'' کو گننے میں دلچسپی زیادہ ہے تولنے میں کم اور ایمان داری سے تولنے میں اس سے بھی کم۔ کتابوں اور اعزازات وانعامات کی طویل فہرستیں فقط ایک ہی نام کے ساتھ دیکھ کر اپنی کم مائیگی کا احساس کم ہوجاتا ہے (میری یہ بات غور وفکر کی متقاضی ہے)...... فالتو وقت اگر زبان وادب کی ذاتی طور سے تدریس،عزت نفس سے مزین ہونہار تخلیق کاروں کی تلاش،ان کی اخلاقی تربیت،گمشدہ تخلیق کاروں کی بازیافت پر صرف کیا جائے تو یہ کارنامہ ہوگا۔(میری بات سمجھنے کے لیے ذہن رسا اور خلوص چاہیے)

ورڈزورتھ کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اگر اپنی ۶۔۷ نمایاں نظمیں ہی لکھتا تو بھی اس کا قد اتنا ہی بڑا ہوتا جتنا ہے (مثلاً Tintern Abbey ،اور Daffodils وغیرہ۔ کیٹس کو لافانی بنانے کے لیے فقط Ode to a Nightingale ہی کافی تھی۔میرے اس مجموعہ میں فقط ۶۔۷ نظمیں ہی قابل اشاعت تھیں لیکن جب تعداد اور ضخامت ہی معیار ہو تو مجبوراً دیگر نظمیں بھی شامل کرنی پڑیں..... ویسے بھی اشاعت کے سلسلہ میں بے دلی سی رہی کیوں کہ سنا ہے کہ آج کل شاعری کے مجموعوں کو لوگ ملتے کے ساتھ ہی کنارے رکھ دیتے ہیں.....

جب یہ محسوس ہوا کہ تخلیق کار فقط اپنی تسکین کے لیے نہیں دوسروں کے لیے بھی لکھتا ہے تو اشاعت کے بارے میں سوچا چند نظمیں رسائل میں شائع کرائیں جیسے شاعر ''عصر آگہی''، آج کل ''بزم سہارا''، ''امکان''، ''تشکیل'' وغیرہ۔

جن نظموں کو میں ذاتی طور پر پسند کرتی ہوں اور جن کو سامعین اور قارئین نے بھی پسند کیا ان میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں:

..... ''گہرائیوں کا خوف''، ''رازِ سربستہ''، ''ریگستان میں جھیل''، ''نئے انسان کا جنم''، ''تم جو سچ کے امیں''، ''مدر گاڈیس''، ''فن اور فنکار''، ''بے زنجیر جستجو''، ''شجر سایہ دار''، ''بدلتے ہوئے موسموں کے رنگ''، ''پانی کی دیواریں''، ''وجود کے درخت کی...'' (غزل) اور یہ شعر.....

منظر بہت عجیب تھا ہم کھو کے رہ گئے
دوری پہ آبشار تھا ہم رو کے رہ گئے

قارئین سے گذارش ہے کہ مجموعہ کنارے رکھنے سے پہلے ان نظموں کو ضرور پڑھ لیں اور

اب جو میں کہوں گی اس سے استدلال کے ساتھ اختلاف کیا جا سکتا ہے کیوں کہ ''تلاشِ حق میں ہم اختلاف بھی کرتے ہیں اور اتفاق بھی''.....

شاعری کسی خاص لمحے کو گرفت میں لانے کا نام ہے..... تیرتے، بہتے ہوئے لمحوں کی گرفت ان کو لازوال بنانے کے لیے..... شاعری کو ''انسان کا بہترین کلام''، ''مکمل ترین گفتگو'' کہا گیا، ''علم کی روح'' کہا گیا..... اور ''شاعری جزویست از پیغمبری''......

شاعری کی اہمیت مسلم ہے خواہ وہ نظم کے پیرایہ میں ہو یا نثر کے پیرایہ میں۔ علم اور تجربے کی گہرائی، تخیل کی فراوانی وزرخیزی علامات واستعارے..... نثر اور شاعری کی حدِ فاصل کو بڑے فنکاروں نے یکسر ختم کیا..... رومیؔ، دانتےؔ، شیکسپیئرؔ، خلیلؔ جبران، اروند گھوش، ورجینا وولف وغیرہ نے شاعری اور کہانی کو یکجا کیا..... حجاب امتیاز علی، کرشن چندر، جمیلہ ہاشمی اور قرۃ العین حیدر نے بھی یہی کیا..... شاعری کے لیے وزن، بحر، قافیہ قطعاً لازمی نہیں ہے۔ ایک شعر سنیے۔

ہاتھی کو بڑا کیا بڑا تھا
لٹھے کو کھڑا کیا کھڑا تھا

کوئی بتائے کہ اس میں وزن، بحر، قافیہ کے سوا اور کیا ہے؟ اس میں شاعری کہاں ہے؟ شاعری کے لیے تو الفاظ کی قیدوبند کی بھی ضرورت نہیں... کہ ... برستی بارشوں میں، گرجتے بادلوں میں، چمکتی، لہراتی بجلیوں میں، کوہساروں، آبشاروں میں، چشمہ کے پانیوں میں سمندر کی لہروں میں، سرسراتی ہواؤں میں، چٹکتی کلیوں، مہکتے پھولوں، درختوں کی جھومتی شاخوں طیور کے نغموں اور مور کے رقص میں بھی شاعری ہے.....!

یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم کسی شے میں حُسن، معنی اور موزونیت تلاش کر سکتے ہیں کہ نہیں۔ ورنہ تو ''مردِ ناداں پر کلام نرم ونازک بے اثر''!.....

اگر کسی تخلیق کار نے نبض انسانی پر ہاتھ رکھا ہے۔ اگر اس کے فن میں روح کو مرتعش کرنے کی صلاحیت ہے، ایک وجدانی کیفیت ہے، تخلیقیت ہے، خونِ جگر کی آمیزش ہے، اثر ہے، آمد ہے آورد نہیں تو وہ شاعری ہے ''نظم'' بے شک نہ ہو، تگ بندی بے شک نہ ہو۔

ورجینا وولف بہترین شاعرہ تھی۔ اس کی شخصیت میں سمندر کی بے کرانیاں تھیں۔ اس کا

خلوص بے مثال تھا...ماضی کے تاریک غاروں تک اس کی رسائی تھی ..... تاریکی، نابینائی .....وجودِ مطلق...اس کے مزاج کی آزادی پسندی نے نظم کی پابندیوں کو قبول نہ کیا کہ اسے اپنے ''بیان کے لیے کچھ اور وسعت'' چاہیے تھی۔اس کے ناول ''لہریں'' کو شاعرانہ ناول کہا گیا...

آزاد فضاؤں کی جستجو، بہتی ہواؤں کے ساتھ رواں رہنے کی سرشت، فطرت سے والہانہ عشق اس مجموعہ کی تخلیق کار کا اپنا مزاج ہے اسی لیے شاعری کے اس مجموعہ میں فطرت اپنے تمام تر حُسن کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ''زرخیز تخیل'' اور شاعرانہ حسیت'' کو اکثر سراہا گیا۔لیکن زیرلب (خیال رہے کہ یہ شعری مجموعہ نہیں ہے اس لیے کہ اس میں بیش تر شاعرانہ نظمیں ہیں اشعار فقط چند ہیں..... یہ بات بھی نئی لگ رہی ہوگی..... نا قابل قبول لگ رہی ہوگی..... راقم الحروف مجبور ہے نئی نئی باتیں کہنے پر کیوں کہ وہ صحیح معنی میں محقق ہے ..... حق کی متلاشی .....اور فرسودگی سے نالاں.....! قایل بالآخر ہوجاتے ہیں آپ لیکن ساکت وخاموش کیوں رہ جاتے ہیں۔ حیران ہوں!..........عاجز ہیں اپنے طالع بیدار سے بہت!

ہم تو نئی راہوں کے مسافر ہیں اور فرسودہ راہوں سے برگشتہ خاطر......

کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد

اقبالؔ

ہمیں آزادی کا صحیح مفہوم جاننا ہوگا۔فلیپ پر ایک معتبر ناقد کی رائے اس سلسلہ میں معاون ہوگی.....

خلیل جبران نے کہا تھا...

''تم زنجیروں سے میرے ہاتھوں کو باندھ سکتے ہو، میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال سکتے ہو، مجھے تاریک قید خانہ میں قید کر سکتے ہو لیکن تم میری روح کو غلام نہیں بنا سکتے جو وسیع آسمانوں میں چلتی ہوئی ہوا کی طرح آزاد ہے''۔

آزادی کا صحیح مفہوم روح کی آزادی ہی ہے اس لفظ کی غلط تشریح نے بے راہ روی اور کجروی کو جنم دیا ہے جس کا اظہار بیش تر عام زندگی میں اور شاعری میں ہوتا رہا ہے جس نے شاعری کو بدنام کیا ہے.....

مادّیت اور صارفیت کے زیرِ اثر ہم زنداں خانوں میں اسیر ہیں..... فطرت سے بہت دور ہو چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو مجموعہ میں شامل نظم ''رہائی کی بے سود خواہش''.....

میرے کمرے کی کھڑکی کے باہر ہوا چیختی ہے
بڑا شور ہے، سیٹیاں بج رہی ہیں
چمک دھوپ کی بند کھڑکی کے اندر چلی آ رہی ہے
ہوائیں فضا میں بہے جا رہی ہیں!
مگر ایک بے نام بستی
مہیب اور پُر شور سناٹوں سے جاں بہ لب ہے!
کھڑکیاں کھول دو
یہ اونچی، بہت اونچی دیواریں ڈھا دو
مجھے پنکھ دے کر ہوا میں اڑا دو
مجھے وادیوں، کوہساروں، چمن زاروں کی خوشبوؤں میں سما جانے دو
مجھے اُس سمندر کی گہرائیوں میں اتر جانے دو

(رہائی کی بے سود خواہش)

ہم سطح بیں ہیں، چشمِ بینا نہیں رکھتے۔ سطح پر تیرتے رہتے ہیں، سمندر کی گہرائیوں میں اترنا ہم نے سیکھا ہی نہیں..... تحقیق، جستجو، حق کی تلاش ہماری روش نہیں (یعنی سطحیت ہمارا شیوہ ہے) نظم بہ عنوان ''گہرائیوں کا خوف'' پڑھیں اور کسی بات، واقعہ یا شخص کے بارے میں رائے زنی سے پہلے تحقیق کریں۔ خلوص کے ساتھ، حق کی جستجو کریں ایمان داری کے ساتھ۔ (میری یہ بات ممکن ہے غیر شاعرانہ لگ رہی ہو)

یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں منعقد ایک مشاعرے میں نظم بہ عنوان ''شجر سایہ دار'' سنائی..... سید مظفر حسین برنی صدارت کر رہے تھے انھوں نے صدارتی تقریر میں کہا..... ''علی گڑھ میں تین شاعرات ہیں..... ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی اور..... تیسرا نام انھوں نے خاکسار کا لیا..... اور وہ ساتویں آسمان پر!

''مدرگاڈیس'' عموماً بہت پسند کی گئی۔ مشاعروں میں سنائی۔ یونیورسٹی کے سروجنی نائڈو ہال میں منعقد ہوئی شعری نشست میں پیش کی۔ سامعین میں قرۃ العین حیدر بھی موجود تھیں۔ بعد میں وہ اس نظم کو مجھ سے دوبارہ سننے میری رہائش گاہ پر آئیں۔ یہ میرے لیے انتہائی دل خوش کن بات تھی!

شعبۂ اُردو کے ایک مشاعرے میں اپنی ایک غزل... ''وجود کے درخت کی گھنیری پتیوں کے درمیاں ہوا بھی'' سنائی اور یہ شعر.....

منظر بہت عجیب تھا ہم کھو کے رہ گئے

دوری پہ آبشار تھا ہم رو کے رہ گئے

مشاعرے کے بعد سیّد حامد صاحب نے مجھ سے کہا ''پختہ کلام ہے'' میں محو پرواز! کسی مشاعرے میں ''گہرائیوں کا خوف'' اور ''نئے انسان کا جنم'' پیش کیں تب بھی تعریف و تحسین! مجھ سے اکثر کہا گیا کہ آپ باہر مشاعروں میں کیوں نہیں شرکت کرتیں (مثلاً شنکر شاد مشاعرہ) میں لاجواب۔ فقط ایک بار ہمت کی۔ ابوظہبی میں منعقد ہوئے ایک مشاعرے میں شرکت کی (احمد ندیم قاسمی عالمی سمینار و مشاعرہ جو ۱۹۸۸ء میں ہوا تھا)۔ بچوں کو گھر پر چھوڑ کر جانا سوہان روح ہوگیا کہ بچوں کی ذمّہ داری صرف میری ہی تھی۔ ابوظہبی کے مشاعرے میں نظمیں سن کر سامعین نے یک زبان ہوکر کہا ''پڑھتی ہی رہیے''..... روح سرشار ہوئی..... دبئی کے مشاعرے میں بھی سماں بندھ گیا..... احمد ندیم قاسمی صاحب اور ان کے ساتھیوں نے بہت پذیرائی کی! ہمت افزائی کی، قدردانی کی..... خود پر اعتماد بڑھا۔

ابوظہبی اور دبئی کے مشاعروں میں شرکت کے بعد منظوم شاعری لکھنا بند کردی (وجوہات ناگفتنی..... ذہین قاری خود سمجھ جائیں گے)..... بات ۱۹۸۸ء کی ہے..... اس کے بعد تقریباً گیارہ سال کا عرصہ انگریزی تحقیق وتنقید کی نذر رہا کہ یہ بھی ضروری تھا..... پروفیسر شپ جائز طور سے حاصل کرنا تھی۔ ۱۹۹۴ء میں انگریزی میں تنقیدی و تحقیقی مقالات کا مجموعہ ''دائرے سے مرکز تک'' شائع کیا۔ اس کے بعد ''ورجینا وولف کی تحریروں میں تصوّر انسان کامل'' کے موضوع پر تحقیق کی جو کتابی صورت میں شائع ہوئی (اس پر پی۔ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی)۔ ساتھ ہی تدریس میں امتیاز حاصل کیا۔ ان تصانیف میں بھی شاعری موجود ہے۔ ۱۹۹۸ء میں اردو میں پھر شاعری شروع کی

(نثر کے پیرایہ میں)...... بہ غور، بہ صد خلوص مطالعہ کیجئے ''جنگل کی آواز'' (ادبی تخلیقات کا مجموعہ) میں شامل فن پارے..... ''غار''، ''گل مُہر کے سائے تلے''، ''املتاس کی چھاؤں میں''، ''چنار کے سائے تلے''، ''ماجھی''، ''ذکر ایک مشعل بہ کف اور قندیل بہ چشم کا''، ''صنوبر کے سائے تلے'' اور ..... ناول..... ''جنگل کی آواز'' (کہ اس کی جیسی تحریر اردو میں شاید نہیں ہے)!

ان سب کے پہلے ۲۰۰۳ء میں ''سید حامد کہ گم اس میں ہیں آفاق'' شائع کی تھی جس کی گونج ۲۰۱۳ء میں بھی سنائی دے رہی ہے)..... تخلیق، تنقید، تحقیق سب میں شاعری (یقیناً شاعری فقط وزن، بحر، قافیہ نہیں ہے)..... اور متعدد اشعار پر بھاری ایک شعر..... ''منظر بہت عجیب تھا..... '' اس مجموعہ میں شامل ہیں۔

مندرجہ بالا دونوں تصانیف..... ''سیّد حامد..... '' اور ''جنگل کی آواز'' پر تبصرے شائع ہوئے، قصیدہ خوانیاں ہوئیں ''سیّد حامد کہ گم اُس میں آفاق'' (جس کا موضوع عالمی ادب کا سب سے بڑا موضوع ہے یعنی انسان کامل کا تصور جسے سمجھنے کے لیے چشم بینا کی ضرورت ہے) کے بارے میں حقانی القاسمی کی رائے ہے.....

''نجمہ محمود اُس پیکر جمیل کا نام ہے جنھوں نے نثری پیرایہ میں ایک خوبصورت شعری تخلیق کی تشکیل کی ہے۔ ایک دائرہ ی شخصیت کی صفاتِ حمیدہ پر محیط اس تخلیق میں جو فکری، اسلوبی اور اظہاری جمالیات ہیں وہ قاری کو مسحور کر دینے کے لیے کافی ہیں۔ انھوں نے اپنے احساسات و جذبات و تفکرات کی موجِ مضطرب کو جس خوش اسلوبی کے ساتھ اظہار کے سانچے میں ڈھالا ہے اُس کے لیے ذہنی دراکی اور تخلیقی وفور ناگزیر ہے''۔ اس اقتباس میں قابل غور الفاظ ہیں ''ایک خوبصورت شعری تخلیق''..... یہ سطور پیش کرنا ناگزیر تھا۔

''جنگل کی آواز'' (۱۲ صفحات پر مبنی ناول) (مطبوعہ ''بزم سہارا''، نئی دہلی)، ''روشنائی (کراچی) کے بارے میں سیّد حامد صاحب کی مقتدر رائے دینا بھی ناگزیر ہے:

''جنگل کی آواز'' میں جز وکل پر حاوی ہے۔ ناول نگار نے اسے مختصر ترین ناول'' سے موسوم کیا ہے حالاں کہ یہ ایک بڑے ناول کا پہلا باب ہے، اس کا تعارف کرتا ہے، اس کی شیرازہ بندی کرتا ہے..... یہ غماز ہے تکوین کائنات کے اُس رمز کا کہ قطرہ کو دریا اور ذرّہ کو خورشید سے جدا

نہیں کر سکتے۔ یہ افسانہ پیکر ناول لکھ کر نجمہ صاحبہ نے اپنا نام عالمی ادب سے وابستہ اُن خلاق اور حقیقت رس مفکرین، مصنفین اور شعرا کی فہرست میں درج کرادیا ہے جو زندگی کو بے حسی اور بے دلی سے برتنے کے بجائے اس کے ظالم فشار کو نس نس میں محسوس کرتے رہے ہیں اور جنھوں نے اس کے خلاف جنگل کی آواز میں آواز ملا کر احتجاج پر کمر ہمت باندھی ہے۔

راقم السطور کو گذشتہ چند سالوں میں اُن کی نگارشات کو دیکھنے کا موقع ملا ہے۔اُن کے مختصر ترین ناول کا مطالعہ کرتے ہوئے اُسے محسوس ہوا کہ اس اثناء میں زبان و بیان پر قدرت اور فکر کی بالیدگی اور فنی شعور کے ارتقا اور عالمی مسائل کے ادراک اور انجذاب میں انھوں نے بہت سی منزلیں طے کرلی''.....(۲۰۰۹ء)

مندرجہ بالا اقتباس کو پڑھ کر شاید منکرین دم بہ خود اور ساکت رہ جائیں ان کے لیے اور چارہ ہی کیا ہے۔لفظ ''شعرا'' سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ ''جنگل کی آواز''،''افسانہ پیکر ناول'' بھی ہے اور شاعری بھی!

راقم الحروف نے قصداً خود پر ''شاعرہ''، ''فکشن نگار''، ''نقاد'' اور ''نثر نگار'' کا ٹھپہ نہیں لگنے دیا اس لیے کہ وہ ہمہ جہت ادیب ہے اور ہمہ جہتی یک جہتی سے برتر ہے..... ''ادبی اظہار کسی صنف ادب یا ہیئت کا پابند نہیں''۔ تقسیم کسی بھی چیز کی ہونا روا ہے۔

میری اِن تصانیف پر (سید حامد کہ..... ''اور ''جنگل کی آواز'' (ادبی تخلیقات کا مجموعہ) پر معتبر تبصرے شائع ہوئے اتنی تحسین و آفریں (قلمی، زبانی) کہ ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی حصولِ انعامات و اعزازات کی ''recognition'' کی یا فہرستوں میں نام شامل کیے جانے کی اُن متنفسوں کے ذریعہ جو نہیں جانتے کہ ''نقد'' کسے کہتے ہیں، ''میزان'' کے معنی کیا ہیں، خلوص، ''خونِ جگر'' اور تخلیق کا کرب کسے کہتے ہیں، جن کو علم نہیں کہ کہانی، افسانہ، ناول اور شاعری کی تعریف کیا ہے.....وہ جو ادب کے دین (دھرم) سے جدا ہونے پر ذرا ر نجور نہیں ہیں..... دین، دھرم اور ایمان کی تشریح وسیع النظری سے کی جائے کہ وہی حقیقی سیکولرازم ہے اور سیکولرازم سارے مذاہب کا علم ہے!

اردو ادب کا موجودہ منظر نامہ ایک ریگستان کی مانند ہے اور..... جھیل.....؟

(پیش لفظ ''ریگستان میں جھیل'')

○

بے زنجیر جستجو

نجمہ محمود

اس مجموعے کا عنوان "بے زنجیر جستجو" روایت سے انحراف ہے...... یہ خوبصورت ترکیب میں نے سید حامد صاحب کے ایک مضمون سے اخذ کی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ آج کل ادیبوں میں بے زنجیر جستجو کی کمی ہے، تحقیق کے بیکراں جذبے کی کمی ہے، حق کو سامنے لانے کی کوشش کی کمی ہے، خونِ جگر کا فقدان ہے۔ اس مجموعہ کے مضامین (یا نگارشات) مختلف النوع ہیں...... تحقیقی، تنقیدی، تاریخی، تخلیقی، اصلاحی، فقہی...... لیکن نوعیت سب کی تحقیقی ہی ہے کہ ان میں حق کی جستجو ہے، سچ کی تلاش ہے...... نقاد، تخلیق کار، مورّخ، مصلح، فقیہہ اور محقق...... سب کی راہ راہِ حق ہی ہوتی ہے تحقیقی ہی ہوتی ہے...... یہاں پر راقم الحروف کو اپنے ہی ایک طویل مقالے (جو اس مجموعہ میں شامل ہے) سے ایک اقتباس دینا ہوگا یہ مقالہ "سید حامد کہ گم اس میں ہیں آفاق" میں شامل ہے۔ چنانچہ یہ سطور......

> "نگارخانۂ رقصاں" کو گہری اور وسیع نظر سے دیکھنا ہوگا ورنہ کچھ ہاتھ نہ آئے گا...... فکروفن کو خانوں میں تقسیم کرنا ویسا ہی ضرر رساں ہے جیسے کہ ذات اور شخصیت کو خانوں میں بانٹنا...... یہ تحقیق ہے، یہ تنقید ہے، یہ تخلیق ہے کہ تنقید جو تخلیقی و تحقیقی نہ ہو تو خشک، بے جان، منجمد، فقط معلومات کا خزانہ ہوگی، تحقیق اگر تخلیقی، و تنقیدی، روشنی سے معمور لمحوں سے پُر، زود حس، متجسّس اثر انگیز، توانا اور کریم النفس نہ ہو، اس میں روح کے نغمے کی آمیزش نہ ہو تو نچلی سطح کی ہوگی فقط وزن بحر، قافیہ ہوگی، اگر وہ دل کی سطح کو متلاطم کرنے کی صلاحیت

سے عاری ہوتو بے اثر ہوگی...... افسانہ اگر تخلیقی، تحقیقی وتنقیدی نہ ہو
اس میں روح کو مرتعش کرنے کی صلاحیت نہ ہو، لمحہ کو گرفت میں
لانے کی اہلیت، ساتھ ہی تدبّر نہ ہوتو وہ افسانہ نہ ہوگا...... کسی بھی
تحریر میں اگر زندگی، جان، زور، نہ ہو...... اثر اور تخلیقیت نہ ہوتو ہم
اسے کیوں پڑھیں کہ منجمد اور خشک اور بے جان ہوگی...... اور اگر
اس میں اس کے خالق کی، اس مخصوص قلم کار کی شخصیت کا بالواسطہ
اظہار نہ ہو، جیتا جاگتا، روشنیوں سے معمور انسان نہ جھانکے تو ہم اس
خاص ادیب کی تحریر کیوں پڑھیں......؟...... ذہن انساں اپنی
پہچان کرانے کے لیے اصناف سخن کا سہارا لیتا ہے۔ کبھی فسانہ طرازی
کو دل چاہتا ہے (کہ دنیا کو بہتر دیکھنے کی آرزو عالمگیر)...... مکمل
حقیقت کی جستجو ہم کو تحقیق پر اکساتی ہے...... ہم کسی فن پارے سے
حظ اندوز ہونے کے لیے اس سرشاری میں دوسرے کو شریک کرنے
کے لیے اس کی تشریح کرتے ہیں...... اس کا مقام متعین کرنا ہوتا
ہے تو تنقید کا سہارا لیتے ہیں...... کبھی اپنے اصل، منبع اور سرچشموں
کی یاد آتی ہے تو وجدانی لمحات میں شعر کہتے ہیں، موسیقی تخلیق کرتے
ہیں اور جب کبھی اپنے عالمگیر علم کا اظہار کرنا چاہتے ہیں تو کسی کا
قصیدہ لکھتے ہیں...... کہ بہر حال قصیدہ گوئی عدم موجود عیوب کی
نشاندہی سے بدرجہ جہا بہتر ہے، کبھی مسکرانے اور ہنسنے کو طبیعت
چاہتی ہے (کہ کھوئی ہوئی جنت کی یادوں کو قہر سے بچنے کا یہ آسان
ترین طریقہ ہے) تو مزاح کا سہارا لیتے ہیں، کبھی دنیا کو خوبصورت
دیکھنے اور کھوئی ہوئی جنت کی تعمیر یہیں پر کرنے کو دل چاہتا ہے تو
مذہب کی روح کو خود میں سمو کر قوم کے، مجروح انسانیت کے درد کا
مداوا کرنے کی خاطر ''سود و بہبود و ہمہ'' کے تحت راہنما اور مدبّر بن
جاتے ہیں، سود و زیاں سے ماورا ہو جاتے ہیں...... اخلاق کی

درستگی، اعلیٰ انسانی اقدار کی ترویج اور کامل انسانوں کی تشکیل کی دشوار گذار راہ پر گامزن ہوجاتے ہیں اور جب ان سب کو خانوں میں تقسیم نہ کر کے اپنی متنوع، گوناگوں، ہمہ جہت شخصیت کا اپنی سالمیت کے ساتھ بیک وقت پُرتاثیر اظہار چاہتے ہیں تو نگار خانۂ رقصاں'' کی تخلیق کرتے ہیں جو نقدِ فن کے ساتھ نقدِ حیات بھی ثابت ہوتی ہے''۔

(اقتباس از ''سید حامد نگار خانۂ رقصاں کی روشنی میں'' مشمولہ: ''سید حامد کہ گم اُس میں ہیں آفاق'')

مندرجہ بالا خیالات کو کم و بیش راقم الحروف کی اس تصنیف بہ عنوان ''بے زنجیر جستجو'' کے مضامین پر منطبق کیا جاسکتا ہے...... معتبر ناقدین، تخلیق کار (شاعر، نثر نگار، فکشن نگار) بنیادی طور سے محقق ہی ہوتے ہیں، انھیں حق کی جستجو ہوتی ہے اور ہونی چاہیے...... تخلیق و تنقید کا رشتہ گہرا ہے...... معتبر ناقد اور شاعر علیم اللہ حالی اپنے مؤقر رسالے ''انتخاب'' کے ایک اداریہ میں رقم طراز ہیں...... (اداریہ کا عنوان ہے ''تخلیق و تنقید''......)

''یہ بات طے ہے کہ تخلیق و تنقید میں ایک ناگزیر رشتہ ہے اس رشتہ کی نوعیت کئی طرح سے واضح کی جاسکتی ہے۔ ایک تو یہ کہ تنقید کے ذریعہ تخلیق کی تفہیم ہوتی ہے۔ فنکار کے ذہن میں جو سرّیت، گہرائی اور بسا اوقات ابہامی کیفیت ہوتی ہے اور جو اس تخلیق کردہ فن پارے سے ظاہر ہوتی ہے وہ تنقید کے ہی ذریعہ ادب کے قارئین کے لیے قابلِ تفہیم ہو پاتی ہے۔ اس طرح تنقید فن پارے کی ظاہر و پنہاں خصوصیات کا تجزیہ کرتی ہے، اور شرح و تجزیہ کر کے اس کا مقام متعین کرتی ہے...... تنقید کا یہ فریضہ میکانکی انداز سے انجام نہیں پاتا...... جہاں ایسا ہونے لگتا ہے وہاں تنقید و تخلیق میں ایک الگاؤ محسوس ہوتا ہے۔ تنقید اپنے منصب اور معنویت کی خوشگوار ادائیگی اسی وقت کر سکتی ہے جب وہ تخلیق کا جز ولاینفک بن جائے...... اسی لیے تنقید کو ایک خالص علمی مشغلہ بنا کر اسے ایک الگ فیکلٹی کے طور پر قبول کرنا نہ تنقید کے لیے سود مند ہے نہ تخلیق کے لیے...... اچھی

تنقید کا وجود ان سارے عوامل کو اپنی دسترس میں رکھتا ہے جو تخلیق کار کے
لیے معاون ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ تخلیقی معیار کو
(Update) کرنے میں تنقید کا زبردست ہاتھ ہوتا ہے''۔

از رشتہ ''تخلیق وتنقید کا'' اداریہ ''انتخاب'' (۲۰۱۴ء سہ ماہی)

مرحوم وہاب اشرفی اپنے مضمون ''جدید تنقید کا منظر نامہ (مطبوعہ ''شاعر'') میں رقم طراز ہیں:

''مادّی فوائد، حصول زر اور شہرت کی ناپاک، غیر ادبی جدوجہد جدید
تنقید کا کھلا منظر نامہ رہا ہے۔ نظریاتی اور ادبی اختلافات کی نوعیت
کسی گراوٹ کی متقاضی نہیں ...... ایک ایسی گراوٹ جو فحاشی اور
دشمنی تک پہونچ جائے ایک نیا مرحلہ ہے اور ادیبوں اور شاعروں کو
اس منزل پر لے جاتا ہے جہاں افلاطون کا ذہن کام کر رہا تھا کہ یہ
بے حد بے اعتبار قسم کے اور ناقص لوگ ہیں جنھیں شہر بدر کر دینا
چاہیے۔ ظاہر ہے یہ افلاطونی خیال رد ہوچکا ہے لیکن آج کے
منظر نامہ میں اردو شعراء ادبا اور نقاد جن مرحلوں سے گذر رہے ہیں
کہ محسوس ہوتا ہے کہ تہذیب وشائستگی سے ان کا کوئی واسطہ نہیں، اور
ان کا طور وطریق گنوار اور اسٹریٹ ارچن (Urchin) سے مختلف
نہیں۔ اردو کے آج کے منظر نامے میں کردار کشی، یادہ گوئی، تشدد
(دہشت گردی) اور بیہودگی مسلسل اپنی جگہ بنائے ہوئے ہے۔
سیاست بھی دخیل ہوگئی ہے''۔

''اہم ترین ادیبوں اور نقادوں نے بھی ایک خاص عینک لگا رکھی ہے
جو تأثرات سے زیادہ تعصبات کو دیکھنے کا وصف خاص رکھتی ہے
...... اچھی سے اچھی کتابیں ایسے موقف سے متاثر ہو رہی ہیں۔
اچھے سے اچھا ذہن راندۂ درگاہ بنا ہوا ہے...... مریدوں کا فائدہ یہ
ہوتا ہے کہ ادیبوں کی صف میں ان کی جگہ بن جاتی ہے اور وہ پیروں کے

ساتھ موقر رسالوں میں جگہ بنانے لگتے ہیں۔ مجھے اردو ادب کی یہ فضا
انتہائی بیمار اور سنگین معلوم ہوتی ہیں''

(مطبوعہ''شاعر''ممبئی)

یہ مضمون پڑھ کر میں وہاب صاحب کی حق گوئی سے بہت متاثر ہوئی اور ان کو فون کیا، اپنا تعارف کروایا۔ پھر اپنی کتابیں بھیجیں...... انھوں نے میری تحریروں کی پذیرائی کی اور کہا کہ وہ میرے بارے لکھیں گے اور ''تاریخ ادب اردو میں'' مجھے شامل کریں گے...... میرے بارے میں رائے انھوں نے فون پر املا کروائی۔ وہ یوں تھی:

''ڈاکٹر نجمہ محمود کے علمی و ادبی کارناموں سے اپنے عدم واقفیت مجھے بے حد شرمندہ کر رہی ہے دراصل زیادہ تر وہی لوگ پڑھے جاتے جو اپنی صلاحیتوں سے زیادہ تعلقات پر بھروسہ کرتے ہیں...... ایسے میں بے نیاز ادیب و شاعر، جو قابل لحاظ بھی ہیں، وہ قعر گمنامی میں گم ہو جاتے ہیں۔ محترمہ نجمہ محمود نے گراں قدر ادبی کام انجام دیئے...... انھوں نے اچھی خاصی تعداد میں افسانے تخلیق کیے جن سے نہ صرف ان کے موضوعات کی خبر ملتی ہے بلکہ انفرادی فکر اور اسلوب کی بھی۔ حجاب امتیاز علی کی رَوِش میں نیا آہنگ کیسے پیدا ہوسکتا ہے وہ ان کے طرحی افسانوں سے مترشح ہے۔

ورجینا وولف پر ان کی کتاب اپنے محتویات کے اعتبار سے بے حد منفرد ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ نے محترم سیّد حامد صاحب کی سوانح عمری قلمبند کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مکالموں اور گفتگو سے جو مواد سامنے آیا ہے وہ خود نوشت کا درجہ رکھتا ہے...... اس طرح کی کوئی سوانح میری نظر سے نہیں گذری سیّد حامد صاحب کی زندگی کے بیش تر پہلو پڑھنے والوں کی نگاہوں کے سامنے ہوتے ہیں۔

نجمہ صاحبہ ایک عرصہ تک علی گڑھ کے شعبۂ انگریزی سے وابستہ رہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ جہاں وہ مشرقی ادبیات سے رشتہ قائم رکھنے پر اصرار کرتی ہیں وہیں مغربی ادب کے نئے اور پرانے تناظر پر بھی...... جن کی چھاپ ان کی نگارشات میں نمایاں ہے۔ افسوس ہے کہ محترمہ کی تحریروں سے میری شناسائی بہت تاخیر سے ہوئی...... لیکن میں نے ان سے بصیرت اور مسرت دونوں حاصل کیں۔ مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر نجمہ محمود ادبی طور پر فعال

رہنے کی سعی مشکور کریں گی''

(اگست ۲۰۰۹ء) ماخوذ ''کہتی ہے خلق خدا'' مشمولہ جنگل کی آواز (ادبی تخلیقات، از نجمہ محمود ۲۰۱۱ء)

''اب پروفیسر شمیم حنفی صاحب کے ایک مضمون ''اردو کی ادبی وتہذیبی روایت'' (مطبوعہ ''دنیازاد''، کراچی اکتوبر ۲۰۰۴ء) کا ایک اقتباس دیکھیے:

''یوں بھی اس موضوع کے مضمرات پر گفتگو کا حق دراصل ان کو پہونچتا ہے جنھوں نے مغربی مفکروں اور دانش وروں کے افکار کو (بالعموم ناقص ترجموں کی مدد سے) اندھادھند نقل کرنے کے بجائے اپنی ادبی اور تہذیبی روایت اور اردو نظم ونثر کے حوالے سے سمجھنے کی جستجو کی ہے۔ نئی یا پرانی کوئی بھی ادبی تحریک ہو یا میلان ادب پڑھنے والوں کی طرف اس پر پہلی اور آخری شرط جو عاید ہوتی ہے یہی ہے کہ خالی خولی تھیوری یا اصولوں کی ہوا باندھنے کی جگہ شعروادب کی نمائندہ مثالوں پر ان کا اطلاق کر کے یہ دکھایا جائے کہ اس طرح ایک نئے جہان معنی تک رسائی کا راستہ کھلتا ہے..... ہم اس لمحہ کے منتظر ہیں جب کوئی بڑا شعر، بڑی نظم، ہمارے شعور میں ایک مستقل جگہ بنانے میں کامیاب ہونے والی ''مابعد جدید'' کہانی یا ناول کا ظہور ہوگا......''

شمیم حنفی صاحب کی رائے سے میں متفق ہوں۔ اردو ادب میں، اردو تنقید وتحقیق کے میدان میں فکری جمود ہے...... ناقدین کو ان کی رائے پر غور کرنا چاہیے اور جستجو کو، ''بے زنجیر جستجو'' کو مہمیز دینا چاہیے اور اس کے لیے صداقت، شجاعت اور دلیری کی ضرورت ہے، جذبۂ عشق لازم ہے، بے خطر آتش نمرود میں کود پڑنے کا حوصلہ چاہیے...... یہ سب لکھ کر میں کیا کہنا چاہ رہی ہوں شاید کچھ قارئین سمجھ گئے ہوں...... بڑے اشعار، بڑی نظمیں ''ہمارے شعور میں ایک مستقل جگہ بنانے میں کامیاب ہونے والی'' مابعد جدید کہانیاں (اور ناولیں ظہور پذیر ہو رہی ہیں لیکن حقیقت کو، اشیاء کی حقیقت کو، دیکھنے والی نظریں کہاں ہیں۔

؎ جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

بے زنجیر جستجو ہی وہ نظر پیدا کرتی ہے......

اردو کے بیشتر پروفسران اور ناقدین فکری جمود اور تقلید کے شکار ہو چکے ہیں۔ مقلدین پیدا ہورہے ہیں۔ تحقیق...... یہ لفظ اپنے معانی کھو چکا ہے...... ایسا تخلیق کے میدان میں بھی ہورہا ہے۔ حق کی تلاش ناپید ہوئی (تحقیق کا ماخذ حق ہی ہے)۔ ریسرچ اسکالر جبری تحقیق کرنے پر مجبور ہیں چنانچہ لفظ ریسرچ اسکالر تضحیک وتحقیر کا شکار ہو چکا ہے۔ بے زنجیر جستجو سے مزین ہونے کی ہمت نہیں..... تنقید نگار بھی محقق ہوتا ہے۔ آج ناقدین میں بھی حق کی جستجو کمیاب ہے۔

میری اس تصنیف بہ عنوان ''بے زنجیر جستجو'' کے مضامین بنیادی طور سے تحقیقی ہیں، حق کی تلاش ہیں...... ان کی ترتیب میں نے یوں کی ہے کہ جو مضامین طالب علمی کے زمانہ میں لکھے گئے وہ شروع میں ہیں...... تاریخ، سن تخلیق اور اشاعت کے حساب سے ہیں مثلاً مجاز اور ٹیگور پر مضامین زمانہ طالب علمی ۱۹۶۳ء میں تحریر کیے شائع ہوئے...... اور ''شعور کی رو...... '' جو ۲۰۱۴ء میں شائع ہوا وہ آخر میں ہے...... ان مضامین کو خانوں میں نہیں بانٹا گیا ہے کہ سب تحقیقی نوعیت کے ہیں۔

''مجاز ایک ساز ایک آہنگ'' کرامت حسین مسلم گرلز کالج لکھنؤ میں بی اے سال اول میں تحریر کیا ادبی بزم ''کہکشاں'' میں پیش کیا ''یوم مجاز'' کے موقع پر...... ٹیگور پر لکھا ہوا مضمون بھی کہکشاں میں سنایا۔ سجاد ظہیر صاحب نے دونوں مضامین ''حیات'' میں شائع کیے...... (۱۹۶۳ء میں) راقم الحروف اپنی شفیق استاد رضیہ سجاد کی ممنون ہے جنھوں نے رہنمائی کی، ہمت افزائی کی۔ قدردانی کی...... نثری نظم آزادئ روح کی ضامن ۱۹۷۹ء میں ماہنامہ ''شاعر میں شائع ہوا'' ''ماقبل تاریخ میں عورت کا مقام'' بھی ''تہذیب الاخلاق'' میں شائع ہوا۔ حمیدہ سعید الظفر، رضیہ سجاد ظہیر، ثریا حامد وغیرہ کے خاکے تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئے ان کی نوعیت بھی تحقیقی ہی تھی ''تحقیق، الہام ایک لمحہ انکشاف''، ''تہذیب الاخلاق'' میں شائع ہوا۔ ''ویدوں میں عورت کا مقام'' ریڈیو تقریر تھی ''تہذیب الاخلاق'' میں شائع ہوا۔ ''سید حامد نگارخانہ رقصاں کی روشنی میں'' ''شعر وحکمت میں شائع ہوا (۱۹۸۷ء میں)۔ '' ریگ زار اس کے اشارے پہ...... '' اور خرد نے پیڑ کے پتوں میں تیری معرفت ڈھونڈی'' یہ دونوں طویل مقالے ''سید حامد کہ گم اس میں ہیں آفاق'' سے لیے گئے اور اس

کتاب میں شامل ہیں...... ''خلیل جبران کی شاعری میں رومانی عناصر'' ۲۰۰۴ء میں شعبۂ عربی کے ایک سمینار میں پیش کیا گیا یہ بھی شعبۂ عربی کے مجلّہ میں شائع ہوا۔ ''اصلاح معاشرہ کی لازمی جہت'' اور ''تہذیب کی دیوار منہدم'' ۲۰۰۵ء اور ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئے ''قومی آواز'' میں ...... ''احمد فراز آزادیٔ روح کا شاعر'' ''انقلاب'' میں شائع ہوا ...... ''پیاروں کا پردیس ایک جائزہ شہناز کنول غازی کی تصنیف ''پیاروں کا پردیس'' کے ابتدائی مضمون کی صورت شائع ہوا......

راقم الحروف کا طویل مقالہ ''شعور کی رو...... تکنیک یا تصور خودی...... ورجینا وولف، اقبال اور مشرقی صوفیاء کے حوالے سے'' ...... اردو تحقیق وتنقید میں انتہائی اہم اضافہ ہے۔ اسے Path breaking کہا جاسکتا ہے مصلحتاً خاموشی اختیار کی گئی...... معنی خیز و پراسرار خاموشی ...... فقط عبدالاحد ساز صاحب کا ایک مکتوب ''تحریر نو'' میں شائع ہوا جوان کی فکر کی زرخیزی کا غماز تھا...... قارئین اور ناقدین کی سرد مہری کو فکری جمود ہی کہا جاسکتا ہے......! یہ طویل مقالہ میری انگریزی تحقیق پر مبنی تھا...... جس سے میں اردو والوں کو روشناس کرانا چاہتی تھی...... میرا کچھ نقصان نہیں ہوا۔ اردو تنقید و تحقیق کا بے شک زیاں ہوا...... یہ فکری جمود نہیں تو پھر کیا ہے؟

آج کے دور کے بہت سے مسائل ورجینا وولف کی تحریروں کو سمجھ کر حل کیے جاسکتے ہیں، اس کے افکار سے استفادہ کیا جاسکتا ہے...... آج سب سے بڑا مسئلہ انسانی رشتوں کی ریزش کا ہے، قتل وغارت گری کا ہے، دہشت گردی کا ہے۔ اس مسئلہ کو اس نے اعلیٰ، متوازن، ہم آہنگ ذہن سے مزین انسان کے تصور کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ اقبال کے انسان کامل کے متوازی۔ راقم الحروف نے کئی سال میں عرق ریزی کر کے، اپنی بے زنجیر جستجو کے ذریعہ تلاش کر کے اسے عالمی اکابرین (ابن العربی، رومی، الجیلی، اقبال، اروندو گھوش وغیرہم) کے درمیان باعزت مقام دلایا، ہم آہنگ ذہن کی تشریح کی، شخصیت کے صوفی تصور کی تشریح کی۔ ڈھائی سو صفحات کی کتاب انگریزی میں لکھی جس پر راقم الحروف کو پی ایچ ڈی کی ڈگری مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کی طرف سے تفویض ہوئی ۱۹۹۸ء میں اسے شائع کیا جس کی بنیاد پر (علاوہ دیگر تحریروں کے) باعزت طریقے سے پروفیسر

شپ ملی۔ ''اصناف سخن کی مستند روایات میں اضافے کے امکانات'' علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سمینار میں پیش کیا گیا اور ''تحریرنو'' میں شائع ہوا...... یہ مضمون بھی توجہ طلب ہے۔

''عالمی فکر میں فیمنزم'' عثمانیہ یونیورسٹی کے ''فینزم'' پر منعقد شدہ سمینار میں پیش کیا گیا (۱۹۸۸ء میں)...... اور ''تحریرنو'' میں ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔ ''شعور کی رو...... تکنیک یا تصور خودی ورجینا وولف اور مشرقی صوفیاء کے حوالے سے'' ماہنامہ ''تحریرنو'' میں شائع ہوا......

سب سے آخر میں ذکر کروں گی اپنے ایک مقالے بہ عنوان ''وہ افسانے لکھے ہی نہیں گئے جن میں الوہیت ہوتی''...... اس مضمون پر حسب معمول کوئی ردعمل نہ ہوا..... ہاں ۱۲ بجے رات کو امریکہ سے پروین شیر کا فون آیا..... پروین میری مخلص دوست ہیں..... بے حد تعریف کی انھوں نے..... اور یہ توصیف میرے لیے بڑے سے بڑے ایوارڈ سے ہزار گناہ بڑھ کر ہے..... پروین خود بڑی ادیبہ ہیں اسی لیے حسن کی پارکھ ہیں..... میں ان کی تہ دل سے شکرگزار ہوں.....

ان مضامین کو، جو اس مجموعہ میں شامل ہیں غور سے پڑھنے کی درخواست کرتی ہوں کہ یہ راقم الحروف کی بے زنجیر جستجو کا ثمرہ ہیں...... حق کی تلاش ہیں!

خلیل جبران نے کہا تھا:

''تم زنجیروں سے میرے ہاتھوں کو باندھ سکتے ہو، میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال سکتے ہو اور مجھے تاریک قید خانے میں قید کر سکتے ہو لیکن تم میری روح کو غلام نہیں بنا سکتے جو وسیع آسمان میں چلتی ہوئی ہوا کی طرح آزاد ہے''۔

○

Faridoon Shahryar

Poem: An Euology about my mother

An Euology About My Mother

In the

Sea of Wisdom.

Calm waves

Gently smile;

A new way unravels itself

Bathed in

Glorious sunrays,

Such is the

Depth of understanding

Emanated by Ammi,

Concrete ideas

Shaped by practicality

Take form

From the clay of abstraction,

Treasures of surprises

Leave us marvelling

Always!

Najma Mahmood, retired Professor of English in the Aligar Muslim University, surprises the readers with the dexterous manner in which she quotes great Persian poet Rumi, English Romantic poets William Wordsworth and Keats, Indian poet Sri Aurobindo Ghosh, Arabic Poet Khalil Jibran and classic Urdu Poet Allama Iqbal while elucidating her perspective of "Saiyid Hamid's relevance in the present context".

She highlights the significant achievements of Saiyid Hamid in the dissemination of modern education amongst the vastly underprivileged and ignornt Muslim children. It is a well-known fact that when it comes to education amongst Muslim Saiyid Hamid's name is next only to the founder of Aligarh Movement, Sir Syed Ahmad Khan.

The sagacity and objectivity of the author comes forth when she dedicates an entire chapter to quotes from various editorials written by Saiyid Hamid and published in the fortnightly, Nation and the World. All these quotes are substantiatied by the dates fo actual publication which happens to be over a period of a decade. These quotes written in fluid English give an insight into his educational and reformist ideologies.

The front cover of the book is mesmerizing. The pristine white backgrond is superimposed by a photograph of trees and natural vegetaion within a circle. The paper qulity is of exceptionally high class and calligraphic writing is an eye-treat. Usage of English words at certain junctures to elaborate the perspective is a testimony to the fact that the author has a deep comparative, analytical and creative capability.

Saiyid Hamid: ki Gum Us Men Hain Aafaaq becomes a must buy because of the rare family photographs of Saiyid Hamid as well as photographs taken at various other functions during his tenure as the Vice-Chancellor of Aligarh Muslim University and elseshere.

Pub. In "Nation and the World"

New Delhi

2004

Sir Qureshi Manzoor

Recitations:
"Qde to a nightingale and Parchaaiyaan"

(Opinions about the recorded recitations of Keats' "ode to a Nightingale" and Sahir's poem, "Parchaiyan")

Have listened to your recitations (audios) of an "ode to a Nightingale" by Keats and "Parchaiyan" by Sahir. Yes, your life-time experience of speaking over the rostrum has contributed to your perfection of word delivery and mastery of voice as a perfect storyteller. The ode and Parchaiyan have their beauty of romance, conflict and conscience - expressions that make both authors the most towering points in the history of world literature.

❑

Faridoon Shahryar

Saiyid Hamid: Ki Gum Us Mein, Hain, Aafaq

In the Eyes of the Beholder

"Saiyid Hamid ke Gum Us Men Hain Aafaq by Najma Mahmood is a landmark book in many ways. Saiyid Hamid. former Vice-Chancellor of Aligarh Muslim University, is a colossal figure in the field of Muslim Education in India. The above-mentioned book written in brilliant Urdu evokes many shades of emotions.

On the one hand the lyricism of the text can be compared to the prose poetry of Khalil Jibran. The tone, the tenor, the felicity with the language makes one sit up and take notice of the multi-dimensional scale at which the author successfully conveys her point of view. The book not merely focuses on Saiyid Hamid, the present Chancellor of Hamdard University and Secretary, Hamdard Education Society in New Delhi, as an educationist-reformer of repute, but also as a visionary and a creative writer of class.

Saiyid Hamid

Jungal ki Awaz

(afsana paikar novel)

Referring to the sound of the sylvan music in "Jungal ki Aawaz" the novelist has called it a short novel where a part of it comprehends the whole, although it is the first chapter of a large novel introducing it, organizing it. It unfolds the secret relating to the creation of the universe that the drop from the river and particle from the sun cannot be separated. By writing this novel of the size of a short (imaginative) story Ms. Najma Mahmood has recorded her name in the list of those truth-seeking thinkers, writers and poets of the world literature who deal with life not insensitively, but have been intensely feeling the cruel pressure of life through their veins and have taken a resolute stand by merging their voices with the voice of the forest.

This author has had an opportunity during the last few years to study the writings of Ms. Najma by reading this briefest novel he feels that during this period regarding mastery over the language and style, growth and expansion of thought, evolution of artistic consciousness, perception, comprehension and absorption of global and universal problems, she has covered many a destinations.

Saiyid Hamid

I.A.S.

Ex Chancellor Jamia Hamdard,

Ex. V.C. A.M.U.

Aligarh

Dr. Kathleen Raine
47, Paulton's Square
London, SW3, 5 DT
0171-3524643
20 Dec. 1996

Dear Najma Mahmood

Thank you for your letter and for sending me your book on Virginia Woolf. I do think that your intent to bring Islamic values to bear on an important modern author is an excellent one. I am glad that you find my work compatible with Islamic thought. My own 'master' Blake wrote "All religions are one." He had read the Quran and Bhagwat Gita.Tragic that such conflicts have arisen between the different traditions all of which reflect some unique aspect of the one reality.

Of course you are 'one of us' and your work in Aligarh is very important. You can pass on the knowledge to your students and keep the sacred flame alight. And inspite of popular materialism people all have that spark in the them and long for spiritual food for us. All works inspired by the vision of beauty and truth are surely also the work of God. Shakespeare, Rumi, Blake, Tagore and you have made your case for Virginia Woolf too.

(from a Letter by Dr. Kathleen, an eminent, British poet and critic of 20th Century.)

Reviews

English, Shimla: IIAS, 2000

7. Mahmood, Najma. *Jungal Ki Aawaaz*, Aligarh: Vision Publication, 2011
8. Mahmood, Najma. *Paani aur Chattaan*, Aligarh:Vision Publication, 2001
9. Mahmood, Najma. *Virginia Woolf's Concept of Perfect Man: An Exploration in Comparative Literature*, Aligarh: Vision Publication, 1998
10. Morrison, Toni. *Mouth Full of Blood: Essays, Speeches, Meditations*. London: Chatto&Windus, 2019
11. Rich, Adrienne. *Of Woman Born: Motherhood as Experience and Institution*, London: WW Norton& Company, 1995
12. Woolf, Virgina. *A Room of One's Own* and *Three Guineas*, London: Harper Collins Publishers, 2014
13. Woolf, Virginia. *To The Lighthouse*, New Delhi: Finger Print Classics, 2019

life and so sometimes, she touches the Sufistic pattern of inner life as well. This is most accentuated in her research work on Virginia Woolf in pursuit of comprehending the concept of ideal person/ Insaan-e Kaamil. Woman at the window, woman at her writing desk, woman with a book on the terrace or in the lawn – are images which get repeated in her stories like the archetype of Oedipus in a number of plays and stories around the world – 'hero with a thousand faces', as said Joseph Campbell. Woman who was marginal in all these inherited stories is given a centre stage by Najma Mahmood. She appears on the sea beach, following a fantasy of digging pearls and saving man from drowning, she rides a horse getting out of the dark cave (*Nargis Ke Phool*, P& C), without turning back for the fear of being petrified. Sometimes, she is at the altar of family sacrifice to prove if not defend her chastity (*Zard Patte*, P& C), meets the fate Desdemona and the last Duchess. But she loves open windows and books in hand the most, for both carry a world within them. Mahmood believes it right that looking ahead is the way out, looking back can still petrify you!

References:

1. Friedan, Betty. *The Feminine Mystique*, London: Penguin Books, 2010
2. Gilbert, Sandra and Gubar, Susan. *The Madwoman in the Attic: The Woman Writer and the Nineteenth Century Literary Imagination*, Yale University Press, UK 2000
3. Jalil, Rakhshanda. *An Uncivil Woman: Writings on Ismat Chughtai*, New Delhi: OUP, 2017
4. Kakar, Sudhir. *The Inner World: A Psychoanalytic Study of Childhood and Society in India*, New Delhi: Oxford University Press, 2012
5. Karlekar, M. *Voices from Within: Early Personal Narratives of Bengali Women*, Delhi: OUP, 1991
6. Lal, Malashri, *The Law of the Threshold: Woman Writers in Indian*

(52), feeling the morning breeze on her face gratefully. She stands tall, undaunted by the sea waves now, holding onto her being, with conviction but she is no longer 'stilled', confined within. She knows her heart, pledges to the Ashoka trees standing resolutely that she can live by herself, instead of leaning on the shoulders of an alien person invading her world (56). The cuckoo still sings, the shehnai does not haunt her anymore. The doors and the windows are open!

Mahmood imagines a sea of grass and a dark cave in the fiction, *Ghaar*, refers to the collective Unconscious and writes, " O you fragrant darkness! Why do you provoke me to rise against the time and the world? What music lies within you?..." (P& C, 67). This story may remind one immediately of Plato's allegory of the cave in which chained persons get accustomed with their dark world and continue living within, resisting all change. As a caged bird sings or a person falls in love with one's confined life knowing no way to come out of it. But a vision can bring a new light and energy to change all- the story ends with the words –"the mysterious intuitive light ...I will prune up life with my own hands/ alwahi roshni,... use zindagi ko apne haath se sanwarna thaa!" (68). Najma allows the narrator in search of a vision to be her own master, being her own priority instead of bowing down to dictates and a choice for others. Her wisdom is fully revealed here which if applied to woman's state in the world, makes one realize that the change has to come from within, letting light enter the dark crevices of the unconscious desires, and come out of the conscious history of enslaved lives that our ancestor women lived through. The message of change, freedom from conventions and dependence is subtle yet clear in all the writings of Mahmood.

Some images recur in the writings of Najma Mahmood. I feel specially drawn to the way windows and books are perennially present in all her stories. Writing desk and pen, trees, flowers, rains, waning and waxing moon, sea waves, singing birds are constant companions in Mahmood's fictional world. The women in her fictions mostly read and think, ponder over mysteries of

This belief in the gradual change was witnessed in the protagonists of Jane Austen, Brontes and Henry James as well. Shaheena in *Pani aur Patthar* achieves a higher score on the scale of humanity when she rises from her prejudice against the unsophisticated Kaleem and takes up the responsibility of teaching and refining him from a sparsely educated boy who had crammed up male ego boosting lessons from Moli/Maulavi Saab without understanding Quar'an as a book of life. Kaleem assumed that learning English is sufficient to be a modern man like wearing foreign clothes could change one's personality. It is Shaheena who has the prerogative of enlightening Kaleem, taking him out of a self- satiated 'encaved' life and carving upon him as one does on a 'raw piece of wood'. The snobbish Shaheena who looked down upon her cousins for they did not have the privilege of a broad-minded father or better education like her, decides to give them daily lessons. The adage of 'knowledge is power' is repeated as she tries to improve and not conquer the mind of Kaleem by making him read *Doll's House* and novels of Intizar Hussain while she herself pursues *Jane Eyre*. Kaleem appears as a replica of blind Mr. Rochester, rich but helpless and Shaheena rescues him like a concerned companion. The story bears that characteristic open endedness, which makes it memorable. She achieves the pleasing satisfaction of doing something 'worthwhile'. She was introduced to us as staring wistfully upon the painting of water and stone, with a fire in her heart against the social constraints. She peered out of the window which was like a 'threshold' between the gendered interior and exterior world of freedom. She smells the jasmines from inside her room while looking longingly at the wet road meandering away from her sight, the outer space resonant with the cuckoo's songs from a mango orchard! The distant shehnai is just like a reminder to her being a person whose life revolved around dreams of an equal life partner and the nightmares of an unknown, incompatible misogynistic man, who would 'possess' her 'thoroughly'. By the end of the story, she is strong like the 'stone' though heart beats for human bonding, purged of bias. She is seen smelling roses and jasmines out in the home-grown lawn

internalized bourgeois conventionality. She, as the developed form of the *Meeraas* girl, who herself had undergone a strange stirring, a yearning, wants to protect her daughter from the same "problem that has no name" (5), in the words of Betty Friedan who has written extensively about the dissatisfaction of mid-twentieth century housewives and educated American women. Najma Mahmood is giving voice to the middle class Indian women who were accomplished in household chores but wanted more from life and this promising world. She stands against the inequality meted out to women in an essentially unequal world and her stories like that of Ismat Chughtai "challenge traditional morality and worn out notions of woman's place in society" (Jalil, xvi). Najma breaks the perception of zenana inhabiting women as "stilled, stuck to an antiquated past, buffeted by caprice..." (Patel,7). They are no longer prisoners of the house but utilize their thinking ability and make some of the choices for their children if not for themselves. Therefore, *Paani aur Chattan* can be taken as a very progressive story, for it is not only the daughter working as a mediating force of change but the mother plays a catalytic agent for transition which may have a centrifugal effect upon lives of all those aunts' daughters who were bred and brought up on the ideas of "cultivated ignorance and enforced silence" (Morrison, 29), as replica of repressed femininity and "looking glass" (Gilbert, 71) for inflated male superiority.

"Main apni beti ka kumhalaya hua chehra nahin dekh sakti"

Shaahina's mother, Naeema who could not shrug off the patriarchal submission coerced from her as a young woman, finally drops the veil of her vanquished state and transforms to a face of victory in the form of Shaahina's freedom from an unwanted wedlock.

"Magar ye andaaza hua ke ladkiyan gaai nahin rahein. Teri khushi mein meri khushi hai, mujh se tera kumhlaya hua chehra nahin dekha jata/ I did realize that girls are not cows... My joy lies in your happiness, I cannot bear to see your face wilted like a flower" (41).

father's house, who could not get rid of a "cow's fate to be tied to anyone and be happy/ ladkiyan gaayen hoti hain, jis khoonte se baandh do- khush rahengin"(41). The older Naeema gets just lucky enough to be "tied" to Ahmad Hussain who respects her, in spite of all the intellectual differences they might have, about which Shaahina used to wonder:

"Naeema Begum khamooshi se dono ki guftugu sun rahi thiin jo kabhi bhi unke palle na padti thii. Unhen uljhan si hoti thii... apne maan baap ka zehani tafawat hamesha Shaahina ne mehsoos kiya thaa. Yahi doori khud uske aur Ammi ke beech thii... "(34).

But the older Naeema does change, from an anxious and "puritanical keeper" of Shaahina's "virginity" (Rich, 225) and 'unspoilt'/ undeveloped mind to a person who wants happiness of her child. She agrees to go by Ahmad Hussein's decision to break off the childhood engagement of Shaahina with Kaleem made on the deathbed of her beloved sister, under an emotional crisis. Sudhir Kakar, the reputed psychologist and writer analysed Indian society and found how parental efforts are aimed at "conquering the child's will" (244), for career and alliances. They do not allow them to think for themselves and believe in a "prolonged childhood" in the name of love and care. Karlekar shows how "mothers" for a long time, remained "resistant to change or reform" as requisite of national ideology, they had to be exemplars of "tradition" (), reputation and piety of the family depended on them. Tagore's Antahpur and Chughtai's zenana had rules and dictates to be internalized in order to earn a respectability in the household world. Thus, the older women were vigilant towards the girls. But later generation of women also had to strive to be 'modern', companionate wives of educated men. Naeema probably realized this fact that daughters are more than a repository of moral insurance and cultural capital. She dared to get away from the tradition of forced marriage of daughters to maintain respectability and influence, or even to keep sentimental deathbed promises!

The older Naeema breaks away from the shell/medium of

prune her up with laces and pearls instead of motivating to follow her aspiration. Mother Naeema tried hard to mould her being as per the requirements of the decorous domesticity- "kachhi lakdi hai, jidhar chaho –mod do/ a young person is like raw wood, it can be moulded in any shape easily" (44). *Paani aur Chattaan* rather reads like an extended form of the previous story *Meeraas*. It may be a simple co-incidence that the young girl Naeema in *Meeraas* felt suffocated in the same way that Shaahina does inside her room, peering outside her window or gazing upon the painting. Shaahina's mother now bears the name Naeema. Thus, the present story is not only an extension but also a wheel turning of a woman's life cycle. Shaahina is a pampered daughter of Ahmad Hussein Khan, who understands her, who seems to instill all his readings and wisdom in the daughter, who loves to get books and magazines for her- the most sought after gift.

"Abbu meri kitaaben?"

"Haan. Tumhari kitaben laaya hoon bhai, risaale bhi laaya hoon" (31)

He knows that Kaleem is not suitable for Shaahina, for she deserved more from life, a better person to be her life partner. He is the medium of widening her horizons (discusses poetry and philosophy on the breakfast table, found a suitor in Allahabad, ready to call off the childhood engagement of his daughter with Kaleem), whereas the mother Naeema tries to draw her towards the 'clucking domesticities' (Woolf, TTL, 299) and force docility in her temperament.

The mother Naeema in *Paani aur Chattaan* may be none other than Naeema who thought rebelliously in *Meeraas*, who herself loved books, flew across the lines of world atlas and tried not to heed to the admonitions of her mother and aunts to behave 'like a girl'. Naeema, who had realized that the face should not be her fate, who found other girls of the family too domesticated to think beyond the arrival of Prince Charming. The older Naeema is the one who really could not flee away from the restraints of her

the blue, swarming waves of the sea. There's a boat sailing on the waters- a complete story in itself! It is rich as an imagery, as a body of archetypes, as a metaphor and allegory. The heroine (sounds better in the given context) named Shaahina watches the framed painting, gets lost in it...but is suddenly drawn to the reality present around in a pleasing manner by the cuckoo's sounds coming from a mango orchard, the fragrance of blooming jasmines outside the window and the distant shehnai music of a baaraat/ marriage procession. She appreciates beauty of the world in a worshipping mode, revealing a pure heart and an ignited mind to the readers. We are further told that though the morning embraces her with all the splendor of a new day, she feels lost and lonely. She is capable of thinking deeply, in the light of the Sacred Text and all the other specimen of world literature available in her shelves. T. B. Macaulay might not have uttered that infamous line about the limited writings of the East, had he read this precious collection! She felt as if the aura of loneliness created by that standing stone amidst all those stubbornly moving waves in the frame had been instilled inside her. She found herself to be unfortunate as a 'self-aware' person who was swayed by the world of dreams which was cruel yet beautiful and enchanting, instead of trying to find satisfaction in glittering jewellery and pretty dresses, "...you would have been much happier. She addressed herself. It is unfortunate that she was aware of her potential.." (*Pani aur Chattan, Jungal ki Awaaz*- page 28). Her pursuit of knowledge was considered to affect her imprudently, making her feel trapped not only in a loathsome house but in her very own body, as most of the thinking women did, according to Adrienne Rich (89). Life in the parental home is considered to be that of an affectionate ease and pampering. Shaahina was a beloved daughter but this love came with a set of genteel expectations, binding her to a decorum and polite mannerism. It gave no space to her unconventional thoughts and be "adventurous, imaginative, all agog to see the world" as Virginia Woolf found Judith in *A Room of One's Own* (45). Her censorious mother and visiting aunts worked as patriarchy's agents who initiated her to the ways of feminine gentility, trying to

India). These books opened the mind's door to the world for young Naeema, she seemed to enjoy these journeys around vicariously like nothing else. But what troubled her most was this social pressure to get married since the age of thirteen. Ismat Chughtai's *Chauthi ka Joda* sparks in the mind as we find her mother sitting with all kind of bridal fabrics, sequins, golden flowerets, spools of threads, needles and snippets to prepare her dowry since the time she remembers. Marriage of daughters was the most serious topic of discussions among the relatives and between parents, spouses, which made the girls feel uncomfortable and alienated. Mahmood presents Naeema wondering helplessly, "Is she really a burden on the family? It seems as if everyone is waiting for the day she will be sent off..."/ "kya who waqai ek bojh hai?...jiske uthne...ka intezaar kiya ja raha hai?" (M. 25). The spectre of cruel in-laws haunted her. This also makes her subject to the society most intensely, for a daughter is "possessed so thoroughly" by the family that she could be "dispossessed" to any suitor asking for her hand at the first instance (Gilbert, 84).

The most amusing part of the story is Naeema' unsuitability for a prosperous man's proposal for they looked at educated girls as faulty beings. She could have been a rich landlady only if she were a simpleton, for ignorance was counted as a lady's quality and imbecility enhanced her feminine charms! They also wanted a heavy dowry. Najma thus, calls this dowry and the conventional view towards women a bourgeois inheritance / *Meeraas* which the modern society has been unable to dispose off. The family is sad for this lost opportunity. The story ends with Naeema peeping into the brother's bag for a new book, for this very loss could be a gain for her.

Paani aur Chattaan is another short story by Mahmood which takes up the issue of marriage as a threatening imposition on a young, enthusiastic girl who wishes to take the untrodden path of becoming an educated person. Mahmood begins by drawing attention of the readers towards a painting adorning the wall of our protagonist. It depicts a lonely stone surrounded by

engage with the world intellectually about which the eponymous character of *Jane Eyre* articulates, "Women feel just as men feel: they need exercise for their faculties and a field for their efforts as much as their brothers do" (chapter 12). She felt alienated from her culture which circumscribes its women to the conventional cast/e of gender, get absorbed in the pampering of a husband and unproductive forms of behavior. A person like Naeema had to either make a virtue of her confined life like 'an angel in the house' (Patmore) or live suffocated in the prison-house of an imposed unwanted marriage, choking the assertive voice of her pen under the routine of passive domesticity. Emily Dickinson found women being gradually lost to this 'soft eclipse' of marriage which Naeema was reminded of every now and then, like a sword hanging upon her head. Her mother was adamant to 'manufacture' her consent (Chomsky) for a proposal she was least interested in. She wants to see the world, studies geography to understand it and make an alternative decision unlike her cousins whose lives were confined to dreams of a suitable boy. Naeema is rooted to her house amidst intruding relatives and limited books, and tries to create an imagined connection with distant vistas by following the atlas routes, flowing with the sea of imagination and rising to heights of mountains available in the fictional world. "khaleej Bengal ke un door uftada hare jazeere...buland darakht,...ret ke qile, Caspian ke sahilon, Ganga ki azeem lehron, neele pardon wale steamaron mein ghoomte they/ the far distant green islands of Bay of Bengal...towering trees...sand castles...shores of the Caspain,..the sacred waves of the Ganges...roaming in those blue curtained steamers" (143).

Interestingly, the archetype of 'woman at home' is repeated here as Naeema used to wait enthusiastically for reading materials with the departure and arrival of the father and brother who went 'out to the world'. She never asks for dresses or jewellery, neither does she borrow like the poor heroine of Maupassant. Those well-cherished books, may remind one of Gauri Vishwanathan's criticism of 'father / master' selected texts for the 'children' of India (*Mask of Conquest: Literary Study and British Rule in*

insulted deeply".

Her own wish and desire are scorned upon by her mother, Naeema's fondness for reading is considered a misplaced habit. Her pursuit of college education is an unnecessary waste of time causing delay in marriage and dismay of relatives for her indifference to proposals. "Madam is interested in doing BA Honours. It is all right to let the son pursue education as he will earn and feed us in our old age, how is the daughter going to be of any use?"/"in sahiba ko BA pass kerne ka shauq hai. Ladke ko to bhai isliye padhwaya ke budhauti mein hamari rotiyan chalengin, ladki koi thodi kama ke khila degi?" (M, 24)

If someone in the neighbourhood had tried to learn the new ways of the world during her college course, her newly acquired-'bad' manners were supposed to influence all other girls, the women discussed it to scare the conservative mother- "What is the use of this education? They sent their girl to college and now she is a vagabond, has renounced purdah as well"/" ladki ko padhaya likhaya, lekin wo awaara ho gayi. Pardah chhod diya hai" (*Meeraas, Jungal ki Awaaz*, pg 22). Naeema just loved reading, she did not follow books blindly but read them with a critical eye "she had a deep interest in knowledge, isn't this absurd to think that all girls will go wayward by going out to study"/ "... usko ilm se waqai gehri dilchaspi thii... unh!, jaise saari ladkiyan padh likh ker kharaab ho jati hain" (M, 22). A docile daughter, a beloved sister and a sincere student yet her mother had all her fears conjured up against those books and magazines which Naeema demanded as gifts on different occasions from Bhai or Abbu. Her mother used to reprimand, "Will you ever do anything other than licking these stupid books? Your mother in law will simply throw them in the stove fire and then you will see how badly she treats you...you are none of a home maker!"/ "ae, main kehti hoon ...nigodi maar kitaaben hi chata karogi? ...saas kitabon ko jhonkegi chulhe mein aur kaam lete lete bhurkas nikaal dengin... Na ghar ki, na girhasti ki..." (23). Her own mother and other family members were simply unable to accept her wish to

out and feel the wind in their hair instead of seeing the world through chilman, jharokhas and windows, who wished to let the sea water seep within the skin and touch everything God had made somarvellously, in punishment to Eve. The middle class Muslim community had lost its authority, the glory of zamindars was long diminished by usurping colonial land rules and migration caused by Partition. Women all over India were mostly indoors after participating in the national struggle for independence, trying to restore normalcy to their households. 'Clash of civilizations' had scored another victory and educated men had a broken yet wider world to explore, some women began attending colleges and universities, most had higher walls around them. So, was all well with the newly hatched nations of the Indian subcontinent?

Najma Mahmood traces the inborn shackles upon the female part of this new world which had been touched by the light of the word but the world outside still seemed out of reach. They read about its beauty in poetry, about its harsh reality in prose, more and more romantic songs flowed about the strength of 'good woman', Bharata was a mother now for all, poetry sessions replenished the coquetry manners and standard of beauty included more labour and lust. Women were found to admire nature if not Michelangelo only, and peered out of windows to feel the world. All was not so well for them.

Mahmood brings these women to the fore, looks into their hearts and minds, writes about their issues which were mostly put under the carpet, or quelled within. The short story "*Meeraas*" is important in this particular context, Naeema finds it shameful that she is treated like a burden by the family as a daughter is nurtured with all love and care only to be disposed to another family as a bride, sooner the better. "zyada chhan been na kerna, ladki zaat ka bithana theek nahin, aur sehre ke phool.../ no need to go for too thorough an investigation about the proposal, it is unwise to make any delay in her wedding, making her wait for the best alliance". (*Meeraas*, *Jungal Ki Aawaaz* 23), a concerned aunt advises her mother. "Usse shiddat se apni beizzati ka ehsas hua/ she felt

nothing more was considered essential for them! Little Tahseen's is the cry reminding the readers of all these socio-political and historical anomalies. Her vociferous reaction is for defying this pre-destined life which was yoked upon half of the humanity as women ...a voice of dissent against this game of unfair rules, against the practice of imposing anatomy as destiny. Tahseen like ifnumerable other girls across centuries since the origin of this life on earth asks for more, asks for novelty, for the need to move ahead, for a change which has seen numerous 'stalled revolutions' in different guises. Thus, Najma Mahmood makes this short story a reminder for all readers to come out of the clichéd stories. She makes Tahseen's outburst after a simmering wait, a palimpsest of all those fictions which deprive a common girl of her primacy- "na jaane kitni cheekhen fizaaun mein halool ki hui hain jo humko sunai nahin detin, lekin hain.../ you don't know how many cries have lost their echo in our surroundings, we don't hear them but they are there"(159). One may also look at this particular story as a response to Sylvia Plath's suspicion that she was 'inhabited by a cry' (poem *Elm*) which might never have been yelled out completely throughout her poetic compositions, for the critics ridiculed writing women to have no muse and thus, no ability to say anything sensible. Perhaps, we could have more choices if Lily Briscoe was not teased misogynistically by another guest in Mrs. Ramsay's Eden, "women can't write, women can't paint" (94). Tahseen has cried out to come out of clichéd collection, Najma Mahmood heard it too closely to disregard. Her stories try to fill a void caused by all those untold tales and unsung songs!

Najma Mahmood's short stories seem to portray the stir caused by the dissent in this particular echo of the cry. Post- independence Indian middle class Muslim women find a space in her Urdu short stories at a time when majority of writings revolved around the men in narratives of Partition or Socialism. Mahmood's writings may appeal to a modern reader for depiction of the struggles of young girls who asked for education, who found imposed purdah as restrictive, who had understood early marriage as a vicious trap, who yearned for a space of their own, who wanted to go

a long, unending story. A grandma would have probably engaged her with a long winding fairy tale of princely adventures, for all the luxury of time that she might have. The conflict between the narrator and the little narratee is caused by changed times, for the aunt is trying to satisfy her own curiosity for a new story hurriedly while a set of other chores wait for her downstairs. Tahseen ends up crying loud and hard after she loses patience with the Birds' tale who go to the King's granary to pick up a grain of wheat and come back to the same place after accumulating it in their nest. This is the only story which never ends, or at least goes for days! Tahseen is no King Shahryar of *Alf Laila O Laila*, who could threaten to kill Scheherazade if the story does not go ad infinitum ...she is bored by the monotony, by the lack of any progress in the plot. She is horrified at this fact which no girl child was ever let to know that a woman's life was almost like those laborious and greedy birds who lived trapped in the cycle of birth, marriage, children and end without much space for personal development. It is tormenting to realize that there were few relevant stories to be told beyond fictional male-centric sagas running days and nights; for Husne Aara met Hatim Tai only countable times, Helen is reported about than shown taking things in stride in *Odyssey*, few except Jhansi ki Rani and Razia Sultan had made it to history, for George Eliot could not get published with her original name, for those who spoke were burnt on the stake like Joan, for those who were prescient and could make predictions were driven out of society as witches and heathens, for Judith Shakespeare did not survive the deep-rooted gender prejudice, for many girls learnt the alphabet with coal on the kitchen walls, not on slates or notebooks like their brothers and Uma Devi was still marginalized and Ismat Chughtai questioned in the court rooms about her chastity! Charlotte Bronte and Emily Dickinson felt like orphans as writers, for examples of women known to write and be accepted were rare. Writing books could change women to "Harrafa" and "Hyena in petticoats"! The privileged young story teller of Tahseen is reading Maupassant only now, the previous generation women lived on the mere reading of Aasmani kitaben/ Sacred books and

Prof (Dr.) Nazia Hasan

Women's College, AMU

That Yearning for Spaces in Togetherness: Exploring dimensions of gendered spaces in select Urdu Writings of Najma Mahmood

Dr. Najma Mahmood is a former professor of English in AMU, a wonderful teacher and a profound writer. She has written extensively on Virginia Woolf, her narrative technique, 'stream of Consciousness', Sufism and many short stories as well. She writes in English and Urdu both with a natural flair. My paper entitled That Yearning for Spaces in Togetherness: Exploring dimensions of gendered spaces in select Urdu Writings of Najma Mahmood deals with some of the short stories taken from her collections- Paani aur Chattan and Jungle ki Aawaaz. Prof. Najma Mahmood is an inspiration for many of us who took up the challenge of attending to her creative urge. Otherwise, we do see how talents perish under the burden of time-bound duties and daily life chores, especially in women. *Cheekh ki Goonj* (*Echo of the Cry*) is a very simple story about a little girl's incessant demand for stories from her aunt- a young woman who herself is fond of reading. Little Tahseen (*CKG, Paani aur Chattan*, 159) is a pre cell-phone era four year old girl- a bundle of sweetness, intelligence and curiosity, who loves to hear stories like most of the children of that time. In fact, we all live in stories if we ponder upon life closely. She was furiously eager to get acquainted with the different facets of life and the world vicariously. The writer Najma Mahmood recounts many of those tales and fables inhering memories of our own childhood through the narrator– chida chidiya/ birds, hare and tortoise- tales with morals which used to amuse and teach simultaneously. The narrator herself is immersed in Guy de Maupassant's classical story *The Necklace*, worrying over the next stage of the story- at a decisive juncture in the life of the young wife who borrows the gem studded necklace from her friend to attend a socialite party and manages to lose the same precious piece of jewelry! Tahseen gets irritated as all stories come to an end far too soon, she asks for

Research Paper

was also displeased and disheartened. That "unphilosophical" article was cordially accepted and published in the volume Muslim Face of India destined to be unnoticed and unappreciated! I was extremely disheartened and depressed due to restriction on my pen, on my freedom of expression!

The present author was compelled to underrate not merely the readers but the most eminent personality among Muslims in India i.e. Saiyid Hamid Saheb. In a way I was also underrated. Why? Browning said in his poem:

"All's right with the world."

I feel 'All's not right with the world!

That same article: Saiyid Hamid a Living Stream: Vision, Action, Sporting, Spirit", is now going to get published in the form of a monograph after six years of its creation. I hope that the readers are enlightened enough to comprehend and appreciate this effort of mine!

Professor Najma Mahmood

Dept. Of English. A.M.U, Aligarh

In this essay of mine Iqbal's idea of personality, of Perfect Man, of "Khudi", (Consciousness) has been applied on Hamid Saheb, hence Saiyid Hamid as a living stream of consciousness, of "Khudi". This very Sufi Idea, which has the essence of true knowledge and wisdom, is easily comprehensible by enlightened minds, learned readers.

After the arrival of that very idea to my mind I was overjoyed and utterly oblivious of the physical pain. I thanked Saiyid Hamid Saheb (on phone) for the honour which he had bestowed upon me by insisting to write an article about him for the volume to get published. Saiyid Hamid Saheb was pleased as he, naturally expected something unique and enlightening from me.

The research work was started in spite of the bouts of pain in my ribs. This essay was completed within more than two months as it was comprehensive. Then I went to Delhi so that Saiyid Hamid Saheb may assess it. Saiyid Hamid Saheb was delighted. His comment about this Article was:

"It will be the best article of the volume".

It was the biggest award for me. I was extremely happy and forgot the pain and agony through which I had undergone.

But unfortunately the would be "best article" of the forthcoming volume was rejected by the compiler with the comment:

"It is philosophical. Please write a simple article".

Perhaps he meant to say that the readers won't be able understand it. There may have been some other incommunicable reasons as well. What else could be expected from a beacon of light, a prestigious seat of learning and knowledge, i.e. the Aligarh Muslim University? (writings above level are usually unintelligible).... Then I wrote a "simple", unphilosophical, unimpressive, ordinary (below level) article and sent it to the compiler of the volume with a heavy heart. Having intuited the basic reason behind disapproval of that article Saiyid Hamid Saheb

Foreword

The present essay, Saiyid Hamid A Living Stream: Vision, Action, Sporting Spirit, was originally written for Muslim Face of India, published by a Pune based activist and educationist, Mr. Mushtaq Madani, in order to pay tribute to Saiyid Hamid, a stalwart among Indian Muslims after Sir Syed Ahmad Khan and Maulana Abul Kalam Azad.

The editor of Muslim Face of India requested me, through a formal letter (as well as on phone) to write an article on Saiyid Hamid Saheb for the aforesaid volume. I apologized as those days I was not at all in a position to write even a single paragraph due to severe pain in my fractured ribs. Otherwise I wished to write another book on Saiyid Hamid Saheb as I had earlier written in Urdu (Saiyid Hamid ki Gum Us Mein Hain Aafaaq) published in 2003 which had received immense applause and appreciation!

Keeping in view Saiyid Hamid Saheb's wish Mr. Mushtaq Madani insistently requested me to write an article I felt extremely honoured and delighted and started thinking about an appropriate and impressive subject which had not been covered in my previous voluminous book Saiyid Hamid ki Gum Us Mein Hein Afaaq. Then, during an inspired moment, a unique idea occurrend to me, a subject which was rare, untouched and above level. After all I was supposed to write for the learned, intellectual and visionary readers. I started my research paper with the title Saiyid Hamid a Living Stream: Vision, Action, Sporting Spirit. It was not exclusively about Saiyid Hamid's achievements as merely a sportsperson but about other very significant aspects of his personality i.e. his cosmic vision and action, his achievements.

Monograph

Saiyid Hamid

"A Living Stream"

Vision, Action, Sporting Spirit

of Universal Love and Self-realization. Her sources were ancient Egyptian religion, Coleridge and Plotinus. Plotinus had access to The Upanishads in which is rooted the Oriental Sufism.

In this comprehensive study Virginia Woolf's idea of harmonious personality has been ascertained to have striking parallelisms with (besides) Wordsworth's "living soul" and Coleridge's idea of an "androgynous mind") the perfect Man of the Oriental Sufis and poets-Ibn'I Rabi, Al-jili, Rumi, Sri Aurobindo and Iqbal. Their concept of time in relation to personality has been found to be real and circular. Theirs was a search for the lost Time, hence the presence of the vision of the Mother as the most reliable spiritual guide in their writings.

In this study, the phrase "stream of consciousness" (interpreted by William James as a subject) has been identified with Iqbal's concept of consciousness (khudi). It is the stream the ocean of self, the Vedic, "spark of consciousness", the Logos, "Hiranaya Garbha". "Stream" is the poet himself hence the exploration of the Isiac personality of Virginia Woolf.

The discovery of this Oriental Concept of Perfect Man in Virginia Woolf gives to her a unique place in world literature unraveling her enigma and providing us with a clue to an understanding of her mind.

Prof. Najma Mahmood

Review

(Expert opinion)

Professor M. K. Chaudhri,
Deptt. of English,
Banaras Hindu University

This study by Dr. Ms. Najma Mahmood is a perceptive and in-depth study of Virginia Woolf's idea of personality and her concept of Perfect Man. Being basically a comparative study, it explores the affinities between Virginia Woolf and the Oriental Sufis like Ibn'l Arabi, Al- Jili, Rumi etc. Involving their ideas of Perfect Man which are based on the doctrine of Logos. This frame though tentatively suggested by N.C. Thakur in his book Symbolism of Virginia Woolf needed to be applied and explored and I am happy to say that Ms.Mahmood has carried out the task quite competently. Ms. Najma has successfully explored Virginia Woolf's Isiac personality and her belief in united being, her presentation of women as the prime force and embodiment of Universal Love. Scholar's comprehension of mysticism and her erudition are quite impressive.

❑

Abstract of the thesis

(Abridged)

This comparative study delves deep into the mystico-religious aspects of Virginia Woolf's consciousness, It seeks to trace her search for truth and wholeness which had led her to the doctrine of Logos—a major pursuit of Romanticism and Oriental Sufism—a quest for the reconciliation of opposites, intellect and intuition against the attainment of an integrated self with the traits

Review
(Expert opinion)

This study is a good piece of scholarly investigation. Ms. Najma Mahmood's choice of the topic too is quite revealing of her interest and critical awareness of the work done in the field. The study is full of fresh critical insights and perceptive examination of the issues relevant to the chosen field of investigation. It is noteworthy that the researcher has brought to bear cross cultural perspectives on her elucidation of the novelist's concept of Perfect Man. Her knowledge of the sources of Oriental Sufism is first-hand and her interpretation of the "Stream of Consciousness" as a concept akin to Iqbal's "Zinda Rud", (Living Stream), is brilliant and original. I derived much benefit and pleasure from reading this scholarly piece of investigation.

Professor Janki Ram

University of Rajasthan

Jaipur

Foreword

(Expert opinion)

This study is a comprehensive exploration of the concept of the androgynous mind or personality across the major cultures and religions of the world with special emphasis on the ancient Egyptian religion and the Indian Upanishads, the Oriental Sufism and Sri Aurobindo vis-a-vis the concept of Perfect Man in Virginia Woolf's novels. Striking parallelisms in the above concepts have been worked out with great perceptiveness and acumen for comparative research. The term 'Perfect Man or androgynous mind' has been given a wide connotative parameter, to include ideas suggestive of 'integrated personality,' supported by illustrations drawn from Shakespeare, Dante, Jung, etc.

The study, while directly dealing with Virginia Woolf's novels, raises some interesting critical issues, such as the meaning of the much used term, 'stream of consciousness,' in fictional studies, the relevance of philosophical and religious constants across disparate cultures to the study of literature, etc.

The study is a positive contribution to Virginia Woolf's scholarship and gives credit to the author for its comprehensiveness and the authorial perceptiveness. I hope the published version of the doctoral research will stimulate fresh interest in Virginia Woolf and encourage further research in comparative study of philosophical values and thoughts across different cultures.

Professor K.S.Misra
Ex-Chairman, Dept. of English,
A.M.U. Aligarh

Preface

This is an humble attempt at making the inner being intelligible to oneself by viewing Virginia Woolf's ideas on it in comparison with the ideas of the Oriental Sufis and poets. It is needless to state the importance of self-knowledge in the present age while human beings have become mere"orts, scraps and fragments" having lost their soul, their real self. If this study could help in healing the diseased soul of the modern man, in preserving his self througUniversal Love and Self-Realization, even to the extent of the light of a spark, I shall feel my attempt more than rewarded.

Professor Najma Mahmood

Deptt.of English. A.M.U, Aligarh

October,1998

Virginia Woolf's Concept of Perfect Man – An Exploration in Comparative Literature

there might not "remain a statue where there was a man, where features of the face disappear and there remains only a halo". The field of criticism is akin to a playfield where rivals shake hands with each other after the game is over. As stated earlier, there may not arise a question of separate superiorities as criticism, being a very significant branch of knowledge, is a mutual search for truth.

The title of the book From the Circle to the Centre is mystical, therefore metaphorical and geometrical if one could blend mysticism with poetry and Pythagorean numbers!

November 1992

Ms. Najma Mahmood
Aligarh Muslim University Aligarh

central point of organization. A work of art is complete in itself; it is perfect having an "inner form". It is a mental creation in every detail and the whole is of one spirit permeated with the breath of one life. This is criterion of wholeness, haleness and health which is to be sought in these essays. Shipley's definition of criticism is very apt as it is harmonious and balanced, fusing intuition and reason. Ours is and ought to be a search for truth while we enter this realm. Criticism is a mutual search for truth in which the question of separate superiorities does not arise. In Tillyard's words "we agree to disagree in our search for truth". He wished for a sporting spirit to be prevalent among critics so that truth could be sought. He seems to agree (indirectly) with Pierre de Coubertine's words: True spirit of sports lies not in winning but in participating". Coubertine spread the spirit of true sportsmanship.

The essays in this collection are a search for truth in which the author has very often agreed and occasionally disagreed with the critics reorientating them to suit her own original approach to the authors treated. This original approach is a synthesis of various approaches including the most modern Feminist or harmonious approach. A restricted critical approach fails to reveal the real worth of a work of art in all its dimensions. It is also erroneous because it is partial and subjective.

The author of this Miscellany has used mystical standards in order to reach original conclusions. Thus Shakespeare as well as Virginia Woolf etc. emerge not merely as artists but as mystic-seers, visionaries, sages and physicians of the soul most needed in the modern degenerated world. By using mystical standards, conclusion has been derived that Hamlet is a perfect form of man who is gloriously sane.

The author of this miscellany has tried to know, in the words of Matthew Arnold, "the best that is known and thought in the world" and to "make this prevail to create a current of fresh and true ideas" Interpreted rightly and sincerely this comment is suggestive of self-praise on the part of the author of this Miscellany". Criticism is disinterested exercise of curiosity so that

Preface

The present miscellany of literary articles is the result of my teaching experience of twenty five years and intensive study of English literature covering a wide range of authors and literary genres. What has been attempted here is synthetic and creative criticism.

Criticism ought to be like a work of art. Besides having a critical sense a critic should be intuitive. Good criticism is a new creation, a reconstruction of a piece of writing in which the critic shares the feelings, the imagination, the ascentions of the creative writer. It is, in a way, complete identification of the writer and the critic.

Like a work of art, criticism must have an "inner form" which in Goethe's mind, excuses imperfections of language and external technique. Goethe, who was called by St. Beauve "the greatest critic of all ages" and by Matthew Arnold the "supreme critic" tries to define his criteria of judgment by which a work of art differs from a mere exercise of technique or outpouring of sensibility. He adopts the organism analogy (as pointed out by Rene Wellek in History of Modern Criticism (1750- 1950), the concept of wholeness, the totality of every work of art is the miniature print of the highest beauty of Nature. Rene Wellek refers to Moritz, a friend of Goethe, who speaks of a center, a focus of a work of art, a term apparently drawn from perspective and suggesting a

Review

I have read with deep interest and to my great enlightenment the manuscript of the book entitled, From the Circle to the Centre, a Critical Miscellany, a collection of critical essays written by MS. Najma Mahmood, Reader in English A.M.U. Women's College, Aligarh. These essays cover a wide range of authors - Shakespeare, Wordsworth, Keats, Arnold, Ibsen, T. S. Eliot, Forster and Virginia Woolf and literary genre drama, poetry and fiction. As the title of the book signifies, the author tries to explore the inner‹ universal and spiritual meanings of the prominent works of these great writers. Her analysis and evaluation not only give original interpretation to the various significant aspects of the great liteary works chosen by her but also present fresh insights into them.

These essay reveal MS. Najma's deep study and proper grasp of her subject and her keen critical sensibility to evaluate them.They are well-organised and characterised by cogency and precision. Written in simple, lucid and clear style they are bound to prove useful to the scholars and students alike.

Prof. Harish Raizada

Prof. (Retd),

Deptt of English,

A. M. U. Aligarh

Ms. Najma is not aggressive like most feminists, she is gentle and persuasive. This is another merit of her study, which I hope will be a source of pleasure and profit to many. The language is lucid and clear revealing a picture both satisfying and stimulating.

Prof. A. A. Suroor
(Ex – Head, Deptt.
Of Urdu, A.M.U. Aligarh
Professor Emeritus, Department
Of Urdu. A. M. U. Aligarh)
1994

Foreword

From the Circle to the Centre – A Critical Miscellany is a collection of essays by Ms. Najma Mahmood, Reader in English at A.M.U. Women's College, Aligarh. Four of the essays deal with Shakespeare's plays followed by one each on Wordsworth, Keats, Arnold & T. S. Eliot. A study of Ibsen's A Doll's House and the last three essays focusing attention on Virginia Woolf complete the picture. Ms. Najma reveals in these essays not merely an intimate knowledge of the subject but also an insight into the soul of the various poets and writers, which is essential for a proper appreciation of the issues involved. She has taken into account most of what has been said by well-known critics, but is able to show at many places that she can think on her own and is not unduly influenced by what others say.

All criticism to my mind is appreciation and evaluation. One has to share the experiences of the poet or writer, to enter into his or her spiritual quest, so to say, and then to judge whether it has been worth his or her while, that the journey has given a fresh insight into life and its mysteries, about man and his universe. These essays reveal love, understanding and insight and hence they are sure to appeal to a wide circle of readers. So far, the feminist point of view has not received the attention it deserves.

point to establish analogies across space and time. As was to be expected she has not always steered clear of pitfalls. But the fact of her search for analogies does itself suggest a widening of the horizon.

One could point an accusing finger at the frequency of references to other critics. But here Ms. Najma has more often than not, used passages from other ciritics as stepping stones for her individual ascent. She embarks on a voyage of exploration, seeking a send-off from eminent critics of literature. I see no harm in that as long as her own journey does not become tentative, diffident or confused. To quote other critics verbatim is certainly better than trying to paraphrase them.

Leafing through the Miscellany one senses an incipient feminism. One could wish she were more explicit and less reluctant on the subject which seems to be close to her heart.

Saiyid Hamid
Former Vice-Chancellor, A.M.U. Aligarh
Chancellor Jamia Hamdard
Hamdard Nagar
Tughlaqabad
New Delhi

bent of mind has blended fiction and poetry in her writings. "She was interested in the sharpened image, the moment, the condensed experience...Her method is that of a lyric poet." In The Waves the author symbolizes the person's growth from youth to age. The ups and downs, joys and sorrows of life have been symbolized through the rising and falling waves.

The companion study of Virginia Woolf's A *Writer's Diary* unfolds the poets's personality and the mainsprings of her thought. "It reveals the excitement and passion behind Virginia Woolf's creative genius and shows clearly and often painfully the anguish and frustration that was characteristic of her search for perfection.

"Feminism in World Thought With Special Reference to Virginia Woolf" serves to show how widely read in western and oriental literature Najma is. It may not be possible always to endorse the similarities she is apt to discover between different authors particularly those from the orient and occidnet but quest for inter-literature analogies serves one useful purpose. It underscores the fact that despite differences of language - culture, civilization, heritage, human nature, inclinations, responses, thoughts and emotions have an innate similarity. Literature is as indivisible as humanity itself whatever the colour of the skin or the form of the script. Literature that lays bare the human soul, that articulates man's aspirations, that gives expression to his joys and sorrows, that represents man's unquenchable thirst for knowledge and his invincible fight against injusitice, that pricks the bubble of appearance, that flays hypocrisy, that emphasizes the ephemeral nature of riches and power, that upholds human dignity, that analyses the complexity of motives, defies being regimented or divided into compartments. The apparent range of Ms Najma's reading and references brings the reader into the hall of world literature where national and linguistic barries appear to dissolve. Not that she is a profound scholar of world literature. Her achievements in that sphere may not be very many. What I am refererring to is the inclination to demolish barries and to discover similarities. A danger in such an adventure is the stretching of a

"Nature in an Evening Walk and Descriptive Sketches" is among the more original and exhausive studies of Ms. Najma. She has demonstrated lucidly that the treatment of Nature in these two early poems of Wordsworth is to show how closely they are related with "some of Wordsworth's main preoccupations in his maturity."

"The Eve of St. Agnes-A Study" has generated a very perceptive study. "The core of the poem's meanings, she says, lies in its gradual progression towards affirmation through rejection of sets of negatives- asceticism, gross sensuality and mere fancy."

"Dover Beach- a Search for Wholeness" represents Matthew Arnold's search for "seeing life steadily and seeing it whole." The companion poems from this angle are Scholar Gypsy, "Resignation" and "Rugby Chapel." The author goes to point out that the note of anguish and melancholy resulting from the emotional and intellectual conflict is dominant note of Victorian poetry.

In "A Doll's House - A Reassessment" the critic's feminine sympathies are fully aroused. "Ibsen, a moral and social rebel" is acknowledged to be an ardent supporter of women's rights. He has "dealt with a universal and eternal theme- the conflict between the individual and society, between reality and illusion, between innocence and experience...... He "has used drama to ask questions rather than supply answers to them"... His plays insist that marriage is a union of souls, an association by free choice and held together by mutual trust.

In "The Waste Land A Study" Eliot appealed to the spirit of the time by writing a poetry of frustration, disorder and hypocerisy...." It is a "Christian poem dealing with man's radical sinfulness on account of which he is condemned to suffer pain and evil."

The reader discovers a particularly perceptive and copious study in "The Waves-a Poetic Novel- A Search for the Mysteries of the Self." In dealing with Virginia Woolf, perhaps her favourite author, Najma is often at her best. Virginia Woolf, who had mystical

The second group relates to the Romantic poets- Wordsworth, Keats and Matthew Arnold (a post-Romantic) The Waste Land represents the third group. In the fourth group are three studies revolving round Virginia Woolf.

The first study. "Hamlet-The Perfect Form of Man or a Mad one?" carries a question mark in the caption. It is erased as the study proceeds by gradual stages and cogent and well-documented argument in favour of the second alternative incorporated in the caption. Hamlet, the author concludes, represents the divine order of a universe that surrounds its supreme creation, Man. He is complex and subtle and is sensitive to the ironies of life and the mysteries of human destiny.

It would, however, be difficult to agree with Fredrick Artz quoted in the essay in relation to Hamlet's remark. "This was the attitude of the mind that led Columbus to break the bonds of the world and Copernicus to break those of the Universe."

In point of fact Columbus was the more famous and perhaps the last of those who sailed to the New World. The bonds of the world remained unaffected by his voyage. Similarly Copernicus could not go beyond our solar system. The universe is still a far cry.

The critical essay on "the Visibility of Shakespeare's Spirit in Hamlet" starts with the controversy between Schiller and Schlegel with regard to whether Shakespeare was subjective or objective. Najma cites Hazlitt's opinion that "Shakespeare almost alone among poets, had the faculty of transforming himself at will in whatever he chose. He was the Proteus of human intellect."

The "Dramatic Function of the Fool in King Lear" is a short study. One could wish for a more detailed discussion. At the outset Najma contests the conventional critical view that the Fool tries to take Lear's mind off his obsession with his daughter's ingratitude. But later on she says that the fool mainly helps in relieving the tragic intensity by the flashes of his wit and humour. The two different interpretations remain unreconciled till the end.

Introduction

Although Ms. Nama Mahmood calls her 'Essays and Studies' a miscellany there is nothing casual or loose or unpremeditated about the book. She borrows copiously from the critics and from her general reading, but one closes the book with the impression that an unifying insight animates the essays and studies contained in it. No perceptive reader will fail to notice the sensitive mind and poetic imagination that Ms. Najma brings to bear upon her subjects. These are apparently diverse but have an inherent relationship. A common thread binds them together. A sense of togetherness is enhanced by a more or less uniform approach of the author. It is analytico-poetic. She lays her mind bare in order to absorb and assimilate, in order to identify herself more often with the poet or dramatist she is studying and occasionally with one of their characters.

The book comprises twelve essays/studies. These convenienty fall into groups. I, Shakespeare's plays-two of these centre round Hamlet and one each is concerned with *King Lear* and *The Winter's Tale.* One cannot fail to notice that the critic has been attracted - almost irresistibly - by the tragedies. She is drawn towards the mystic and the weird. Tension and conflict leading to or bordering on insanity or simulating it has received the critic's analytical attention.

From the Circle to the Centre – A Critical Miscellany

feminism while we lived in a halcyon bubble awaiting something. We were often told to be flexible because we didn't know where life (meaning marriage) would take us. Najma Apa made us realize that we were something and we didn't need permission to become ourselves.

After sixteen years of teaching commerce and managing schools I decided to become a full-time writer. I had stopped writing after I opted out of English literature. There was no one to tell me that I could write-I still needed validation. Poised at the beginning of my writerly career in my fifties, my only regret is not heeding my teacher's advice all those years ago.

extremely fortunate to have had her as my teacher, as an invaluable life lesson.

❑

Dr. (Ms.) Tarana Husain Khan

Najma Apa, impressed by a poem I had written and recited in class--- my first and last--tried to persuade me to complete my graduation in English literature as my main subject because I could write so well. Though she was a great influence in shaping my thought process and giving structure to my random musings, I could not offer English literature as my main subject. I didn't believe my words had any value. Subsequently I offered management and taught Commerce for many years.

Najma Apa was completely different from any other teacher. If she was teaching 'The Merchant of Venice' it became a lesson in women empowerment. I would rush off to the library to read the feminist writers she recommended. There would be Mahabharat entwined with Shakespeare and G.B. Shaw. *Ode to Autumn* could wait till the teak trees of the campus shed their leaves and we could walk on them to simulate the feel of English Autumn. We could be Shelley's Skylarks dwelling in the present, enthralled by our own music.

She was not preparing us to qualify the year end exams, she was teaching us to think for ourselves. We were all from families with varying degrees of conservatism and liberalism, straddling both the worlds, suppressing questions and ready to be carried off wherever life took us. We were not allowed a becoming yet. Najma Apa enabled us to think the whys, find the vocabulary to vocalize what we had observed and ignored around us. I remember often coming out of her classes with my mind buzzing, a deep angst I couldn't identify and sometimes finding solace in her recommended readings. All around us was the second wave of

Since my childhood, I have always been amazed by her fascination for Romantic poets like John Keats and William Wordsworth.

The general perception about the Romantic movement is that it was devoid of reality. But the way Professor Najma looks at it is that one should not get affected by the harsh realities around us. She believes that one should never lose hope. Her optimism is legendary. I would need many pages to describe how her self-confidence and optimism has changed my life in many ways. She has always infused strength with her oft-repeated quote, "Courage is not a virtue but the virtue." I am indebted to her for injecting this belief in my personality.

What makes Professor Najma a brilliant Artiste is her love for words. She literally feels the words while reciting, reading, and while writing. Her students vouch for her mastery and brilliance. The readers of her creative writings swear by her pursuit for perfection.

Professor Najma is one of the finest Urdu writers that we have in India today. I am saying this with full responsibility. I am sure anyone who has read her works already knows that.

I wish her well in the many works that she plans to bring before audiences in the due course of time.

❑

Ms. Lamat Hasan

If it wasn't for Najma Apa, I wouldn't have been writing this note for her today. Her smooth and simultaneous striding of the English and Urdu literary worlds with exceptional grace and grandeur had laid bare my inadequacies early on. She grounded me like no other. Yet she also made me yearn to straddle the two literary worlds and grapple its nuances. For me, she was a superhuman who could read and translate Shakespeare with ease and elan, as I sat in class, marvelling at her genius. She is that star in the galaxy where ordinary mortals can seldom reach. I am

Saima Shahryar **2019**

Professor Najma Mahmood, popularly known as Najma Apa by her students, junior colleagues and neighbors, is just Ammi for me. My early memories are of her being an ever affectionate, positive mom, who never differentiated between me and my two brothers Humayun (Bhayyu) and Faridoon (Khusro). She never compared us to other kids but always stood like a pillar of strength for us.

She prepared for her English class teachings with a tremendous zeal and sincerity. Her passion for creative writing in Urdu was a source of inspiration for me. Her Urdu writings have been of different forms, each having a unique style, my favorite being the easy-to-understand short stories especially "Khali Jholi".

I, being the quiet and reserved type could not fathom how can someone be so positive and energetic even in the most difficult situations that life posed before her. I admire her throaty laughter which many a times dispels the seriousness in the atmosphere and makes it lighter.

Belonging to a small place Malihabad near Lucknow, she was the first girl who passed High School in first division as a private student that too from UP board. Then started her journey to Lucknow (Karamat Hussain Girls college) and Aligarh. Her compassion, sincerity, independent spirit, friendliness, zest for living is beyond comparison. Even after 20 years of retirement and holding a Dubai residence visa, Aligarh and AMU have cast a sort of spell on her which pulls her constantly.

I hope she stays happy and enjoys her life on her own terms.

❑

Faridoon Shahryar **2019**

Professor Najma Mahmood is not merely my mother. She's also my teacher who has impacted my thought process immensely.

The once formidable soon became powerfully poignant. I quickly began to relish Ms. Mahmood's classes. Not only did she give us the tools to probe a conformist tradition-oriented mindset, she also gave me the confidence to face those who belittled independent thinking. I wasn't the same student who had walked into her class with a meager understanding of Virginia Woolf's literary prowess. I now felt empowered by having won the quiet encouragement of my teacher who I could sense was overjoyed to see her teaching bearing fruit. We kept building on the rapport we had established as she always took a keen interest in my academic growth. I will always remember her for that.

❑

Humayun Shahryar **2019**

My mother Professor Najma Mahmood has been a source of inspiration for me and my siblings throughout our lives.

As someone who was always independent and self-confident, she gave us a different perspective on women and made us realize that it is possible to balance a career with the responsibilities that come with parenthood.

Ever since we were old enough to understand, she told us stories and bought us books which opened up the world to us and gave us a desire to learn. This is her biggest gift to us.

From her we learnt compassion and sacrifice and a desire to survive and live life to the fullest.

She is driven by a purpose to share her creative insight and knowledge through her writings and has written a number of books and stories that have been well received.

We have been very lucky to have her as a role model in our life who has led by example rather than just by words.

Najma Mahmood. Professor Najma Mahmood taught English Literature and Language in the Aligarh Muslim University, Aligarh, India for more than three decades with a rare passion and fervor. She is a poet and a fiction writer who feels at home in English as well as Urdu. Her fictive oeuvre is primarily in Urdu, which is her mother tongue, while the majority of her critical work is in English. Her books such as "Paani aur Chattaan", Jangal ki Awaaz", and "Registaan mein Jheel" are illustrations of mysticism, transcendentalism, and idealism. Like a true Romantic, and also quite like a postmodernist, Professor Najma Mahmood shuns strict genre-demarcation, and believes and practices cross-genre or cross-generic and multigeneric witing. Her critical work is basically moored in Comparative Literature with her thesis Virginia Woolf's Concept of Perfect Man: An Exploration in Comparative Literature, published in book form in the year 1998, being one of the first researches of this kind carried out in an Indian university. She has a style of writing with a lexical and phrasal felicity, which is looked at enviously by aspiring writers, and plagiarized too by the unscrupulous ones. She has a pile of unpublished work, which, if her readers are lucky enough may be available in the public domain someday.

❑

Ms. Tamara (Zaman) Kathwari

Even as an avid literature student, unraveling Virginia Woolf's writing at 20 initially seemed a formidable task but Prof. Najma Mahmood's conversational style and candor made it a delightful experience. Before I had finished one novel, I had quickly purchased another that wasn't even on the reading list of the course. Ms. Mahmood was always available to discuss the many facets of Virginia Woolf's writing and prodded me with questions that lingered and drew me in more and more to the complexities and nuances of Virginia Woolf's intellectual brilliance as writer.

She is a lady of character and conviction who achieved a great success in the field of Urdu and English literature.

She is truly incredible!

Dubai 2019

❑

Prof. Sami Rafiq
Deptt. of English
A.M.U. Aligarh

Professor Najma Mahmood is a fiction writer, critic and poet with numerous works both in English and Urdu. Her poetry has a feminist expression and is very powerful. Her writings are the product of her struggles as a female writer and a mother. Najma Apa (as she was so called by her students) was also my teacher and had an exemplary knowledge of Greek classics, English and Persian literatures along with a very caring attitude.

The world needs to know about her relevant poetic and critical writings. Everyone needs to hear her poetic voice in "Jangal ki Awaaz".

❑

Prof. (Dr.) Ayesha Muneera Rasheed
Deptt. of English
A.M.U. Aligarh

With a history of interaction with diverse cultures since time immemorial, people of India epitomize linguistic, literary and cultural fusion or 'hybridity.' A large number of Indian litterateurs who are culturally multifocal, and more often than not, linguistically bilingual, have made their mark at a national and international levels. An important name among them is Professor

of an artist for new knowledge and experiences was unending. She seems to initiate a spiritual culture in art and its cultivation in order to promote sensitivity. Her equal interest in eastern and western literary expressions and creative processes distinguish her as a scholar and stalwart par excellence.

Ms. Nuzhat Qamar Dawood

It was my proud privilege of being a student of Prof. Najma Mehmood in the year 1970-71. Prof. Najma Mehmood was not only popular for her academic and literary work but also had interesting teaching styles which made her unique and different from others. If I go back to my memory lane, I remember an incident where she asked me to read," the Daffodils by Wordsworth to the class. She liked my recitation so much that next day she brought the tape recorder from her home and made me recite again to tape it. This act of hers helped me in developing self- confidence during my college days and in later life. After many years when I met her again in Dubai, we cherished that fond memory. Whenever she visits her children in Dubai, I always look forward to meet her.

She is a proud mother of 3 wonderful children who are an example of her dedicated motherhood and have been doing excellently well in their careers. One can see her strong values in the development of her children. She is not only an incredible teacher, but much more than that to me. I still feel that I can learn a lot from her.

Though Prof. Najma Mehmood was professor in English, however she was also a well-known poet and has written several books in English and Urdu. Some of my favourite books are "Jungal Ki awaz and a Book on Sayid Hamid." Her academic career is an inspiration to many students and teachers. She is one of the very few teachers today with whom one can talk about Iqbal, Faiz, and Shakespeare and Wordsworth at the same time. Prof. Najma was very well respected and recognized by staff and students of Aligarh Muslim University for possessing highly professional, dedicated and intellectual abilities.

Aligarh Muslim University.

Her teaching career began with a brief spell as College lecturer in a neighboring town. Shortly afterward, Najma joined the AMU Women's College as a lecturer in English (teaching both at the College and the English Department in the University) from where she retired as Professor in 2001. During the long years of her teaching career Najma greatly succeeded in winning the love and respect of her students and affectionate respect of her colleagues. Looking back at her past now she feels that if she has any regrets at all in life about things missed or not done or done as well as she wished they generally have little to do with her days spent in the College or the Department.

Fulfilment in life comes in diverse ways as no doubt does its opposite: to this author it has come as the urge for creativity- though the happiness that your writing gives you as also the thought of sharing in your children's happiness.

❑

Prof. Samina Khan
Deptt. of English, AMU

Prof. Najma Mahmood is an academician, active researcher, critic and author of both Urdu and English literary works. She has a teaching experience of thirty-four years of undergraduate and 15 years of postgraduate courses. Hers is an important name in English comparative literature with an exceptional work to her credit -'Virginia Woolf's concept of Perfect Man- An exploration in Comparative Literature'. Prof. Mahmood has a huge research work to her credit, with more than a dozen published papers on John Keats' Odes, Dissociation of Sensibility, Eve of St. Agnes, etc. Her exemplary scholarship in Urdu can be seen in her published works like 'Paani Aur Chattaan' Saiyed Hamid ki Gum us mein hain , 'Jungle Ki Awaaz' , 'Registaan Mein Jheel' , 'Be Zanjeer Justuju', etc. In her creative endeavour the quest

Another book by Ms. Mahmood is a distinguished – though again unusual in its distinction-biography of Saiyid Hamid saheb the well-known figure that has long dominated and profoundly influenced the life and concerns of Muslim India. Hamid Saheb's many-faceted personality-his work in the civil service, his contributions in educational and cultural spheres, his remarkable achievements in literary field both in English and Urdu, and most of all the author's personal interaction with the great man during his days as the Vice -Chancellor of Aligarh Muslim University-inspired Ms. Mahmood to undertake this work in a way also a personal tribute to a man with strong commitment to great ideals.

Najma Mahmood was born in Malihabad near Lucknow. She passed her High School examination as a private candidate since there was no school for girls in the town in those days (there is none even now). Impressed by her performance she was placed in the first division - her parents agreed to let her join Karamat Hussain Muslim Girls' College, Lucknow from where she passed the Intermediate and B.A. Examinations. The four years she spent as resident student at this well-known Muslim College proved to be of crucial importance in her life. She had the good fortune of having as one of her teachers Razia Sajjad Zahir, the wife of founder of the Progressive Writer's Association in India, Syed Sajjad Zahir. Razia Apa encouraged her to write stories and devote herself to literary studies as preparation for a literary career.

After completing her B.A. Ms. Mahmood came to Aligarh and joined the Postgraduate course in English. The degree of commitment to the study of literature in the English Department in those days, led as it was by a critic and a scholar of the eminence of Professor Asloob Ahmad Ansari who gave Najma a larger scope for the operation of her literary intelligence and sensibility. Her interest, for example in Virginia Woolf, goes back to those days of hard study which certainly looked to goals beyond mere tests and examinations. This interest, it may be pointed out culminated at a later stage in her scholarly work on this great twentieth-century author for which Najma was awarded the Ph.D. degree by the

Over the years her mind has been preoccupied with the problems of teaching and research. Now she is in a position to offer the outcome of her intellectual endeavour to the academic community from which it can learn a lot. There is no doubt that she would teach and participate in the literary and cultural activities at the educational institutions that she might chose to join in the future with the same spirit and distinction for which she is deservedly known at this University. The places that she might work would certainly benefit from her manifold academic and creative talents.

❑

Prof. Maqbool Hasan Khan
Deptt. Of English
A.M.U. Aligarh October 2012

Najma Mahmood is a writer in Urdu (with considerable amount of work also in English) whose career spans over five decades. Though prolific she would however like to be best known for her valuable imaginative work, Jungal ki Awaz, a work that she insists on calling a "Novel" in spite of its extraordinary brevity. It is an unusual experiment in Urdu - an intense and eloquent expression of the writer's agony over the state of affairs in the modern world and how things are seen to be falling apart when the center, as Yeats classically put it, cannot hold. Her misery is augmented by the tormenting realization that the "center" which an earlier generation found as unable to hold things together cannot now be located anywhere it was once supposed to have been. In despair she goes back to a distant past, to Medieval 'sufis' and then to still more distant past to Plotinus, and to the forest-dwelling saints and seers in ancient India that once sang of the unity of all existence. Did she succeed in her quest? Readers are invited to judge for themselves (The work, probably her magnum opus, is in a collection of her literary writings mainly fiction with the same title i.e, Jungal ki Awaz, published in 2011).

whom I have known as a colleague at A.M.U. for over eight years now. We have had several occasions to interact academically through discussions and participation in seminars. Ms. Mahmood has been associated with the teaching of postgraduate classes in the Department here in addition to her regular teaching commitment in the Women's College of A.M.U. I hold Ms. Najma in high esteem for her professional commitment and scholarly and creative pursuits. She has published on a wide-ranging area of critical studies besides her creative writings. I happened to be on the panel of examiners to evaluate her doctoral dissertation on the Concept of Perfect Man in Virginia Woolf which I found of a high research quality. Ms. Mahmood has impressed us all as an extremely personable colleague with ready willingness for cooperation and team-work. I wish her well in life.

❑

Professor S.Wiqar Husain,
Chairman, Deptt. of English,
A.M.U. Aligarh 28.03.00

Professor Najma Mahmood is one of the most experienced teachers of English in Aligarh Muslim University, Aligarh (India). She has been teaching at the Women's College of the University for more than thirty years. Besides, she also teaches the Postgraduate classes and guides research in the main department of English. She has published critical articles and poems both in English and Urdu. A collection of her critical essays From the Circle to the Centre and her doctoral thesis which offers an interesting study of Perfect Man In Virginia Woolf with reference to the well-known Urdu and Persian poet Iqbal are the two books recently added to the considerable list of her publications. She has all along shown a keen living interest in literature teaching and the social and cultural issues of the time. Her concern for the improvement of English studies at the University and her contribution to the designing of syllabi and preparation of teaching material are remarkable.

University, Aligarh in 1966. As a student she impressed me as a very intelligent, diligent and conscientious person of more than average parts. She wrote some of very impressive tutorial essays and read learned papers in Postgraduate Discussion Group and Raleigh Literary Society of the Department. Owing to her bright academic career she got the job of lecturer in English at B.MG. College, Chandausi, soon after her Postgraduation. From there she shifted to Abdullah Girls' Degree College in the Department of English at Aligarh Muslim University i 1968.Since then she has been working in the same department and has been associated with both extra-curricular activities and administrative work of the College in addition to her teaching assignment. Being a very successful teacher, she has made herself popular both among her students and colleagues alike. In 1986 Ms. Najma got her well-merited promotion as a Reader in the Department of English. Ms. Najma Mahmood got her Ph.D. on Concept of Perfect Man in Virginia Woolf and has brought out a collection of scholarly articles From the Circle to the Centre: A Critical Miscellany. She has a rare creative talent and has published several poems, stories and critical essays in Urdu. She also read paper in All India English Teacher's Conference held at A.M.U. and participated actively in a Seminar-cum Workshop on Professional English at Dayal Bagh Institute of English Studies at Agra.

Ms. Najma Mahmood is a very reliable person and can be entrusted with any work of responsibility and trust. From what I know of her I can say with confidence that she will prove a great asset to any job she happens to take up. She bears a high moral character. I wish her a bright future career.

❑

Prof. K.S. Misra
Ex Chairman, Deptt.of English,
A.M.U Aligarh 10.1.96

It is a pleasure to write a reference on Dr. Ms. Najma Mahmood

To the best of my knowledge Ms. Najma Mahmood bears excellent moral character.

❑

Prof. (Mrs.) Zakia A.Siddiqqi
Principal A.M.U. Women's College
Aligarh 01.10.96

This is to certify that Dr.(Ms.)Najma Mahmood has been teaching English Literature as well as General English to the Undergraduate classes in the Women's College for the last 29 years. She is a devoted and sincere teacher with deep understanding of the subject. She has published a book and a number of articles in English and Urdu. She has been awarded a Phd. degree for her highly literary work. She has been the Adviser of the Humanities Society of the College for many sessions and has also served as the Secretary to the Staff meetings. She has been participating in the Corporate life of the College.

Dr. Najma bears an excellent moral character and is capable of independent thinking. She would give a good account of herself if she is given an opportunity to teach in the Department of English.

I wish her success.

❑

Prof. Harish Raizada
Retired Professor, Deptt of English,
A.M.U. Aligarh 10.01.96

It gives me great pleasure to certify that I have known for nearly three decades Ms. Najma Mahmood, who did her M.A. in English in high second division from Aligarh Muslim

Shrimati Kusum Sharma
Principal
B.M.Girls Degree College, Chandausi 18.01.68

This is to certify that Km. Najma Mahmood was the Head of English Departmen at this College since August '66 to August '67. She taught English Literature as well as General English to the B.A. Classes. She was keenly interested in teaching and was hardworking and sincere in her work. The students were quite satisfied with her teaching. Though she joined the College rather late even the results were fine. She had control over the students and was helpful and affectionate to them. Her behaviour and conduct was throughout good.

She was given the charge of the N.C.C. and she fulfilled this duty also.

I wish for her bright future.

❑

Prof. Miss A.Thomas
Principal, A.M.U. Women's College
Aligarh 31.8.85

This is to certify that Ms. Najma Mahmood is one of the permanent staff of the A.M.U. Women's College as Lecturer in English since January 1968. She is a devoted teacher with wide understanding of the subject. Her students are very much satisfied with her way of teaching and they speak high of her. Besides a good teacher, she is a good writer of Urdu and English languages and has published many useful articles in English and Urdu in various magazines.

Ms. Najma Mahmood has been helpful in the administration of the College. She is at present the Adviser Humanities Society and is also serving as the Secretary of the Staff meetings.

Professor Asloob Ahmad Ansari
Head, Department of English
A.M.U. Aligarh 24.6.67

Miss Najma Mahmood got her Master's degree in English Language and Literature from Aligarh Muslim University in 1966. She was placed in second division and stood second in order of merit. She also acted as Assistant Editor of the English Magazine. Miss Mahmood, so long as she was with us, worked with untiring zeal and tried to acquaint herself with almost all periods of English Literature, acquainting herself both widely and deeply.

She was methodical, painstaking in her work and participated in literary discussions and impressed us with her literary talents.

She would give a good account of herself if she is given the chance of teaching in an educational institution. I wish her every success in her future career.

❑

Mrs. M.J. Haidar,
Provost Abdullah Hall.
A.M.U. Aligarh 15.11.67

Miss Najma Mahmood joined the University and Abdullah Hall as a resident Post- graduate student in MA. Previous class. She proved to be a very active member of the Hall....She was appointed as the Literary Secretary of the Hall in the session 1965-66. During her term the Society organized short story competition, 'Shaam-ghazal' and other literary activities. In short it was a fruitful session. Besides being active in her own Hall, Najma took part in the debates held in other halls and impressed the judges,

She is capable of independent thinking. has poise and dignity and it was a pleasure to have had her in Abdullah Hall.

hers were and the nature of her affirmation of the feminine (not feminist) qualities of which the world has such great need. Indeed the feminist is the denial of the feminine. Your comparison of Virginia Woolf with Rumi and other Sufi writers is very apt and interesting and all goes to confirm what you seem to be saying that Virginia Woolf was a natural mystic. I feel that you should have the confidence of your own culture in pointing out where Western Humanism fails-as it does this, this materialist civilization is in the process of destroying the world and itself, we are in the last stage of unchallenged dominance of this culture and are beginning to question the premises of materialism itself. Theosophy, Blake and the Romantics, Yeat's scanning of all the philosophies which proclaim an alternative vision-which in fact affirm that spirit is the ground of all reality not matter-Neo-Platonism and the Qriental religions. The world needs India as never before and it is a pity, is at the same time precipitately adopting Western values and ideas. Above all in your Universities. In bringing Islamic mystical thought to bear on Western values and Western literature you will be doing a great service to us all. Truth always prevails in the end, because we are spiritual beings and not specters of the earth and of the water."

(Dr. Kathleen Rain was a great Modern Britich Poet and critic)

Dr. Kathleen Raine
47, Paulton's Square
London, SW3, 5 DT
0171-3524643
20 Dec. 1996

Dear Najma Mahmood,

Thank you for your beautiful letter, your paper on Virginia Woolf and book, From the Circle to the Centre-A Critical Miscellany. It is a book that confirms my long held belief that Oriental scholars have much to contribute to the understanding of English and other Western Literatures. Your own approach to Virginia Woolf through a 'mystical view' seems to me just a contribution. Western critics should not be for you authorities when you are responsible for bringing to bear on various questions the theo-centric vision of Islam and other Oriental philosophies. On Virginia Woolf you have asked the right question. You are right to reject the political Women's Lib. View of her. In fact all her women, Mrs. Ramsay, Mrs. Dalloway, the women in the Waves are deeply feminine and you are right to say that the roles and natures of the two sexes are different. The feminine gifts have been undervalued in the Western Civilization which has put far too much value on the masculine rational to the exclusion of the feminine, feeling and intuition, I think your Prophet highly valued women. At Aligarh I formed the impression that women had the wisdom not to sacrifice beauty like the Women's Lib. people who make themselves unattractive. You are right also to see Virginia in terms of the excellence of her work and not in feminist political terms.You have well understood the cosmic vision she herself came to by way of her own poetic insight through her feminine self not through 'reason' You have understood what those gifts of

Commendations

Books

CONTENTS

Tashrihaat-o-Tahqiqaat

Compiled and Edited

by

Najma Mahmood

Edition 2021
ISBN: 978-93-91601-23-2
Price: ₹ 600/-

Tashrihaat-o-Tahqiqaat

Compiled and Edited
By
Najma Mahmood

Brown Book Publications Pvt Ltd.

New Delhi

TASHRIHAAT-O-TAHQIQAAT

Compiled and Edited by

Najma Mahmood

BOOKS BY THE AUTHOR
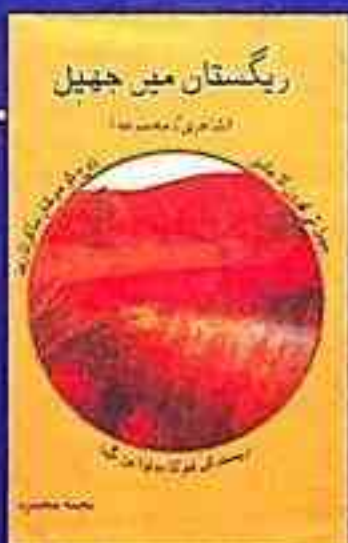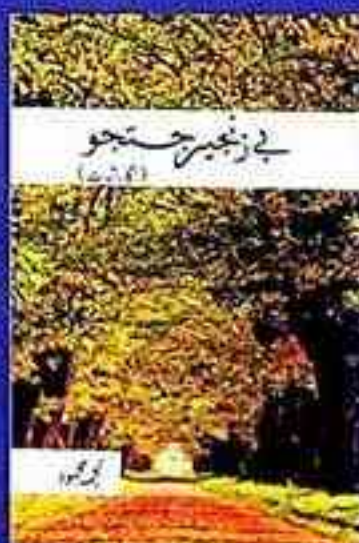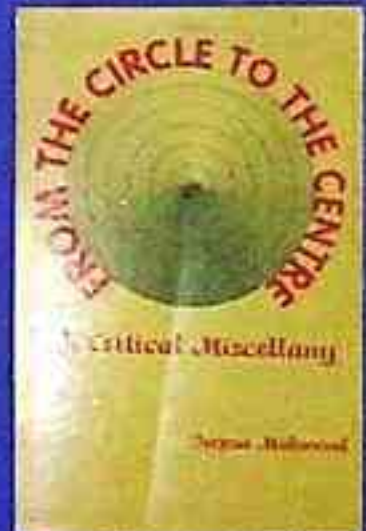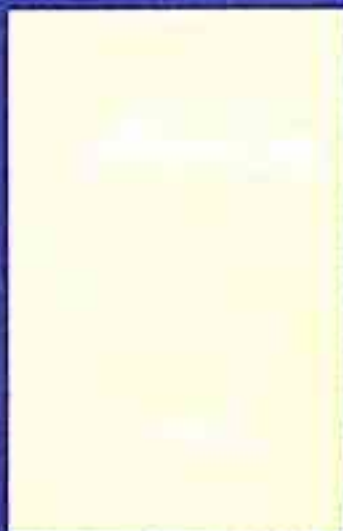
Opposite Blind School, Qila Road,
Shamshad Market, Aligarh-202001
Mob: +91-9818897975, Ph.0571 2970227
E-mail: bbpublication@gmail.com
Website: www.brownbooks.in

₹ 600/-

ISBN: 978-93-91601-23-2